دل توھے صنم آشنا

طیبہ عامر

اساس انسٹیٹیوٹ

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب:	دل تو ہے صنم آشنا
مصنفہ:	طیبہ عامر
پراجیکٹ ہیڈ:	ابوعبداللہ
صفحات:	400
تعداد:	500
بارِاوّل:	2025ء
زیرانتظام:	اساس انسٹیٹیوٹ

ملنے کے پتے

انتساب

دل تو ہے صنم آشنا میرے اُس رب کے نام جس نے خاموش دل کو الفاظ عطا کیے، بے رنگ سوچ کو احساس بخشا، اور مجھے اس نازک موضوع پر لکھنے کا حوصلہ دیا۔ اگر اس کتاب کا کوئی حرف، کوئی جذبہ، کسی دل تک رسائی پا جائے تو یہ صرف اُس ربِ کریم کا احسان ہے

طیبہ عامر

پیش لفظ

دل کی بات

معاشرے کی بدلتی اقدار نے نہ صرف رہن سہن بلکہ اخلاقیات و ایمانیات میں جو تغیّر برپا کیا ہے وہ ہر خاص و عام کی زندگی میں ریشم کے دھاگوں کی مانند باہم بُنا ہے۔اس گہما گہمی کے دور میں جہاں انسان ستاروں پر کمند ڈال بیٹھا ہے وہیں نئی تحقیقات نے انسان کو اپنی ہی ذات میں ایک ادھیڑ بن میں مبتلا کر دیا ہے۔ کچھ تو اپنے یقین کا سِرا تھامے چلتے رہتے ہیں، بھٹکتے ہیں، لڑکھڑاتے ہیں لیکن اُن کی آس اُن کو تھکنے نہیں دیتی، وہیں دوسری طرف کچھ تو یوں الجھتے ہیں کہ بھنور کو ہی کہکشاں سمجھ بیٹھتے ہیں۔

دل تو ہے صنم آشنا ایسے ہی دو الجھے نفوس کی کہانی ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ کی تلاش میں کچھ یوں الجھے کہ اپنی ہی ہستی کو بھول بیٹھے۔ایک ایسے دور میں جہاں سہولیات کے انبار ہیں، وہیں حقیقت کی تلاش میں برسوں دشت کی خاک چھانتے رہے اور یہ بھول بیٹھے کہ دل کی آنکھ تو سب سے مضبوط سہارا ہے جو گھُپ اندھیرے میں بھی دیکھنے سے نہیں کتراتی، اس آنکھ کو نہ ریت کے ذرّے کا ڈر ہے کہ نظارہ دھندلا ڈالے نہ دھوپ کی تمازت کا کہ بینائی ہی چندھیا دے۔

یہ آنکھ بس اُس صورت نابینا ہوتی ہے جب دل کے چاند کو صنم کا سایہ گہنا دے، تب صرف سراب ہی دکھتے ہیں خواہ نخلستان کے کنارے پر ہی کیوں نہ آ موجود ہوں۔دل میں اپنے اپنے صنم سجائے، کیا طوبیٰ اور اسفر اپنی منزل ڈھونڈ پائیں گے؟

طیبہ عامر

تاریک اور تنگ گلی میں ٹمٹماتی اسٹریٹ لائٹ کی روشنی ناکافی تھی۔ لوگوں نے اپنی سہولت کے لیے اس کشادہ گلی کو اب اس قابل بھی نہ چھوڑا تھا کہ ایک چھوٹی موٹر کار ہی اس میں سے گزر سکے۔ چھوٹے بڑے جا بجا چبوترے کسی تجریدی آرٹ کا نمونہ تھے۔ ہر دروازے کے آگے ایک موٹر بائیک اس بات کی غماز تھی کہ چاہے کتنی بھی تنگ دستی کیوں نہ ہو اگر اس شہر میں رہنا ہے تو پبلک ٹرانسپورٹ کی بجائے اپنی سواری کا انتظام خود کرنا ہوگا۔

دو گھروں کے مکین تو مارننگ شو اور رمضان ٹرانسمیشن والوں کو دعائیں دیتے نہ تھکتے تھے کہ کچھ دنوں کی خواری کے عوض اپنا ذرا سا تماشہ بنوا کر اُن کو موٹر بائیک مل گئی تھی۔ عاصم اور ارشد پھولے نہ سماتے، اماں بلائیں لیتی نہ تھکتیں اور پڑوسنیں..... وہ تو کن انکھیوں سے دیکھ کر دل جلانا نہ بند کرتیں۔ جو بھی تھا ارشد اور عاصم تو ٹی وی والے فہد کی پوجا کرنے کو بھی تیار ہو جاتے کیونکہ اُس کی بدولت ہی وہ دونوں آج اس قابل تھے کہ سڑکوں پر اُڑتے پھرتے۔ پلک جھپکتے اپنی دکان سے کلّو کے کھوکے جا پہنچتے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ نقش و نگار سڑکوں پر بنا دیتے کہ کیا ہی کسی فنکار نے بنائے ہوں گے۔

ٹریفک کانسٹیبل تو دور کی بات ہے، تین لال پیلی اور ہری بتیاں بھی اُن کے آگے کچھ نہ بیچتی تھیں۔ مجال ہے جو چابی گھمانے کے بعد منزل پر پہنچنے سے پہلے کبھی بریک لگی ہو۔

ایک روز یونہی زوں زوں کرتے عاصم سڑک کا ایک اندھا موڑ لیتے ایک بوڑھے فقیر سے جا ٹکرایا، بادلِ ناخواستہ بریک لگائے کہ کہیں موٹر بائیک کو آنچ نہ آئی ہو، دوسری طرف لڑھکا پڑا فقیر بس ہائے ہائے کی دہائی دے رہا تھا۔ آس پاس اپنا کام کاج کرنے والے لوگ، رکشہ اور بائیک والے، سبھی دوڑے آئے کہ تماشہ لگ چکا تھا۔

''بھلا ہو تیرا لالے..... ہائے بھلا ہو تیرا دونوں جہانوں میں!''

عجیب آدمی تھا، جس نے چوٹ پہنچائی، اُسی کو دعائیں دیتا تھا۔

''بابا جی، تُسی ٹھیک اوناں؟'' ملی جلی کوئی نئی بولی تھی، تیس کے اوائل میں وہ دُبلا پتلا رکشے والا بابا جی کو بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولا تھا۔

پسینے سے تو وہ خود بھی شرابور تھا، لیکن جو بھبکے اُس زخمی فقیر کے پاس سے اُٹھ رہے تھے اُس نے رکشے والے کو مزید کسی نیکی سے محفوظ رکھا اور جھٹ سے اُس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ فقیر ایک بار پھر زمین پر آ رہا۔

''آئے ہائے!'' کچھ کہتے کہتے لب رُک گئے۔ پھر جو صدا بلند ہوئی اُس نے سب ہی کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

''بھلا ہو تیرا لالے'' کراہتے ہوئے فقیر نے پھر صدا لگائی۔ ''جیتا رہ، قدر کر اپنے ہم نوا کی تو، اپنے خالق کی، اپنے روگی کی قدر کر اس سے پہلے کہ وہ روگ لگائے۔''

''پاگل لگتا ہے۔'' مجمع میں کھسر پھسر ہوئی اور لوگ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے، چوٹ شدید تھی، فقیر اب تک سسک رہا تھا۔

''اللہ لوک لگتا ہے۔'' ایک اور آواز آئی تھی۔

''او بابا جی! یہ لو پانی پی لو۔'' وہی رکشے والا ایک سبز رنگ کی بوتل میں پانی لیے دور کھڑا تھا۔ اس مرتبہ اس کی اس بوڑھے فقیر کے قریب کھڑے ہونے کی کوئی خاص ہمّت نہ ہوئی۔

''بھلا ہو تیرا..... بھلا ہو..... جیتا رہ..... خوش رہ..... سکھی رہ..... با ایمان رہ۔'' اور بھی نہ جانے کتنی دعائیں اس نے دے دینی تھیں لیکن اتنی دیر میں پانی کی بوتل کپکپاتے ہاتھوں کی مدد سے اُس کے منہ تک پہنچ چکی تھی۔

پانی کی ایک دھار باچھوں سے گر رہی تھی اور ایک دھار آنکھوں سے، نہ جانے کہاں چوٹ آئی تھی اُس بوڑھے نے بتایا نہ تھا۔

رکشے والا دعائیں پا کر سرشار تھا، دل میں عقیدت کے پھول لیے دور سے ہی عقیدت سے بوسہ دیا

اور سرشار نئی سواری کی تلاش میں نکل گیا، اللہ لوک نے دعائیں جو دیدی تھیں، اب تو اُسے سکھی ہی رہنا تھا، نیّا پار ہو جانی تھی اس کی۔

...۞...

''ارے دیکھو تو سنگھار میز کتنی پیاری ہے؟'' ایک چھوٹی بچی نے والہانہ انداز میں کہا۔ محلے میں ایک نیا خاندان منتقل ہو رہا تھا اور مزدور مزدا ٹرک سے سامان اُتار کر گھر کے اندر پہنچا رہے تھے۔

''ہاں واقعی!!'' باقی بچے بھی اُس کے ہم نوا تھے۔''

''اِن ڈبوں میں کیا ہوگا؟'' ایک دوسرے بچے نے اپنے برابر کھڑے کچھ بڑی عمر کے لڑکے سے سوال کیا۔

''میرے خیال سے کانچ کی چیزیں ہوں گی، تب ہی یہ ٹوٹا ہوا جام بنا ہوا ہے۔'' لڑکے نے بڑی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔

''یاد ہے نا جب ابّو کانچ کے برتن لائے تھے تو اس پر بھی یہی بنا ہوا تھا۔ ابّو نے یہی بتایا تھا کہ اس کا مطلب ہے کہ ڈبّے کے اندر کوئی نازک چیز ہے۔''

ساتھ کھڑی بچی نے کہا۔ جو غالباً اس کی چھوٹی بہن تھی۔

''مجھے یاد ہے جب چاچی جان بھی سعودیہ سے آئی تھیں تو اس نشان والے ڈبے میں سے وہ سفید گلدان نکلے تھے جو بعد میں امی نے ڈرائنگ روم میں سجائے تھے۔''

''ہاں!'' لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور پھر جلد ہی گھر والے بھی نمودار ہو گئے۔

سب سے زیادہ جو بات اہلِ محلّہ کے لیے متاثر کن ثابت ہوئی وہ ایک خوبصورت عورت کا ایک سفید چھوٹی گاڑی ڈرائیو کر کے عین گھر کے سامنے کھڑی بڑی گاڑی کے پیچھے روکنا تھا۔

جدید تراش خراش کا مکمل لباس انتہائی سلیقہ شعاری سے زیب تن کیا گیا تھا۔ خوبصورت بال نہ زیادہ لمبے تھے نہ چھوٹے، آدھے بال ایک ننھے شکنجے میں کسے پیشانی کی چمک بڑھا رہے تھے۔ وہ کوئی

نازک سی گڑیا نہیں بلکہ ایک یونانی دیوی کی مانند قدقامت اور پُر وقار ہستی تھی۔

روبی نے جونہی گاڑی روکی، ایک آٹھ سالہ خوبصورت بچّہ بھاگ کر پاس آ گیا۔اس کے ساتھ ہی وجیہہ سراپا روبی کا شوہر پُر وقار انداز میں روبی کا ہاتھ تھامے گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

کئی نگاہوں نے اُس وقت تک اُن کا تعاقب کیا جب تک وہ چاند سورج کی جوڑی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ بیٹے ریّان نے بھی اپنے والدین سے خوب وراثت وصول کی تھی۔

اس چھوٹے سے محلّے میں یہ ایک بڑی بات تھی کہ شوہر سب کے سامنے ہی اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لے۔ دوسری قابلِ ذکر بات اہلِ محلّہ کے لیے ایک ایسے گھر میں دو گاڑیوں کی موجودگی تھی جس میں صرف تین ہی افراد تھے۔

سفید پوش لوگوں کے اِس محلّے میں مکین کیسے اپنا بھرم رکھے ہوئے تھے وہ یا تو خود جانتے تھے یا اُن کا خدا۔

علی الصبح صیف اپنی نوکری پر چلا جاتا اور قریباً ساڑھے سات بجے روبی اپنے بیٹے کو لے کر گاڑی میں بٹھا کر اسکول لے جایا کرتی تھی اور غالباً وہیں سے اپنی نوکری پر۔ محلے کی خواتین کی پوری کوشش ہوتی کہ اُسی وقت اپنے شوہر اور بچوں کو بھی خدا حافظ کہیں تا کہ نک سک سی تیار روبی کو گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ سکیں۔

وہ جب دھیمے دھیمے گلی سے گاڑی نکالا کرتی تو نہ جانے کتنی ہی آنکھیں خواب بننے لگتیں، کچھ حسرت بھری نگاہیں گاڑی کے مڑ جانے تک اُس کا تعاقب کرتیں۔ کتنے ہی معصوم دل روبی جیسا بننے اور کچھ منچلے ایسا ہمسفر پانے کی خواہش کرتے۔

کئی خواتین نے خوب سُن گُن لینے کی کوشش کی کہ کہیں تو اس آئیڈیل خاندان کا کوئی منفی پہلو سامنے آئے لیکن جس نے بھی یہ کوشش کی اس نے منہ کی کھائی۔

جہاں روبی لباس و اطوار میں سلیقہ شعار تھی وہیں خوش گفتاری و خوش مزاجی بھی اُس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو آنکھیں بھی اُسے ستائشی یا حرص کی نظر سے دیکھتیں، روبی پلٹ کر اُن کو سلام پیش کر دیا کرتی، صرف یہی نہیں کسی کے بچے میں بھی ذرا جو خوبی نظر آجاتی اُس کی خوب خوب ستائش کرتی۔

کچھ ہی عرصے میں پورا محلہ نہ صرف روبی بلکہ صیف کا بھی دلدادہ ہو چکا تھا جو اکثر صبح سٹرکوں پر جاگنگ کرتے ہوئے لوگوں سے رسمی علیک سلیک کرتا، دونوں ہی اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر پتہ نہیں کیا وجہ تھی جو اس چھوٹے سے محلے میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔

اب اس آئیڈیل جوڑے کو نہ تو مغروری کا لیبل لگایا جا سکتا تھا اور نہ ہی جھوٹی شان بنانے کا اور تو اور اُن کا بیٹا ریّان بھی اُن ہی کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔

غرض پورے محلے میں اس نفیس جوڑے کا چرچا تھا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ جوڑا کس کہانی کو جنم دینے والا تھا۔

...۞...

سات سالہ معصوم بچے کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا، ہلکی ہلکی سسکیاں اب مزید کچھ گہری ہو چلی تھیں۔ کتابوں اور کھلونوں سے بھرے کمرے کے ایک کونے میں وہ کشن کے اوپر اپنے گھٹنوں کے گرد دونوں بازو حمائل کئے بیٹھا تھا۔

عائشہ کمرے میں داخل ہوئیں تو بچے کو یوں خاموشی سے روتا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

''کیا بات ہے میری جان؟ کیوں اُداس ہو؟''

آہستگی سے چلتی ہوئی وہ بچے کے قریب پہنچیں تو ہمدردی پا کر بچے کے سسکنے میں شدت آ گئی، آنکھیں آنسوؤں کے باعث جگنو کی مانند چمک رہی تھیں۔

اس نے قریب ہی پڑے سفید بے جان پرشین بلے پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ پھیر کر محبت کا اظہار کیا۔

نرمی سے ہاتھ پھیرتے کپکپاتی آواز میں بمشکل الفاظ ادا ہوئے۔

''امی، ہمارا پیارا ببلو.....وہ چلا گیا۔''

ایک اور ہچکی.....

قریب کھڑی عائشہ اب بچے کے پاس بیٹھ چکی تھیں، افسردگی کے باعث ایک لمحے کو وہ کچھ بھی نہ بول سکیں، خاموشی سے وہ ننھی سی جان کا دُکھ بٹانے لگیں۔ نرمی سے بِلّے کے ملائم بالوں پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے وہ اپنے الفاظ ترتیب دینے لگیں کہ کس طرح ایک سات سالہ بچے سے اس کے عزیز ترین دوست کی وفات پر تعزیت کی جائے۔ ببلو کی حالت دو دن سے خراب تھی اور اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی پوری کر چکا ہے لیکن یہ بات کسی معصوم کو سمجھانا واقعی کٹھن تھا۔

''کتنا مشکل ہوتا ہے نا اپنے احساسات پر قابو پانا جب ہمارا کوئی پیارا ہم سے دور چلا جاتا ہے؟''

عائشہ الفاظ کے مناسب چناؤ میں کامیاب ہو چکی تھیں۔

ننھی ہتھیلیوں سے موٹے موٹے آنسو چہرے سے صاف کرتے اُس نے ایک اور سسکی لی۔''

''ببلو ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح تھا، ایک بہت اہم حصہ.....ہم اُسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

انہوں نے بچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے محبت سے پیشانی کو چوم لیا، اس مشکل وقت میں ماں کا لمس ہی اُس بچے کے لیے اکسیر تھا۔

''لیکن امی، ببلو ہمیں کیوں چھوڑ کر چلا گیا؟ میں اُسے ابھی سے مِس کرنے لگا ہوں۔ یہ غلط بات ہے نا! ہم جن سے پیار کرتے ہیں وہ ہمیں اس طرح اُداس چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

ایک گہرے سانس کے ساتھ سامع نے پھر سوچ کے گھوڑے دوڑا دیئے۔ بالآخر بات شروع ہوئی۔

''میری جان! کبھی کبھی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جیسے ہر انسان کی ایک کہانی ہوتی ہے ایسے ہی ہمارے ببلو کی بھی ایک کہانی تھی جو شروع ہوئی اور ختم ہو گئی۔

لیکن اس چھوٹی سی زندگی میں ببلو جتنی خوشیاں ہماری زندگی میں بکھیر گیا، اس کو ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

بچے نے اپنی آستین سے اپنا منہ رگڑا ''کیا میں ابھی بھی اس کو ویسے ہی زور سے پیار کر سکتا ہوں جیسے پہلے کرتا تھا۔''

''زور سے نہیں بیٹا، ہاں ہلکے ہلکے تم اس کے بالوں پہ ابھی بھی ہاتھ پھیر سکتے ہو۔'' بیٹے کی معصومیت پر عائشہ کا دل پگھل رہا تھا۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ آنکھوں کے آنسو پونچھ کر چہرے پر میٹھی سی مسکان سجا دیں۔

''پیار کی کوئی قید نہیں ہوتی بیٹا اور نہ ہی موت کی۔ ببلو کو ہم ہمیشہ اپنے دلوں میں رکھیں گے۔''

ایک آہ کے ساتھ دل کی بات لبوں پر آ گئی تھی۔

بچے نے کچھ سمجھی نا سمجھی کی کیفیت میں گردن ہلا دی۔

''میرا ببلو جنت میں جائے گا نا امی؟''

اگلے سوال پر وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''نہیں بیٹا، جانور تھوڑی نہ جنت میں جائیں گے، وہ تو انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے۔''

حیرت کا ایک سمندر معصوم آنکھوں میں اُمڈ آیا تھا۔''کیوں امی؟ کیا ببلو مسلمان نہیں تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا رب کون ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے امی؟''

اب کے وہ واقعی سٹپٹا گئیں۔

''وہ تو جانور تھا نا بیٹا!'' عائشہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''لیکن بابا نے تو کہا تھا سب جانور چرند پرند اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں۔تو اگر جب وہ جنت میں جائیں گے ہی نہیں، تو اُن کو تسبیح کرنے کا اجر کیسے ملے گا؟'' بچہ اب باقاعدہ جرح کر رہا تھا۔ یہ بات کہ وہ جنت میں اپنے پیارے بلّے سے ملاقات نہیں کرے گا اُس کو کھائے جا رہی تھی۔

''تو کیا ببلو دوزخ میں جائے گا؟'' یہ خیال اس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا تھا اور اُس کا چہرہ غم کی شدت سے فق ہو گیا۔

وہ بغیر رُکے زور و شور سے رو رہا تھا۔

عائشہ اپنے بیٹے کو پریشانی کے عالم میں چمکار رہی تھیں لیکن ببلو کے غم میں تو اُس ننھی سی جان کی جان ہی نکل گئی تھی۔

''ببلو جنت میں کیوں نہیں جائے گا؟ اُس نے تو کچھ بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ دوزخ میں جائے؟'' بلند ہچکیوں کے درمیان وہ بول رہا تھا۔''اُس نے تو کبھی کسی چوہے کو بھی نہیں کھایا!!''

وہ جیسے جیسے سوچتا جاتا اُس کا دل ڈوبتا جاتا، آخر میں اس کا رونا دھونا ہسٹریائی چیخوں میں بدل چکا تھا گویا اُس کی عزیز ترین چیز کو آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔

''جائے گا بیٹا، بالکل جائے گا۔ ہمارا ببلو جنت ہی میں جائے گا۔ بس اب چپ ہوجاؤ شاباش۔''

روتی ہوئی ہلکان جان کو اب کچھ آسرا ہوا۔ گو کہ اُسے عائشہ کی بات پر اب بھی شک تھا کیونکہ پہلے اُس سے کچھ اور بیان کیا گیا تھا۔ ایسا تو وہ اکثر کرتی تھیں۔ کسی بھی ضد کے جواب میں جلد ہی ہار مان لیتیں اور بچے خوش ہوجاتے، اپنی جیت کی خوشی مناتے لیکن آج معاملہ کچھ سنگین تھا۔

بات ایک معصوم بچے کے جان سے پیارے بلّے کے دوزخ یا جنت کے فیصلے کی تھی۔

کہنے کو تو وہ خاموش ہوگیا لیکن ایک گرہ اس کے دل میں لگ چکی تھی۔

...۞...

خدایا اوّل و آخر بھی تو ہے
خدایا باطن و ظاہر بھی تو ہے

کانوں میں رس گھولتی آواز اُسے مسحور کر رہی تھی۔ آٹھویں جماعت کے کمرے میں ایک طالبہ خوبصورت تلفظ اور ادائیگی کے ساتھ حمد پڑھ رہی تھی۔

باقی طلباء کے برخلاف وہ اس حمد سے زیادہ پڑھنے والے کو سمجھنے میں مصروف تھا۔

پڑھنے والی کو نظر اُٹھا کر دیکھنے کی اس میں ہمت تو نہ تھی۔ مس رخشندہ کی عقاب نظروں کا خوف اور اُس کے بعد ہونے والے واقعات کے بارے میں تو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

مُبرّا قید اور اطلاق سے تو
مُنزّہ انفس و آفاق سے تو

آواز سے مسحور ہوتے ہوئے بھی وہ یک دم ہی الفاظ کے سحر میں جکڑ گیا۔

زمین و آسمان کا نور ہے تو
مگر خود ناظر و منظور ہے تو
سوا تیرے نہیں موجود کوئی
نہ عابد ہے نہ معبود کوئی

طالبہ اب بھی اُسی سوز کے ساتھ اردو کی کتاب میں موجود حمد اُسی جذب کے ساتھ پڑھ رہی تھی لیکن اسفر اشعار کے معنوں میں جیسے کھو سا گیا تھا۔

''ایک سیلبرٹی ہونے کا احساس کیا ہوتا ہوگا، وہ بھی عظیم ترین، سب سے اعلیٰ، سب سے معتبر.....''

سوچ کے دھارے بہتے ہی جا رہے تھے "لیکن ایسی ہستی کو جینے کی امنگ کیا ہوتی ہوگی؟'' ایک اور خیال بجلی کی طرح دماغ میں کوندا تھا، ''جب سب ہی سے بہترین ہیں تو پھر مقابلہ کس سے؟''

اُسے یاد آیا جب چند دن پہلے ہی وہ دوستوں کے ساتھ تفریحاً دوڑ لگا رہا تھا، محلے سے منسلک وہ بڑا

میدان نوعمر لڑکوں کی آماجگاہ تھا۔ دوڑ میں وہ ہمیشہ ہی سب کو مات دے دیتا تھا۔

''بھائی تُو تو بیٹھ جا اب۔ تین مرتبہ تو تُو جیت چکا ہے، اب کسی اور کو موقع دے ورنہ ہم ایسے ہی تیرے پیچھے دوڑتے رہیں گے زندگی بھر۔'' ساجد نے چڑ کر کہا۔

پاس کھڑے مجیب اور فرقان بھی اپنی سانس کو قابو کر کے ہنسنے لگے تھے۔ ساجد کی بات سے پوری طرح اتفاق کرنے کے باوجود وہ اس کی بات سے محظوظ ہوئے تھے۔

''ہاں یار! اب تو بیٹھ جا، ہم تینوں میں سے کون سب سے تیز دوڑتا ہے اب یہ فیصلہ کریں گے۔''

پسینے سے تر پیشانی کے ساتھ فرقان گھٹنوں پر ہاتھ رکھے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

کراچی کی حبس زدہ گرمی میں یہ لڑکے آج دوڑ بازی سے لطف اندوز ہو رہے تھی لیکن جب چوتھی بار بھی اسفر اُن سے چند سیکنڈ پہلے ہی جیت کی لکیر پار کر گیا تو ساجد چڑ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے بھائی، اب رومت، یہ لو میں کنارے بیٹھ گیا، خوش؟'' اسفر قریب ہی ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا اور باقی تینوں دوڑنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

صرف بیٹھ کر دوسروں کو دوڑ لگاتے دیکھنا اسفر کو بہت بورنگ لگا تھا، جب کہ باقی لوگ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی کر رہے تھے۔ جوش دوڑنے والوں کے انگ انگ سے ظاہر تھا، وہ قہقہے لگا رہے تھے اور ساتھ ہی آنکھوں کے کناروں سے اپنے حریف کو دیکھتے جا رہے تھے۔ اندازہ لگانے کے لیے کہ کب قوّت بڑھانی ہے، منزل کو سب سے پہلے عبور کرنا ہی اُن کا مشترکہ ہدف تھا، حالانکہ منزل تو سب ہی کو عبور کرنی ہوتی ہے، چاہے چند سیکنڈ کا وقفہ ہو یا زیادہ، پہل آنے کی چاہ سب پر حاوی رہتی ہے۔

اسفر مسکراتے ہوئے اُن سب کو قریب آتا دیکھتا رہا تھا، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ''میں پہلے پہنچا'' کا نعرہ بلند ہو چکا تھا اور اسفر دوڑ کے لیے ایک بار پھر تیار تھا۔

''مجھے صرف بیٹھ کر تم لوگوں کو مزے لیتے نہیں دیکھنا، میں بھی آؤں گا ساتھ اور اب کی بار خیال رکھوں گا کہ تم لوگوں کے حساب سے دوڑوں۔'' ایک شرارتی مسکراہٹ اُسکے لبوں پر تیر رہی تھی۔

اور آج حمد کے اُن اشعار نے اُس کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اللہ تعالیٰ کو کیسا لگتا ہوگا صرف دیکھنا، سب سے اعلیٰ ہونے کے بعد میں سب کو دیکھنا، مہیا کرنا اور کرتے چلے جانا، فیصلے کرنا، جزا و سزا دینا۔کیا کبھی یہ بھی بورنگ ہوجاتا ہوگا؟ اصل مزہ تو دوڑنے والے لے رہے ہوتے ہیں۔کھیل کو کھیلنے والے، زندگی جینے والے۔''

مِس رخشندہ اب سب کو ہوم ورک کی ہدایات دے رہی تھیں اور اسفر اپنی سوچوں سے واپس آنے کے بعد ایک بار پھر چوری چھپے حمد کو کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

...۞...

کیا مجھے آپ کی میتھ کی نوٹ بک مل سکتی ہے؟ ایک ہاتھ سے بال پوائنٹ کو کلک کر کے کھولتے بند کرتے اسفر نے حتی الامکان پُرسکون رہنے کی کوشش کی لیکن اضطرابی کیفیت سے فرار ناممکن تھا۔ وہ اپنے آپ کو پُرسکون دکھانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن ہر تھوڑے وقفے بعد کالر ٹھیک کرنے اور بالوں میں ہاتھ پھیرنے سے اُس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

''بالکل، لیکن آپ تھوڑی دیر میں ہی واپس کر دیں گے۔'' درخواست تھی یا حکم اسفر کو اس سے غرض نہیں تھی، غرض تھی تو طوبیٰ سے بات کی شروعات کرنے میں۔ پینتالیس منٹ کا پورا پیریڈ سر جاوید کا لیکچر سمجھنے میں کم اور الفاظ کے چناؤ میں زیادہ گزرا تھا اور اب جونہی سر جاوید کے پیریڈ کے بعد وقفے کی گھنٹی بجی تو کچھ معصوم خواہشوں کی تکمیل کا وقت ہو گیا تھا۔ جیسے ہی طوبیٰ کلاس سے باہر نکلنے لگی تھی، اسفر نے اسے جا لیا تھا۔

وہ دونوں کلاس دہم کے عین دروازے پر کھڑے تھے جو آنے والے دوسرے طلباء کے لیے ہلکی رکاوٹ کا باعث بن رہا تھا۔ گو کہ میتھ کی نوٹ بک مانگنا اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی لیکن اسفر کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئے جا رہی تھیں۔ یکدم طالبات کے ایک گروپ نے کلاس میں داخل ہونے کی کوشش کی اور طوبیٰ جو نہایت کامیابی سے اپنے جذبات کو اپنے بے پرواہ سے رویّے کے پیچھے چھپائے کھڑی تھی، ایک دھکے کے زیر اثر لڑکھڑا گئی۔

دوقدم کے فاصلے میں سے ایک قدم مزید کچھ کم ہوا تو نوعمر دل کچھ اور زور سے دھڑک اُٹھے۔

سُرعت سے واپس پلٹتے طوبیٰ نے ڈیسک سے اپنی نوٹ بُک اُٹھائی اور اسفر کو تھما دی۔

''تم چھٹی سے پہلے واپس کر دینا۔'' سپاٹ لہجہ اور بے اعتنائی..... اُس پر اندازِ تخاطب ''تم'' گویا کوئی لگی لپٹی نہیں۔

تمام ہم جماعت اسی ''تم'' کے عادی تھے تو اسفر کے لیے کچھ منفرد کیونکر ہوتا۔

وہ سولہ سالہ دُبلا پتلا اور لمبا لڑکا تھا، بلوغت کے آثار تمام دوسرے ہم عمر لڑکوں کی طرح ہلکے روئیں کی صورت میں چہرے پر نمایاں تھے۔ ہلکا سانولا رنگ اور اس پر پیشانی پر بکھرے سیاہ بال اُسے کچھ ایسا خاص تو نہیں بناتے تھے کہ کوئی بھی اُس سے بلاوجہ بات کرنے کی وجہ ڈھونڈے لیکن پھر بھی اُس کے مزاج میں ایک مقناطیسیت تھی۔

اُس نے یونیفارم قمیص کی آستینیں کہنی تک موڑ رکھی تھیں۔ ڈھیلی ٹائی اُس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ کسرت کے ابتدائی آثار بازوؤں پر نمایاں ہو رہے تھے اور کراچی کی گرمی میں رنگت بھی گہری دکھائی دیتی تھی۔ سب کچھ بہت عام سا تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ طوبیٰ کی نظر جب بھی اسفر پر پڑتی تھی ایک لمحے کو دھڑکن بے ترتیب ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ خود عام نہیں تھی۔ بہت خاص تھی کیونکہ وہ خود کو خاص سمجھتی تھی اور اس کی سوچ کی عکاس اُس کی ترچھی آنکھیں تھیں جو اس کے گہرے بھورے بالوں سے خوب میل کھاتی تھیں۔

کچھ خاص تھا اُس میں جو اسفر ہی نہیں کئی اوروں کے لیے بھی وہ باعثِ کشش تھی لیکن بے اعتنائی کی مضبوط دیوار نے کبھی کسی کو اتنا حوصلہ نہ دیا کہ طوبیٰ سے کام کے علاوہ کوئی بات کر سکتا۔ تب ہی تو اسفر کو دو سال لگ گئے صرف بات کی شروعات کرنے میں۔

ہائے رے یہ کم عمری کی محبت۔

...۞...

پیارے اللہ میاں!

میرے ببلو کو آپ کے پاس آئے ہوئے آج پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے ۔ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ ببلو کو جنت میں بھیج دیں کیونکہ وہ بہت نیک تھا ۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا اُس نے کبھی کسی کو پنجہ بھی نہیں مارا اور نہ ہی کبھی کسی چوہے کو مارا تھا۔

امی کہتی ہیں جانور جنت میں نہیں جاتے ۔ ویسے تو مجھے امی کی سب باتوں پر یقین ہے لیکن مجھے لگتا ہے یہ والی بات اُنکو نہیں پتا۔ مجھے یقین ہے آپ ضرور میرے ببلو کو جنت میں بھیجیں گے ۔لیکن پھر بھی مجھے امی کی بات سے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتیں ، ہمیشہ سچ ہی بولتی ہیں ۔ میں ایک مہینے سے روز دعا مانگ رہا ہوں ۔آپ میری دعا قبول کر لیں گے نا ! اب تو میں روز عشاء کی نماز بھی پڑھ کر سوتا ہوں ۔ امّی نے کہا تھا کہ میں ببلو کے لئے دعا مانگوں گا تو آپ مجھے خواب میں ببلو دکھا دیں گے۔ اللہ میاں ، پلیز خواب میں مجھے ببلو دکھا دیں۔ میں سمجھ جاؤں گا میرا ببلو جنت میں ہے۔آمین۔

...۞...

محلے کی بچیوں کے لیے روبی کسی ڈرامے کی ہیروئن سے کم نہ تھی جو انتہا کی جاذب نظر تھی اور جامہ زیب بھی۔ جب وہ روز صبح اپنا پرس اور دوپٹہ سنبھالتی گھر کے دروازے کو قفل لگاتی تو ساتھ ہی کچھ بچیوں کے دلوں پر بھی مہر ثبت ہوجاتی۔ اُن میں سے ایک بچی تو باقاعدہ روبی کو اپنے مستقبل کی صورت قرار دے چکی تھی۔

جب روبی چابیوں کے گچھے میں سے دو انگلیوں کے بیچ گاڑی کی چابی دبائے آگے بڑھتی تو ایک رونق سی لگ جاتی۔ کالا چشمہ آنکھوں پر سجائے، سیٹ بیلٹ باندھتے روبی کتنے ہی ننھے دلوں کو مسخر کر گئی تھی اُسے خود خبر نہ تھی۔ اپنے سامع کو مکمل طور پر اپنے ٹرانس میں کر لینے کی تمام خوبیاں اُس میں موجود تھیں۔

''السلام علیکم!'' بڑے ہی پیار سے کیے گئے سلام پر ایک دن وہ تین بچیوں کا گروہ مبہوت ہی رہ گیا۔ سفید شلوار اور آسمانی رنگ کا یونیفارم پہنے پونی ٹیل بنائے بچیاں فخر سے سینہ پھلائی کھڑی تھیں کہ روبی نے نہ صرف اُن سے سلام میں پہل کی تھی بلکہ کسی شام گھر پر آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ روبی بھی اتفاقاً ہلکے اور گہرے رنگ کے امتزاج کا ایک نیلا جوڑا پہنے تھی جو بچیوں کے لیے ایک اور باعثِ مسرت بات تھی۔

وہ بچیاں اپنی اسکول وین کا انتظار کر رہی تھیں اور روبی اپنے بیٹے کے باہر نکلنے کا جو غالباً کوئی کتاب گھر بھول آیا تھا۔

''آل ریڈی ٹو گو ٹو سکول؟'' روبی نے مسکرا کر پوچھا تو جواباً بچیوں نے سر ہلا دیے۔ ''ارے! اس کے منہ سے تو انگریزی بھی یوں نکلتی ہے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔'' ایک بچی نے بعد میں تبصرہ کیا تھا۔ وہ ان سب میں سب سے زیادہ ہوشیار تھی۔

ریّان کے باہر آتے ہی روبی گاڑی سٹارٹ کر کے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

...۞...

''بیٹا! بس کردو۔اتنی رات گئے جاگ کر پڑھوگی تو دماغ خشک ہوجائے گا۔'' اکبر رات کے تین بجے پانی پینے اٹھے تو بچیوں کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر ہی چلے آئے۔

طوبیٰ اس پہر بھی اپنی کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی اور اس کو یوں پوری یکسوئی سے پڑھتا دیکھ کر محبت سے چُور لہجے میں وہ بول اٹھے تھے۔

اپنے پانچوں بچوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے سب سے بڑے لڑکے صدیق اور منجھلی بیٹی طوبیٰ کے بے حد اسیر تھے اور کیوں نہ ہوتے؟ جس قدر ان کی یہ دو اولادیں حسّاس تھیں، دوسرے بچوں میں وہ بات نہ تھی۔

صدیق تو لڑکا تھا ہوش سنبھالتے ہی اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم نوکری کر کے نہ صرف وہ اپنی پڑھائی کا خرچہ خود اٹھائے ہوئے تھا بلکہ وقتاً فوقتاً گھر میں بھی اپنی ماں رضیہ کا ہاتھ کھلا رکھنے میں مدد کرتا۔

گو کہ چھوٹا بیٹا اصغر بھی ان کا فرمانبردار اور محنتی تھا لیکن ساتھ ہی کھلنڈرا اور منچلا بھی۔ کھانے پینے کھیل کود اور تفریح غرض پڑھائی کے علاوہ اسے ہر چیز میں دلچسپی تھی۔ انتہا کا مست ملنگ۔ اب نہ جانے یہ خوبی تھی یا خامی، لیکن اکبر کا اپنے بیٹوں کو بڑا آدمی بنانے کا خواب اصغر کی روش کو دیکھتے ہوئے پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

جو وصف وہ اصغر میں دیکھنا چاہتے تھے وہ طوبیٰ میں من وعن موجود تھے۔ ذمہ داری کا احساس، وقت کی قدر اور آگے سے آگے بڑھنے کی لگن۔

اکبر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے سو سوچ بھی درمیانی تھی۔ لہٰذا اس بات کی اجازت تو قطعاً نہ تھی کہ طوبیٰ پڑھائی کے ساتھ کوئی چھوٹی موٹی ہی نوکری کرے، ہاں گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کی اجازت ضرور دے رکھی تھی۔

صبح اسکول اور شام چار سے پانچ گھنٹے وہ محلے کے بچوں میں سر کھپاتی۔ سو اپنی پڑھائی وہ عموماً رات کو جاگ کر ہی کیا کرتی۔ کبھی کبھی تو اکبر خود بھی طوبیٰ کی انتظامی مہارت کے معترف ہو جاتے کہ کس طرح

مختلف اوقات میں آدھے درجن بچوں کو بخوبی پڑھاتی ہے بلکہ جو غیر نصابی اسباق وہ بچوں میں لگن پیدا کرنے کے لیے پڑھاتی اس کی تو بچوں کے والدین بھی معترف تھے۔

چند سو روپے مہینہ فی بچہ فیس اس کی محنت کی کوئی قیمت نہ تھی لیکن جب حالات تنگ ہوں تو یہ بھی بھلا تھا۔ پچاس ہزار کی تنخواہ میں پانچ بچوں کی تعلیم کا خرچہ اٹھانا اور پھر اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اکبر کی کمر ٹوٹ جاتی اگر صدیق اور طوبیٰ جیسی اولاد نہ ہوتی۔ وہ تو شکر تھا کہ اکبر کے ابّا جان تین کمروں کا ایک مکان وراثت میں چھوڑ گئے تھے وگرنہ گھر پر چھت مہیا کرنے کی کاوشوں میں سفید پوشی کا بھرم بھی شاید برقرار نہ رہتا۔

''جی ابو! بس سونے لگی ہوں'' طوبیٰ نے کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا اور اکبر مطمئن اپنے کمرے کی طرف لوٹ گئے۔

میتھ کی نوٹ بک اٹھا کر آہستگی سے آخری صفحہ کھولا۔ بال پوائنٹ سے ایک چھوٹا doodle بنا ہوا تھا جس میں چند لکیروں سے ہی شبیہ مکمل واضح تھی۔ ایک نسوانی شبیہ جس نے اپنی لمبی فراک کو کچھ اس طرح تھاما ہوا تھا کہ پہلی نظر میں وہ ڈرائنگ کسی پھول کی ڈرائنگ لگتی تھی۔ وہ انگلیوں کی پوروں کو لکیروں کے ساتھ ساتھ نرمی سے پھیرنے لگی اور گزرے دنوں کے سرور میں کھو گئی۔

دل میں گدگدی سی ہوئی اور پیٹ میں جیسے ایک بل سا پڑ گیا۔ رات کے اس پہر بھی وہ ان ستارہ آنکھوں اور گھنی پلکوں کے سحر میں مبتلا تھی۔

''تمہاری ڈرائنگ بہت خوبصورت ہے۔'' تعریف میں بھی ایک سرسری انداز تھا۔

''واقعی!'' اسفر کی آنکھوں کے گلاب کھل اٹھے تھے۔ ''تم نے دیکھی میری کاوش؟''

''ہاں، ظاہر ہے، جب بھی میرے نوٹس واپس کرتے ہو، کہیں ڈوبتا سورج، کہیں ابھرتا چاند، یا پھر برساتی بادل فزکس کے فارمولوں کے اوپر منڈلا رہے ہوتے ہیں۔''

اسفر یک دم خفیف ہو گیا۔ ''وہ بس کام کرتے کرتے بعض اوقات بے اختیاری میں ہی.....''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''سوری مغالطے میں تمہارے دیے ہوئے نوٹس پر یہ بنا بیٹھا'' اسفر

نے حسب معمول نروس ہوتے وقت بالوں میں انگلیاں گھمائیں۔

''اچھا! میں سمجھی جان بوجھ کر بناتے ہو، ورنہ ہر باری یہ غلطی کیسے ہوتی۔ طوبیٰ نے کندھے اُچکائے۔

''باخدا! حاضر جوابی تو کوئی اس لڑکی سے سیکھے۔'' تھوک نگلتے ہوئے اسفر نے سوچا۔

اچھا یہ بتاؤ بال پوائنٹ کے علاوہ کبھی کوئی اور میڈیم بھی ٹرائی کیا ہے؟'' طوبیٰ نے بغور نوٹس کے اوپر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! کبھی کبھی واٹر کلر، یا پھر پوسٹر پینٹ۔'' اسفر نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

پھر اِک دم سُرعتی انداز، ''تم کہو تو تمہیں لا کر دکھاؤں کسی دن؟''

''ہاں کیوں نہیں؟'' جواب مختصر تھا۔

''تمہیں آرٹس میں دلچسپی ہے۔'' اسفر نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

طوبیٰ کے دل میں آیا کہ کہہ دے کہ آرٹس سے زیادہ آرٹسٹ میں دلچسپی ہے لیکن آخر اپنا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ ''ہاں، مجھے پسند ہے، زیادہ نہیں لیکن اچھا لگتا ہے۔''

''میں ضرور لے کر آؤں گا۔'' اسفر کے چہرے پر تو گویا ہزار واٹ کا بلب جل گیا تھا۔

طوبیٰ نے پہلی بار فرمائش کی تھی اور کون پاگل تھا جو اپنے صنم کی بات ٹال دیتا، صنم بھی وہ جو اس کے جانے میں اس کے پاگل پن سے بے خبر تھا۔

...۞...

محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں، ہاں اگر صحیح شخص اور صحیح وقت پر نہ ہو تو شاید جرم بن جاتی ہے۔
میں نے بھی یہی جرم کیا تھا۔ اس شخص میں کوئی برائی نہیں تھی بس شاید وقت غلط تھا۔ کاش میں نے یہ محبت بارہ سال پہلے کی ہوتی تو یوں سزا نہ پاتی..... بارہ سال.....
لوگ کہتے ہیں محبت دوبارہ نہیں ہوتی۔ غلط کہتے ہیں۔ محبت ہوسکتی ہے۔ کئی بار ہوسکتی ہے۔
جب آپ کا محبوب آپ کو تکلیف دے تو محبت کم ہو جاتی ہے اور جب محبت کم ہو جاتی ہے تو محبت کے پیمانے کو بھرے رکھنے کے لیے انسان مزید محبت چاہتا ہے۔ جہاں سے بھی ملے۔ جیسے بھی ملے۔ چاہے دوستوں سے۔ چاہے کسی آفس کولیگ سے یا کسی ہجوم سے۔ ایک بار جسے محبت کی لت لگ جائے بھلا وہ کیسے کم پر راضی ہوسکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا۔
ہاں!
لیکن میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ تھوڑی محبت اور کی تھی۔ بس اپنی محبت کا پیمانہ بھرے رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں کچھ قیمتی گنوا بیٹھی، بہت قیمتی .....اپنی جان۔
میرا پہلا محبوب اور پہلا عاشق بس ابھی عجلت میں کمرے سے نکلا ہے۔ بہت پیار کیا تھا میں نے اسے ... لیکن خود سے زیادہ نہیں۔ کوئی خود سے زیادہ کسی کو کیسے پیار کرسکتا ہے مجھے سمجھ نہیں آتی۔
محبت تو برابر ناپ تول کا نام ہے، جتنی لے رہے ہو اتنی واپس بھی کرنی پڑے گی۔ ذرا سی ہیرا پھیری ہوئی اور محبت کے پرسکون مائع میں ہلچل شروع۔
ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ وہ شخص جس نے مجھے پہلے پہل مکمل کیا، میرا مجازی خدا ابھی ابھی کمرے سے نکلا ہے..... آہ.....
مجھے اب سانس لینے میں دقّت ہو رہی ہے اور مجھ سے ہلا بھی نہیں جا رہا۔
ذرا سا ہلنے سے بھی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔
میرے باورچی خانے کی سب سے بڑی چھری اس وقت میرے شکم میں گھپی ہوئی ہے۔ اتنی اذیت ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ پھر بھی میری آنکھیں دروازے پر ٹکی ہیں۔ شاید وہ آخری بار میرے

بیٹے کو مجھ سے ملانے ہی لے آئے۔ایک آخری بار۔

حالانکہ میں اپنے بیٹے سے محبت کرتی ہوں لیکن پھر بھی اس وقت نہ جانے کیوں مجھے اس سے زیادہ اپنی فکر ہے۔ پتہ نہیں اب کیا ہوگا میرا۔

میری آنکھیں اب بوجھل ہو رہی ہیں اور غنودگی محسوس ہو رہی ہے۔

مجھے گیلی چیزوں سے ہمیشہ گھن آتی تھی لیکن آج میرے نیچے موجود تمام بستر گیلا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ مجھے آج اس گیلے بستر پر لیٹے رہنے سے اتنی گھن نہیں آ رہی جتنی یہ سوچ کر آ رہی ہے کہ میں نے اپنے قاتل سے محبت کی۔اس کے ساتھ ہنسی بولی،سوئی جاگی،اس کے لیے اپنے گھر والوں تک کو چھوڑ دیا، ساری دنیا سے منہ موڑ لیا اور وہی آدمی .....بڑی ہی آسانی سے میرے جسم میں ایک چھری اُتار کر چلا چلتا بنا۔

وہ جس کے لیے میں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا،آج مجھے ہی لوٹ کر جا رہا ہے۔ادھر سے ادھر بھاگ کر اپنا اور میرے بیٹے کا سامان اکٹھا کر رہا ہے۔جب میں اس کے سامان کی پیکنگ کرتی تھی تو بہت سلیقے سے کرتی تھی، مجھے بے ترتیب چیزوں سے بہت الجھن ہوتی ہے۔

لیکن آج بستر پر پڑی جا بجا سلوٹیں اور اس پر میرا بے ترتیب نقص زدہ جسم۔سب ایسے ہی پڑا ہے۔ اور مجھے اس بات سے بالکل الجھن نہیں ہو رہی۔الجھن ہو رہی ہے تو اس بات سے کہ زندگی کہ اتنے سال بے ترتیب گزار دیئے۔

اپنے رب کو بھی نہ یاد رکھا۔دل میں بس اپنے قاتل کو صنم بنا کر پوجتی رہی۔

محبت کرنا گناہ تو نہیں!

ہاں لیکن صحیح وقت نہیں تھا شاید اور پھر محبت میں ملاوٹ بھی تو کر دی میں نے۔

لیکن میرے قاتل نے بھی تو یہی کیا تھا۔

ایک مرتبہ اسے بھی اپنی ایک دوست سے محبت ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے مجھے بہت برا لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سب کچھ بے ترتیب ہو گیا ہے۔

خیر..... بعد میں میرے محبوب نے مجھے سمجھایا تو میں مان گئی۔ اس نے کہا کہ کبھی کبھی انسان اپنا اختیار کھو بیٹھتا ہے۔ میں بہت جلدی سمجھ جاتی ہوں، تو یہ بات بھی میں فوراً ہی سمجھ گئی تھی۔

جب میری محبت کا کوئی حصہ دار آیا تھا تو مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن شاید یہ چھری جتنی تکلیف ابھی دے رہی ہے اتنی نہیں۔

اُف!!!

میرے پاؤں اب سُن ہو رہے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے کہ میرا دل میرے کانوں میں دھڑک رہا ہے۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی، مجھے عادت ہو گئی تھی، کچھ کم محبت کی لیکن جب کسی نے میرے محبت کے جام کو دوبارہ بھرنے کی کوشش کی تو میں نے تردّد نہ کیا۔

مجھے بھی حق حاصل تھا اپنا اختیار کھو بیٹھنے کا۔ اگر میرا شوہر ایسا کر سکتا تھا تو میں کیوں نہیں؟

میں بہت انصاف پسند ہوں۔ حقوق تو سب کو برابر کے ملنے چاہئیں، سو میں نے بھی اپنے ایک کولیگ سے محبت کر لی۔ مجھے اچھا لگتا تھا اس سے باتیں کرنا، اس کے ساتھ کافی یا کبھی چائے پینا۔

ایسا لگتا تھا پرانا وقت اپنے تمام تر احساسات کے ساتھ واپس آ گیا ہو۔

جیسے میرے شوہر نے مجھے اپنی دوسری محبت کے بارے میں بتایا تھا سو میں نے بھی اسے بتایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ کبھی عورت بھی اپنا اختیار کھو دیتی ہے لیکن وہ ناراض ہو گیا۔

حالانکہ جو اس کے لیے صحیح تھا وہ میرے لیے بھی تو صحیح ہوتا نا! لیکن پھر بھی وہ ناراض ہو گیا۔ بہت ناراض۔ اسے میری باتیں بہت ارزاں لگیں۔

میاں بیوی تو زندگی کے حصے دار ہوتے ہیں نا۔ پھر یہ ناانصافی کیوں؟

اُس نے میری محبت میں کمی کی، میں نے وہ کمی پوری کرنا چاہی۔ یہ بات میں نے اسی سے تو سیکھی تھی۔ پھر بھی وہ ناراض ہو گیا۔

محبت میں برداشت ہونی چاہیے اور محبوب کی خوشی مقدم۔ لیکن شاید وہ ایسا نہیں مانتا تھا۔ حالانکہ کئی بار اس نے یہ بات مجھ سے کہی تھی۔ پر نہ جانے کیوں؟

اب مجھے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے میں بہت دقّت ہو رہی ہے۔ ٹانگوں کے بعد اب ہاتھ بھی بے جان سے ہو گئے ہیں۔

میں چاہتی ہوں کہ ایک بار نماز پڑھ لوں۔ سچے دل سے اللہ سے توبہ کر لوں۔ رات عشاء بھی قضا کر دی تھی۔ اب پڑھنا چاہتی ہوں لیکن ..... اللہ مجھے بس ایک بار اپنی بارگاہ میں کھڑا ہونے کا موقع دے دے۔

اب مجھے رونا آ رہا ہے۔ آنسو بستر پر جذب ہو رہے ہیں۔ زبان سوکھ گئی ہے۔ یاد نہیں آ رہا کیا پڑھنا چاہیے۔

امّی بتاتی تھیں کلمہ پڑھتے ہیں سونے سے پہلے، لیکن بس یہ زبان ساتھ نہیں دے رہی، اتنی بے بسی تو میں نے تب بھی محسوس نہیں کی تھی جب میرا بیٹا آپریشن سے پیدا ہوا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی لیکن آج بہت ڈر لگ رہا ہے۔

چھت کا پنکھا دھندلا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کسی نے بیچ میں سفید پردہ حائل کر دیا ہے۔ دل میں پڑھ لیتی ہوں کلمہ: لا الہ الا اللہ ..... آگے کیا تھا؟ یا خدا مجھے یاد کیوں نہیں آ رہا۔ اُف آنکھیں کھولنا کتنا مشکل لگ رہا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں بس ایک موقع اور چاہتی ہوں۔ اللہ ایک موقع اور مل جاتا تو بس تیری ہو کر رہتی، جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی کرتی..... محمد رسول اللہ۔

...۞...

طوبیٰ کالج سے واپس آئی تو گھر میں کی گئی خاص صفائی ستھرائی اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما تھا۔

''کون آیا تھا؟'' ہاتھ منہ دھو کے رضیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''صدیق کے شاگرد کا نتیجہ آیا تھا نا۔ پھر اس کا اچھے کالج میں داخلہ بھی ہو گیا۔ اس کی امی آئی تھیں خاص طور سے مٹھائی دینے۔ بہت تعریف کر رہی تھیں صدیق کی .....ماشاءاللہ'' رضیہ کا چہرہ اپنے لاڈلے کی تعریف پر دمک رہا تھا، پہلوٹی کی اولاد اور اتنی قابل، فخر تو بنتا تھا جو لہجے سے صاف جھلک رہا تھا۔

''ارے واہ! کون سی مٹھائی ہے؟'' طوبیٰ میٹھے کی شوقین تھی اور مٹھائی بھی گھر میں موقع در موقع ہی آتی تھی۔

طوبیٰ نے ڈبّہ ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ رضیہ نے جھٹ سے ڈبّہ چھین لیا ''ابھی کوئی ہاتھ نہ لگائے۔'' سب سے پہلے اس میں سے صدیق اپنی پسند کی مٹھائی کھائے گا۔ بعد میں باقی لوگ۔''

رضیہ کے اس ردّعمل پر طوبیٰ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اپنے ہی گھر میں کوئی اپنوں کے آگے شرمندہ ہوتا ہے کیا لیکن پھر بھی طوبیٰ کی عزت نفس پر کاری ضرب لگی تھی۔

''میں تو بس کھانا لینے جا رہی تھی۔'' طوبیٰ کھسیانی ہوگئی تھی۔'' بچے بھی پڑھنے آنے والے ہیں نا! ویسے ہی آج رستے میں دیر ہوگئی۔''

طوبیٰ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رضیہ طوبیٰ کی حالت سے بےخبر اب ایک قمیص کے گلے کی ترپائی کرنے بیٹھ چکی تھیں۔ دھاگہ اُلجھ گیا تو انہوں نے دانتوں سے دبا کے ایک تارکاٹ ڈالا اس بات سے انجان کے دانتوں میں دبے تار کے ساتھ ایک دل کا تار بھی کہیں کٹ گیا تھا۔

...۞...

کیمسٹری کا پریکٹیکل جرنل مکمل نہ ہونے کے باعث ایک دن سر غضنفر نے تمام لڑکوں کو روک لیا۔

''ہاں بھئی ..... کیوں مکمل نہیں ہوئے آپ کے جرنل ابھی تک؟''

سر غضنفر کی بھاری آواز پوری لیب میں گونج اٹھی۔ ان کی آواز بھی ان کے سراپے کی طرح رعب دار تھی۔ گہری نظروں سے انہوں نے پوری کلاس کا جائزہ لیا۔ اٹھائیس نوعمر لڑکے خاموشی سے کھڑے تھے۔ کچھ کے انداز سے بے پرواہی جھلک رہی تھی تو کچھ بیزار نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو واقعی شرمندہ تھے۔

اسفر ان میں سے کسی بھی گروپ میں شامل نہ تھا۔ وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے بے پرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمیشہ ایک اوسط درجے کا طالب علم نہ یہ جانتا تھا کہ اسٹیج پر جا کر انعام لینا کیسا ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کہ فیل ہونے کی صورت میں کن نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے طالب علم بس زندگی کی ڈگر پر چلتے

جاتے ہیں خاموشی سے، حالات کے دھارے میں بہتے جاتے ہیں اور آہستگی سے اپنی منزل پا لیتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے پانی سے بھرے برتن میں ٹپ ٹپ ٹپکتا ہر قطرہ ایک ہجوم کا حصہ بن جاتا ہے۔

''مسٹر ..... آپ؟'' سر غضنفر کی آواز ایک بار پھر گونجی تھی اور سب نے ان کی اٹھی ہوئی انگلی کی سمت دیکھا، ''کیا نام ہے آپ کا؟''

''اسفر ...'' گھبرائی ہوئی آواز میں جواب آیا تھا۔

'' آپ تمام لڑکوں کے چھے گروپ بنا دیں، سب لڑکے اس تجربے کے مشاہدات اپنے جرنل میں لکھیں گے اور جرنل مکمل کر کے آج ہی جمع کروا کر جائیں گے۔''

اُستاد تھے یا فوجی جرنیل ... لڑکے مخمصے میں تھے۔ چند ایک بڑبڑاہٹیں، بھنبھناہٹیں فضا میں بلند ہوئیں اور پھر تھوڑی ہی دیر میں پورے کلاس روم میں خاموشی چھا گئی۔

''اسفر ...! ان سبھی سٹوڈنٹس کے پریکٹیکل جرنل جمع کر کے میری میز پر رکھنا تمھاری ذمہ داری ہے، گاٹ اِٹ (got it)؟''

''یس سر!'' ایک روبوٹ کی طرح اسفر کی زبان سے الفاظ ادا ہوئے تھے۔

وہ صرف پریکٹیکل والے دنوں میں ہی کالج آتا تھا اور آج اس کی بدقسمتی تھی کہ اس نے جرنل بھی مکمل نہیں کیا تھا۔

سب لڑکے کچھ عجلت اور کچھ بیزاری سے اپنے کام میں لگ گئے۔

کالج سے نکلتے وقت اسفر سخت کوفت میں مبتلا تھا۔ اس کا سب سے قریبی دوست اپنا کام مکمل کر کے اس کو منہ چڑاتا کب کا رفو چکر ہو چکا تھا۔ اوپر سے آج چار بجے کو چنگ میں میتھ کی ایکسٹرا کلاس بھی تھی جو اسے ہر صورت لینی تھی۔

''عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں آج!'' اسفر نے بیزاری سے سوچا اور قریب آتی بس کو رُکنے کے لیے ہاتھ دے دیا۔ دس منٹ بعد چلتی بس سے اترتے ہوئے ایک حسین اتفاق ہوا اور اس کا دل بے اختیار ہی چاہا کہ سر غضنفر کے ہاتھ چوم لے۔

...۞...

''باجی آگے ہو جاؤ۔شاواش شاواش .....ڈبل اے ڈبل اے.....''

پورے جوش خروش سے چلّاتا کنڈیکٹر اپنی روزی حلال کرنے میں مگن تھا اور ساتھ ہی ساتھ ماچس کی ڈبیا کی طرح بس کو پائیدان تک بھر لینے کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔

''بس کرو بھائی، اور کتنے مسافر چڑھانے ہیں؟''طوبیٰ تلملا اٹھی جب دو مزید بھاری بھرکم خواتین کو کنڈیکٹر نے زبردستی بس میں چڑھوا کر دَم لیا۔

''باجی خیال کرو سب کا۔تھوڑی جگہ بناؤ۔آگے ہو جاؤ شاواش۔شاواش۔''

کنڈیکٹر بھی بڑا ہی خوش مزاج واقع ہوا تھا۔ پورا دن بس کے دروازے پر لٹک کر اور سرکس جیسے کرتب دکھا کر بھی مکمل مطمئن بلکہ خوش باش تھا۔

''خود تو ہوا میں پھڑ پھڑا رہے ہیں اور ہمیں دال والے بن کباب کی طرح دبا کر چپاتی بنا دیا ہے۔''

خواتین کے عبایوں اور اجسام سے اٹھتا خمیر اسے پاگل کیے دے رہا تھا۔

''اُف!!!''ایک زوردار بریک کے نتیجے میں وہ جو بس کی چھت سے منسلک پائپ سے لٹکے ہوئے لہرائی، اسے لگا ایک بازو دوسرے بازو سے یقیناً دو انچ لمبا ہو گیا ہوگا۔

''باجی آگے ہو جاؤ..... شاواش شاواش!!!'' کنڈکٹر کی صدا جیسے کان کے پردے پھاڑ گئی ہو۔اب طوبیٰ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا۔

''اندر کیا کوہِ قاف کا غار ہے جو لوگ آگے بڑھتے جائیں گے اور غائب ہوتے جائیں گے۔اب تو بس پیچھے دروازے سے اترنے کی کمی رہ گئی ہے۔''

طوبیٰ کی تلملائی ہوئی آواز پر کتنی ہی گردنیں اس رخ مڑ گئیں۔ایک تو اپریل کی گرمی اور اوپر سے رش۔ برا ہی وقت تھا جو کنڈکٹر اپنی بدقسمتی کو آواز دے بیٹھا۔

''باجی خیال کرو..... وہی ڈھاک کے تین پات۔''

'' کیوں خیال کریں بھائی! ہم سے کرایہ آدھا لے رہے ہو، کیا جو خیال کریں اور کرتے کرتے آسمانوں کی سیر کو نکل جائیں۔ تیسکی جگہ پچھتر لوگ بس میں چڑھا رکھے ہیں اور پھر بھی ہم ہی تمہارا خیال کریں۔ اب اگر ایک بھی مسافر اور چڑھا تو کرایہ دوں گی نہیں بلکہ جرمانہ لوں گی۔''

آس پاس کھڑے لوگ اس اناری مکالمے سے خوب محظوظ ہو رہے تھے اور کچھ شوقین مزاج پورے اشتیاق سے نہ صرف طوبیٰ کی بلائیں لے رہے تھے بلکہ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ کنڈیکٹر اپنے بلیچ زدہ بالوں کو عجیب انداز سے اوپر کی طرف اُٹھاتے ہوئے مسکرایا،

''ارے باجی تو ناراض ہوگئیں۔''

اب اس مکالمے کے ساتھ گٹکے سے مزین رنگین دانتوں کی نمائش کے بعد کسی بھی انسان کا آپے میں رہنا ناممکن تھا۔ سونے پہ سہاگہ ظلم وستم سہنے والی خواتین بھی طوبیٰ کی ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اپنی بتّیسیوں کی نمائش میں مصروف تھیں۔

'' روکو بس! ابھی روکو!'' وہ بگڑ کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن رش کے باعث بمشکل دائیں سے بائیں ہی مڑ سکی تھی۔ بڑی جدوجہد کے بعد بس اتنا ہوا تھا کہ قدم چار انچ آگے سرک گئے تھے اور کنڈیکٹر کو شاید ایک مسافر کی جگہ اور نظر آ گئی تھی جو اس نے ڈالمیا ڈالمیا کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔

لاچاری کے سبب دماغ کھولنے لگا تھا اور غصے کے شدت سے اب آنکھیں گیلی ہونے لگی تھیں۔

''زندگی بھی ایسی ہی بدبودار ہے جیسی یہ بس..... گھٹن زدہ۔'' اس نے کسیلے پن سے سوچا۔

ایک ادھیڑ عمر خاتون نے ذرا جو اپنا وزن طوبیٰ پر ڈالا تو طوبیٰ نے ایک جھٹکے سے اپنا کاندھا ان کے وزن سے چھڑایا۔

''توبہ، لڑکی ہے یا آفت!'' وہ خاتون کچھ خفا ہوگئیں۔

'' شکر کریں لڑکی ہوں آفت ہوتی تو چمٹ جاتی آپ کو۔'' کاٹ کھا جانے والے لہجے میں دیا گیا

جواب خاتون کا مزاج بگاڑنے کے لیے کافی تھا۔

''توبہ،توبہ..... آج کل کی لڑکیاں،تمیز نہ طریقہ..... رجّو بدسلیقہ۔''

نخوت سے کہا گیا جملہ طوبیٰ کو خاموش کرانے والا کہاں تھا!

''اپنی تعریف نہ بیان کریں رجّو خالہ۔ جو اللہ نے بنا دیا اس پر شکر کریں۔''

''او بی بی! زبان کو لگام دو۔'' خاتون بھی تڑپ اٹھی تھیں۔

''یہ میری زبان ہے کوئی گھوڑا یا خچر نہیں جو میں لگام ڈالوں۔ اپنا وزن خود اٹھائیں تو کسی کو تکلیف نہ ہو۔''طوبیٰ نے بھی تڑخ کر جواب دیا اور منہ ہی منہ میں بد بدانے لگی۔''قسمت ہی بری تھی جو اس بس میں چڑھ گئی۔''

طوبیٰ کی تیز آواز بڑبڑاہٹ میں بدل گئی کیونکہ خاتون طوبیٰ سے عمر میں خاصی بڑی تھیں۔ وہ اب کوئی مزید جواب ان کو نہ دینا چاہتی تھی۔جتنی بدتمیزی وہ ان سے کر چکی تھی وہ ساری رات ضمیر کو کچوکے لگانے کے لیے کافی تھی۔

سفر اب بھی دس منٹ ہی کا طے ہوا تھا۔

...۞...

اسفر بھی بھاگتی بس کے ساتھ دوڑتے ہوئے اُترا اور توازن برقرار رکھنے کے لیے کچھ قدم دوڑتا ہی چلا گیا۔ جب تک وہ رُکتا سامنے رُکی ہوئی بس میں سے اترتی ہستی نے اسے مبہوت کر دیا۔ اسکول ختم ہونے کے بعد آج وہ یوں اچانک اس طرح سامنے آئی تھی کہ اسفر کے دوڑتے قدم عین اُس کے سامنے آ کر رُکے تھے۔

طوبیٰ یوں اسفر کو اپنے اتنا قریب دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

''السلام علیکم!'' اسفر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

سفید یونیفارم کے اوپر سفید ہی اسکارف ایسے تھا جیسے چاند کے گرد ہالہ۔

اس سے پہلے اسفر نے طوبیٰ کو کبھی یوں اسکارف پہنے نہ دیکھا تھا۔ اسے طوبیٰ کی ہر بات پسند تھی تو یہ بھی اچھی لگی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا گندمی رنگ تمتما رہا تھا اور اوپر سے چمکدار آنکھیں حیرانی اور پریشانی میں کچھ اور نمایاں ہو گئی تھیں۔

'' پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' طوبیٰ نے اپنے حواس کو قابو کرتے ساتھ اُسے گھرکا۔ ''کیا کوئی ریس کا میدان ہے جو سر پٹ دوڑتے ہی چلے جا رہے ہو؟''

اسفر نے بے اختیار بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ''بس والے ہمیں کہاں اتنی عزت دیتے ہیں کہ بس روک دیں۔ وہ تو بس چلتی بس میں سے اُترا تو دوڑتا ہی چلا گیا۔''

کہنا تو کچھ اور بھی چاہتا تھا لیکن اس سے آگے بس معذرت پر ہی اکتفا کیا۔

طوبیٰ نے دائیں بائیں دیکھا اور ''کوئی بات نہیں'' کہہ کر قدم بڑھا دیئے۔

''کون سا کالج ہے تمہارا؟'' اسفر نے بھی ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''میرا پریمئر کالج ہے۔ یہیں قریب ہی ہے۔''

وہ دونوں قریب کے محلوں میں رہتے تھے اسی لیے ایک ہی اسکول سے پڑھے تھے۔ لیکن کالج

شروع ہونے کے بعد تمام طلبہ ہی دور دور بکھر گئے تھے۔

طوبیٰ نے گہرا سانس لیا اور اِک دم رک گئی۔ اسفر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

جلدی جان چھڑانا صرف ناشائستہ ہی نہیں، مشکل بھی لگ رہا تھا۔

''فاطمہ جناح گرلز کالج!'' جواب دوٹوک تھا۔

''اچھا اچھا۔ وہ تو خاصہ دور ہے۔'' اسفر نے سر ہلایا۔

طوبیٰ ایک بار پھر قدم بڑھا چکی تھی۔

''اور پڑھائی اچھی چل رہی ہے؟'' ایک بار پھر سوال ''روز جاتی ہو کالج؟''

''ہاں!''

''صحیح..... تو کیسی چل رہی ہے پڑھائی؟'' اسفر کے لیے طوبیٰ کے تیز قدموں سے قدم ملانا کچھ مشکل نہ تھا۔

''بہت اچھی!''

''گڈ..... تو کو چنگ جاتی ہو؟''

''نہیں۔''

''واقعی، کیوں؟''

طوبیٰ نے جواباً سوالیہ نظروں سے اسفر کو دیکھا۔

اسفر گڑبڑا گیا ''میرا مطلب ہے آج کل کالج کون جاتا ہے، سب تو کو چنگ سینٹر ہی میں پڑھتے ہیں۔''

''تو پھر کالج میں ایڈمیشن کیوں لیا ہے؟ کو چنگ ہی میں پڑھ لیتے۔'' طوبیٰ کو جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ اب اسفر کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ رہی تھی۔

اسفر نے اپنی عقل کو کوسا۔

جو کام ہر کوئی کرے وہ طوبیٰ کیونکر کرے!

''ہاں، وہ اصل میں کالج میں پڑھائی اچھی نہیں ہوتی نا، اس لیے میں جاتا ہوں۔''

الفاظ منہ سے نکلنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب طوبیٰ نے جو اس کی درگت بنانی تھی وہ تو اس کی اپنی اماں جان بھی نہ بنا تیں۔

لیکن خلافِ توقع طوبیٰ نے ''اچھا'' کہہ کر اپنے محلے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''تمہیں اپنے گھر نہیں جانا؟'' طوبیٰ نے جب اسفر کو اپنے قدم سے قدم ملا کر چلتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

اسفر نے دائیں بائیں دیکھا اور اسے اپنی بے وقوفی کا ادراک ہوا۔ وہ اپنے گھر جانے والی سڑک کے مخالف سمت میں چل پڑا تھا۔

''اوہ۔ وہ میں بس..... میں چلو میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اسفر نے وہاں سے غائب ہونے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

''استغفراللہ! یہ کیا احمقانہ حرکت تھی میری۔ وہ بھی کیا سوچ رہی ہوگی کہ سڑک چھاپ لڑکوں کی طرح راستہ روک لیا میں نے اس کا۔'' گھر پہنچنے تک اسفر اپنے اپ کو لعنت ملامت کرتا رہا۔

...۞...

''امّی کچھ منگوانا ہے بازار سے؟ میں باہر جا رہا ہوں۔''

اسفر کی پکار پر عائشہ نے سرسری انداز میں ''نہیں'' کہا۔ لیکن ماں ہونے کے ناتے عائشہ کی تمام حسّیات جاگ اٹھیں۔

''خیریت تو ہے؟ یہ آئے دن ڈھائی بجے ہی کیوں تم کو باہر جانا ہوتا ہے؟''

اسفر اس اچانک تفتیش پر گڑبڑا گیا۔

''امی کوئی کام ہوتا ہے تو جاتا ہوں۔ کبھی کوئی نوٹس فوٹو کاپی کرانے ہوتے ہیں۔ کبھی کسی سے ملنے۔''

چاول چنتے عائشہ کے ہاتھ رُک گئے، پھر انھوں نے تسلی سے چاول کا تھال ایک طرف رکھ کر اسفر کا بغور جائزہ لیا۔ وہ لڑکا جس کو گھر میں اُول جلول حُلیے میں پھرنے کی عادت ہو اور وہ ہر آئے دن مقررہ

وقت پر بن ٹھن کر باہر نکلے تو پھر ماں تو کیا پورے محلے ہی کو خبر ہو جانی تھی۔

''بچے! کن ہواؤں میں ہو آج کل؟'' عائشہ نے اسفر کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

جوتوں کے تسمے باندھتے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو تھم گئے اور دوسرے ہی لمحے حرکت میں آ گئے۔

''کیا ہو گیا ہے امی؟ اب کیا باہر جانے پر بھی پابندی ہے؟''

اسفر نے تیزی سے فرار ہی میں عافیت جانی کیونکہ عائشہ کی تفتیش اگر ایک بار شروع ہو جاتی تو وہ بال کی کھال اتار کر ہی دم لیتیں۔لیکن اس نوعمری میں یہ کون جانتا ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

عائشہ کے لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔''آئے تو خبر لیتی ہوں۔'' سر جھٹکتے وہ چاولوں کا تھال لیے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

''آج کل کے بچے سب کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔''

اسفر،عبّاس اور عائشہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔دو بڑے بچوں عافیہ اور اختر کی شادی کے فرض سے وہ سبکدوش ہو چکی تھیں۔ایک اور انیس سالہ بیٹی کی شادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود عباس تھے۔عائزہ پڑھ لکھ کر ایک روشن مستقبل کی خواہاں تھی اور عبّاس اس کے بھرپور حامی تھے۔جبکہ عائشہ کے مطابق بچوں کی شادی جلد از جلد ہو جانی چاہیے تھی پھر چاہے وہ اپنا مستقبل روشن کریں یا خاندان،اس کی انہوں نے کھلی اجازت دے رکھی تھی۔

ادھر اسفر بڑی سرعت سے بس اسٹاپ پر جا پہنچا اور اب مطلوبہ بس کا انتظار کرنے لگا۔جب سے طوبیٰ سے ملاقات ہوئی تھی ہفتے میں تین دن وہ لازمی بس سٹاپ کے پاس منڈلاتا نظر آتا۔حالانکہ دوبارہ بات کرنے کی کوشش اس نے نہ کی لیکن یہ احساس کہ طوبیٰ بھی کبھی کبھار اس کو نظر اٹھا کر دیکھ لیتی ہے اس کے لیے کافی تھا۔

یہ کم عمری کا پیار بھی بڑا ہی نکّما ہوتا ہے۔بس اس کو سینچے جاؤ۔وقت سے،جذبات سے،کاوشوں سے اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔کم ہی لوگ اس دریا کو عبور کر پاتے ہیں۔

اسفر کو دھوپ کی تپش کی فکر تھی نہ ٹریفک کے شور کی۔ وہ بس اسٹاپ سے خاصہ دور رُک گیا لیکن نظریں ایک ہی سمت جمی تھیں کچھ ہی دیر میں اس کی مطلوبہ بس آ گئی، اسٹاپ پر رُکی لیکن اس کا مطلوبہ شخص بس میں ہی نہیں تھا۔

اسفر کو مایوسی ہوئی ''آج اس کو دیر کیسے ہوگئی؟ وہ تو وقت کی بڑی پابند ہے؟''

جینز کی جیبوں میں انگوٹھے پھنسائے وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ دوسری بس دس منٹ سے پہلے آنے والی نہ تھی۔ ''شاید وہ آج کالج ہی نہ گئی ہو، فائنل بھی تو ہونے والے ہیں۔'' اس خیال کے ساتھ اسفر گھر کے لیے پلٹ چکا تھا۔

...۞...

طوبیٰ کا دل ایک سوکھے پتّے کی طرح لرز رہا تھا۔آج دن ہی ایسا تھا۔انٹرمیڈیٹ کے نتائج کا اعلان ہونے والا تھا۔اصغر ضمیمہ لینے گیا ہوا تھا اور طوبیٰ مصلّیٰ بچھائے اپنے غمگسار کی بارگاہ میں کبھی سجدہ ریز ہوتی تو کبھی قیام کرتی۔آنے والی گھڑیوں کے بوجھ سے کندھے جُھکے پڑ رہے تھے۔گھڑی کی ٹِک ٹِک بھی آج کچھ زیادہ ہی تیز سُنائی دے رہی تھی۔وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"اے میرے مالک،تُو تو میری حالت جانتا ہے۔چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے بھی میں نے تیری بارگاہ ہی میں ہاتھ اُٹھائے ہیں۔"

پردوں سے چھن کر آتی ہلکی روشنی اُس کے معصوم چہرے پر ایک نور سا لے آئی تھی۔غیر محسوس طور پر لرزتے ہاتھ اُس کی دل کی حالت کے غماز تھے۔اُس نے ایک بار پھر آنکھیں میچ کر زور دار صدا لگائی۔

"میرے پیارے اللہ میاں،عین امتحان کے دنوں میں بیماری میں بھی میں نے صبر سے کام لیا تھا۔میری تکلیف میں کئے گئے شکووں کو معاف کر دینا۔"

اُسے یاد آیا جب حساب کے پرچے کے عین دو دن پہلے اُسے موسمی بخار نے آلیا تھا اور اللہ سے اُس کی شکایتیں رضیہ کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ہی بند ہوی تھیں۔آج شرمندگی سے اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"اے میرے مالک! تُو تو جانتا ہے میں نے سارا سال کتنی محنت کی ہے،دن رات ایک کئے ہیں اچھے نتاج کے لیے۔مانا کہ تُو نے بڑا کرم کیا ہے لیکن اب بھی ہم کتنی ہی چیزوں کے لئے ترستے ہیں، اپنے والدین سے ذکر نہیں کرتے کہ کہیں وہ اپنے آپ کو چھوٹا محسوس نہ کریں۔میرے پیارے اللہ میاں، مجھے بھی وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے جو میری تمام دوستوں اور کزنز کے پاس ہے، مجھے میری

سال بھر کی محنت کے عوض نتیجہ دینا نہ کہ ایک دن کے پرچے کے عوِض۔"

آنکھوں کی نمی کے باعث منظر دھندلانے لگا تو اُس نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔ ہر مشکل کا مقابلہ اُس نے بڑی جانفشانی سے کیا تھا اور اب رب کی بارگاہ میں اپنی کمزوریوں پر نظرِ ثانی کی درخواست لیے بیٹھی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ محسوس کر کے طوبیٰ کی گڑ گڑاہٹیں دل کے نعلوں میں قید ہوگئیں۔ رضیہ آہستگی سے چلتی ہوئی طوبیٰ کے پاس آئیں اور برابر میں بیٹھ گئیں۔ ایک گداز لمس طوبیٰ نے اپنے اطراف محسوس کیا اور جیسے دل کو کچھ قرار آ گیا۔ پھر بھی خاموشی ان کہی خواہشات اور خوف کے مِلے جُلے ذائقے سے لبریز تھی۔

"مبارک ہو طوبیٰ! ایک بار پھر تُم اے ون گریڈ میں پاس ہوگئی ہو۔"

طوبیٰ کا سانس رضیہ کے محبت سے سرشار لہجے اور الفاظ پر ایک لمحے کو رُک گیا اور اگلے ہی پل وہ زور سے چلّا کر اپنی ماں رضیہ سے لپٹ گئی۔

"واقعی؟!!" اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

دعائیں قبول ہوگئی تھیں، محنت رنگ لے آئی تھی اور ایک ہی پل ہی میں نئے خواب آنکھوں میں سج گئے تھے۔

"الحمدُ للہ" مبارک سلامت کے بعد ایک بار پھر وہ اللہ کے حضور حاضر تھی۔ اب کے صحن میں کھلے آسمان کی طرف نظر اُٹھائے اُس نے تشکّر سے کہا۔ اُس وقت وہ اپنے آپ کو اللہ کے کتنا قریب محسوس کر رہی تھی یہ وہ جانتی تھی۔ "تُو ہی میرا رہبر ہے" اُس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ایڈمیشن ٹیسٹ کی تیاری بھی تو مکمل کرنی تھی۔

...۞...

اچھے نمبروں سے انٹر کر لینے کے بعد طوبیٰ نے بڑی آسانی سے بی بی اے میں ایڈمیشن لے لیا تھا، یونیورسٹی کی ایک نئی ہی دنیا تھی، اسکالرشپ پر اس کا داخلہ تو ہو گیا لیکن اس کامیاب یونیورسٹی کے

طلباء کا اسٹیٹس اکثر ہی اُسے حسد میں مبتلا کر دیتا تھا۔

''یہ سب مجھے بھی حاصل ہوگا۔'' وہ اپنے آپ کو یقین دہانی کراتی۔

آج بھی وہ کلاس میں پہلی صف میں بیٹھی تھی، سر خلیل جو ہیومن ریسورس منیجمنٹ پڑھاتے تھے آج کسی اور ہی موڈ میں تھے۔لڑکوں نے جو نیا ٹاپک چھیڑا تھا اُس سے طوبیٰ کو سخت کوفت ہو رہی تھی۔محبت اور پروفیشنل لائف، بھلا یہ بھی کوئی عنوان تھا، طوبیٰ بے دھیانی سے سب کے مکالمے سنتے ہوئے اپنی کاپی پر ڈولز بنا رہی تھی، بڑے چھوٹے لمبے، گول دائرے۔

''محبت ایک طاقتور جذبہ ہے جو ہماری زندگیوں کو نئی شکل، نیا توازن، نیا نقطۂ نظر دیتا ہے۔ میں اس بات کا بھی ذکر کروں گا کہ ٹین ایج کی محبت کو اکثر لوگ بے کار وقتی کشش کا نام دیتے ہیں حالانکہ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔اس کو صرف لڑکے اور لڑکی کے تعلق میں قید کرنا ایک بے وقوفی ہے۔کس فنکار کو کبھی اپنے فن سے بھی ویسی ہی محبت ہو جاتی ہے جیسے کبھی کسی محبوب نے اپنی محبوبہ سے کی ہوگی۔ کبھی کوئی مجسمہ ساز اپنے ہی بنائے ہوئے مجسمہ کے عشق میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔''

سر خلیل اب تمام بحث کا لب لباب بیان کر رہے تھے اور تمام ہی طلباء زور و شور سے اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔

''تو محبت چاہے جس عمر میں بھی کریں، بس اپنی ترجیحات کو مدّنظر ضرور رکھیں۔پہلی ترجیح آپ کی تعلیم اور ترقی ہی ہونی چاہیے ورنہ محبوب بھی آپ کو گھاس نہیں ڈالے گا۔''

پوری کلاس قہقہوں سے گونج اُٹھی تھی اور سر خلیل کے کلاس سے نکلتے ہی منچلے حال ہی میں کی گئی گفتگو کے مزے لے رہے تھے۔

''شکر ہے کچھ کام کی بات بھی کی انہوں نے جاتے جاتے۔'' طوبیٰ نے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ثنا سے کہا جو اسکول کے زمانے سے اُس کی گہری دوست تھی۔گو کہ دونوں کا کالج مختلف تھا لیکن یونیورسٹی میں دونوں نے ساتھ ہی ایڈمیشن لیا تھا۔

''کیفیٹیریا (cafeteria) کی طرف چلو، فوراً'' طوبیٰ نے ثناء کو ہدایت دیتے ساتھ ہی عجلت میں

کتابیں سمیٹیں اور یہ جا وہ جا۔ آج صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی اور یونیورسٹی بس پکڑنے کے چکر میں ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ آج صبح سے یہ تیسری کلاس تھی اور پیٹ میں چوہوں نے ہنگامہ مچا رکھا تھا، ثناء بھی سرعت سے اُسکے پیچھے نکلی۔

''ارے! ذرا تو دھیرے چلو۔'' ثناء نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''جلدی بیٹھو، ورنہ کوئی لے جائے گا یہ کُرسی بھی۔'' طوبیٰ نے کیفیٹیر یا پہنچ کر ثناء کو پکارا۔

''ہاں بھئی، پاکستان میں کون کرسی چھوڑتا ہے۔'' ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو کیا پوری دنیا میں چھوڑ دی جاتی ہے؟'' طوبیٰ کہتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ پیٹ پوجا کر چکی تھیں۔

''طوبیٰ کیا اب بھی اسفر بس اسٹاپ پر نظر آتا ہے؟'' ثناء نے شرارتی مسکراہٹ سے سوال کیا۔

''آں..... نہیں..... پتا نہیں'' طوبیٰ نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ اب وہ اس کو کیا بتاتی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر اس کی متلاشی نگاہیں اُس کو مجمع میں کھوج لیتی ہیں۔ یہ خاموش ملاقاتیں بھی عجیب ہی تھیں، نہ کوئی مصرف نہ کوئی نتیجہ، بس ایک رسم تھی جو بنا کہے ہی نبھ رہی تھی۔

ان چاہی لیکن پُرسکون، لیکن جب سے یونیورسٹی شروع ہوئی تھی متلاشی نگاہیں مسلسل ناکام لوٹ رہی تھیں۔

''تم بھی خوامخواہ ہر مرتبہ اسفر کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہو، صحیح Crush ہے وہ تمہارا۔''

طوبیٰ نے اپنی خفّت مٹانے کے لیے سارا الزام ثناء کے سر دھر دیا۔

"میرا تو نہیں لیکن کسی اور کا Crush ضرور ہے۔ تب ہی اس کے ذکر پر گال گلابی ہوجاتے ہیں۔"

ثناء نے شرارت سے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

طوبیٰ نے بات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور واپس اگلی کلاس کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''بہاولپور سے پھپھو آئی ہیں کل۔'' ثناء نے پر جوش ہوکر اطلاع دی۔ یار اُن کا بیٹا تو بڑا ہینڈسم ہوگیا ہے۔'' وہ اب اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جارہی تھیں۔

''کون؟ وہ موٹا ببلو جو پانچ سال پہلے کراچی آیا تھا؟'' طوبیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے تو لگتا تھا بہاولپور میں سارے گوگلو ہی رہتے ہیں۔ یہ ہینڈسم کہاں سے نکل آیا؟''

''میں تو اُسے دیکھ کر مبہوت ہی رہ گئی، وہ تو پھپھو نے گلے لگا لیا ورنہ میں بے وقوفوں کی طرح دروازے پر کھڑی اُس کو تکتی ہی رہتی۔'' ثناء ابھی بھی خوب پُرجوش تھی۔

''تم اور تمھاری فضول باتیں!'' طوبیٰ نے چڑ کر کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے مجھے اُس سے محبت ہوگئی ہے۔'' ثناء نے جذبات کی شدّت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''حد ہے ثناء!، تم بھی عجیب ہو۔ کچھ نہیں ہوتی یہ محبت بس وقتی جذبہ ہے جو دل کو خوشی دیتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد انسان سب بھول بھال جاتا ہے۔ کون کہاں ہے، کیسا ہے، کچھ یاد نہیں رہتا کسی کو۔'' طوبیٰ نے ناصحانہ انداز اپنایا۔

''نہیں طوبیٰ! اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ محبت ہی دنیا کا سب سے خوبصورت جذبہ ہے، بالکل مخلص اور کسی بھی ریا سے پاک۔'' ثناء ابھی بھی قائل نہ تھی۔

طوبیٰ کو ہنسی آ گئی، ''میری دوست، محبت بس لین دین کا نام ہے۔ بس خدا ہی ہے جو رحم کھا جاتا ہے ہمارے حال پر اور ہماری غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کر دیتا ہے ورنہ کوئی شخص اتنا ظرف نہیں رکھتا کہ ریا سے پاک محبت کرے۔''

''تم کیوں اتنا کڑوا سوچتی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم نے بڑا دھوکا کھایا ہے محبت میں؟''

ثناء نے خشمگیں نگاہوں سے طوبیٰ کو گھورا۔

''ضروری نہیں ٹھوکر کھا کر ہی انسان سنبھلے۔'' طوبیٰ نے مختصر جواب دیا اور کلاس میں داخل ہوگئی۔ اپنی عزیز از جان دوست کو وہ کیا بتاتی کہ جس جذبے سے وہ ڈر کر بھاگتی ہے وہ تو کب سے ایک آکٹوپس کی طرح اُس کو اپنے شکنجے میں لیے بیٹھا ہے۔

''اگر کامیاب ہونا ہے تو ایک کشتی کا انتخاب ضروری ہے اور کون سی کشتی میں میرا ناخدا ہے، میں جانتی

ہوں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی کُرسی سنبھالی۔

....۞....

شام پانچ بجے کے قریب جب وہ یونیورسٹی کی بس سے اُتری تو بے اختیار ہی ایک اُچٹتی سی نگاہ آس پاس ڈالی یہ جانتے ہوئے بھی کہ کالج کے زمانے چلے گئے تھے۔

''اُس نے بھی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہوگا۔'' طوبیٰ نے خود ہی اسفر کی غیر حاضری کا جواز پیش کیا۔''پتا نہیں کہاں داخلہ لیا ہوگا اُس نے؟ اُسے سائنسدان بننے کا بڑا شوق تھا۔ اگر پڑھائی میں دل لگایا ہوتا تو کچھ کر ہی لیتا۔'' طوبیٰ اپنے آپ ہی مسکرا دی۔ سر پر پہنا اسکارف تھوڑا آگے کو کھینچ کر پوری طرح بالوں کو ڈھانپ لیا۔

ابھی اس نے چند ہی قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ ایک مانوس چاپ قدموں سے قدم ملائے محسوس ہوئی۔ طوبیٰ نے چونک کر دیکھا تو اپنی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، نظریں سامنے مرکوز رکھے وہ خاموشی سے اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔ مناسب فاصلہ لیے وہ ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی ساتھ تھا۔

''طوبیٰ! مجھے کچھ بات کرنی ہے۔'' چلتے چلتے اُس نے طوبیٰ سے کہا۔

طوبیٰ نے حیرت سے درخواست کرنے والے کی طرف دیکھا۔ آج یہ دوسری بار تھا جب اسفر نے اسٹاپ پر صرف نظر آنے کے علاوہ اُس سے کوئی کلام کیا تھا۔ اُس کی ستارہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

طوبیٰ سڑک کے کنارے لگے ایک پول کے پاس رُک گئی اور یوں ظاہر کیا جیسے اُسے دیکھ کر حیران ہو۔''اوہ، اسفر، کیسے ہو؟'' بمشکل بات بنا کر اُس نے حتی الامکان پرسکون دکھائی دینے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ہی اب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اسفر نے گہری سانس لی جیسے کوئی تیر اک پانی کی سطح پر اُبھرا ہو۔

''ٹھیک ہوں، تم سے دو منٹ بات کرسکتا ہوں؟''

''ہاں بولو!'' لہجہ انتہائی اطمینان بخش تھا جس نے اسفر کے اعتماد کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔
طوبیٰ گھبرا کر کسی کو ایسا تاثر نہیں دینا چاہتی تھی جو ایسے علاقوں کے لیے کوئی مسالے دار خبر بن جائے۔
نارمل ردِعمل کرنا ہی اس کو بہتر لگا چاہے اندر بھونچال آیا ہوا ہو۔
''وہ بس..... تمہیں ابھی دو دن پہلے دیکھا میں نے اس وقت یونیورسٹی کی بس سے اترتے، تو وہ تم آج بھی نظر آ گئیں تو سوچا ہیلو ہائے کر لوں۔'' اسفر نے بے ترتیب الفاظ سے کہا۔
''یاد ہے نا ہم نے کتنا ٹائم اسکول میں ساتھ گزارا ہے۔'' وہ ابھی بھی جھجک رہا تھا۔
طوبیٰ نے بغور اسفر کا جائزہ لیا۔ نئے اسٹائل میں بنائے گئے بال، نیلی جینز کے اوپر کالی ٹی شرٹ، وہ کافی ہینڈسم لگ رہا تھا۔
''ہوں.....'' طوبیٰ نے یک حرفی جواب دیا۔ اب وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔
آثار جو کچھ اُسے بتا رہے تھے یک دم ہی کیا ہوا تھا کہ وہ اُس کو سننا نہیں چاہتی تھی۔
''میں..... دراصل تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اسکول کے زمانے ہی سے تمہیں پسند کرتا ہوں۔''
آنکھیں بند کر کے کسی رٹو طوطے کی طرح یہ جملہ ادا ہوا تھا۔
طوبیٰ کو اسفر سے اس حوصلے کی اُمید نہ تھی۔

....۞....

''خیریت تو ہے سب؟'' فرقان نے اسفر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا:''کھوئے کھوئے سے رہتے ہو آج کل۔''

وہ اسکول کے زمانے سے اسفر کا دوست تھا۔ گو کہ اسکول کے بعد نہ کالج نہ یونیورسٹی میں وہ دونوں ساتھ تھے مگر لڑکوں کو کہاں دوستی نبھانے کے لیے کوئی واسطے یا راستے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چائے کے جا بجا ہوٹل ان گنت دوستیاں برسوں سے سینچتے آ رہے تھے۔

''نہیں یار..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اسفر جو کرسی پر آرام دہ حالت میں تقریباً لیٹا ہوا تھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''چلو پھر جیسی بات ہے وہی بتا دو۔'' فرقان نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

اسفر ابھی بھی اُنہی خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے ماتھے پر آئے سیاہ بالوں کو سمیٹتے ہوئے اب وہ بولا تو وہ بھی ایک سوال ہی تھا۔

''یار ایک بات تو بتاؤ، یہ خدا کو کسی نے بنایا ہوگا کیا؟'' فرقان کے استفسار پر ہی اس نے اپنی الجھن کا ذکر فرقان سے کیا جو جانے کب سے اُس کے دماغ میں پل رہی تھی۔

فرقان جواب چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا، اُسے ایک دم اچّھو لگا۔ سنبھلنے کے بعد اُس نے بغور اسفر کو دیکھا۔ مضبوط بازو، پُرکشش خدوخال اور اس پر چمکدار آنکھیں جو اُس کی ذہانت کی غماز تھیں۔ وہ عام سا لڑکا جو اسکول کے زمانے میں دبّو سمجھا جاتا تھا، بیس کے اوائل میں انتہائی جاذبِ نظر، خوش لباس اور پُراعتماد ہو چکا تھا۔

''یار دِکھنے میں تو کل پُرزے تمہارے ٹھیک نظر آ رہے ہیں، لگتا ہے اور کوئی ٹیکنیکل فالٹ ہو گیا ہے۔'' فرقان نے اُس کی بات کو ہوا میں اُڑاتے ہوئے کہا۔

''اور یہ جو خدا ہے، اس کو کیا مزہ آیا ہوگا یہ دنیا بنا کر۔ اصل مزہ تو ہم نہیں کر رہے جو زندگی جی

رہے ہیں؟ بیٹھ کر خالی دیکھنے والے اور صرف فیصلہ کرنے والے کو بدلے میں کیا ملتا ہوگا؟''

فرقان حیرت سے کچھ لمحے اسفر کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا:

''یہ تجھے آج کیا ہوگیا؟ یہ تو سب ہی کو پتا ہے کہ خدا کو کسی نے نہیں بنایا اور اللہ کی ذات عظیم ہے اس کا کسی سے کیا مقابلہ؟ ہماری محدود سوچ کہاں اِن باتوں کا احاطہ کرسکتی ہے؟''

فرقان نے اپنا والٹ نکال کر پیسے چائے کے کپ کے نیچے رکھے اور کھڑا ہوگیا۔ اسفر نے نظر اُٹھا کر فرقان کو دیکھا۔ ابھی وہ مزید بیٹھنے کے موڈ میں تھا لیکن فرقان شاید اس طرح کی کسی گفتگو میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، ایک گہرا سانس لے کر اسفر بھی کھڑا ہوگیا۔

''پتا ہے میں ایک تجربہ کرنے والا ہوں۔'' اسفر نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

فرقان بھی اُس کے پیچھے تھا۔ ''کیسا تجربہ؟''

وہ دونوں بائیک کے پاس آچکے تھے جو فٹ پاتھ کے کنارے ہی کھڑی تھی۔

''وقت آنے پر بتاؤں گا۔'' فرقان بائیک اسٹارٹ کررہا تھا اور اسفر اُس کے پیچھے بیٹھ گیا۔

''لگتا ہے تو نے صحیح سبق سیکھا ہے کہ وقت سے پہلے کام کرنا کبھی اچھا نہیں ہوتا۔''

فرقان نے ہنستے ہوئے بائیک کو کِک لگائی۔ اسفر سمجھ گیا تھا کہ فرقان کا اشارہ کس طرف تھا۔ ''میرے خیال سے تو وہ صحیح وقت تھا۔ بس قسمت نے ساتھ نہ دیا۔''

فرقان بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟'' اسفر نے حیرت سے پوچھا، وہ دونوں اب گلی سے نکل کر مرکزی سڑک پر آگئے تھے اور ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے کافی زور سے بول رہے تھے۔

فرقان نے ہلکی سی گردن موڑ کر کہا:

''ابھی تو تمہیں خدا کے اٹل ہونے پر شک تھا اور اب اُس کی بنائی گئی قسمت کو کوس رہے ہو۔'' وہ ایک بار پھر ہنسنے لگا ''یار اتنا نہ سوچا کرو، اس ننھے سے دماغ سے، فزکس ویسے ہی بڑا مشکل مضمون ہے، بس اُس میں دماغ لگا، دل تو ویسے ہی تیرا کہیں اور لگا ہے۔ لہٰذا بے کار کی باتیں چھوڑ دے، خدا کو

کس نے بنایا، کیوں بنایا.....''

فرقان نے اسفر کی ہنسی اُڑائی، بائیک چلاتے ہوئے بھی وہ خوب محظوظ ہوا۔

اسفر اس بار کچھ نہ بولا، سوچ کا اِک نیا در اُس کے سامنے کھل گیا تھا۔

''اگر خدا نے قسمت نہیں بنائی تو یہ ہونا نہ ہونا کیسے ہوتا ہوگا؟ کیا سب واقعات خود بخود رُونما ہوجاتے ہوں گے۔ بس ایسے ہی؟ ہر چیز کا کوئی محرک ہوتا ہے۔ اُس کے بغیر کوئی حرکت ممکن نہیں، تو قسمت کیا چیز ہے پھر؟ اس کا مطلب میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا قصور میرا اپنا تھا؟

حیرت کا ایک شدید جھٹکا اُس کو لگا تھا، ہر کام کو سوچ سمجھ کر کرنے والا، پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا، آج اپنی ناکامی کا قصوروار قسمت کو بھی نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔

....۞....

''طوبیٰ.....!!! یہ بات تم نے مجھے کیوں نہیں بتائی؟''

ثناء کو کنول کی بات پر صدمہ ہی نہیں زور کا جھٹکا بھی لگا تھا۔

طوبیٰ نے حیرت سے کنول کو دیکھا جواب کچھ شرمندہ نظر آرہی تھی۔ کنول طوبیٰ کی چچا زاد اور بچپن کی ہمجولی تھی۔ کوئی بھی بات ہو کنول ہمیشہ طوبیٰ کے ساتھ تھی چاہے وہ بچپن میں کسی شرارت پر ڈانٹ کھانا ہو یا مل کر قصّہ کہانیاں پڑھنا، اتفاق یہ تھا کہ کنول اور ثناء کالج فیلوز تھیں اور جب پتا چلا کہ اُن کی مشترکہ دوست طوبیٰ ہے تو یہ تکون اور بھی مضبوط ہوگئی تھی۔ اب کنول ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی لیکن تینوں کی دوستی جوں کی توں برقرار تھی اور تقریباً ہر اتوار ہی کنول کے گھر کی وسیع چھت پر شام کی چائے کا سیشن ہوتا جہاں پورے ہفتے کی روداد بیان کی جاتی تھی۔ یوں تینوں لڑکیوں کی کوئی بھی بات کسی سے پوشیدہ نہ رہتی تھی۔

طوبیٰ حیران کھڑی تھی جو ابھی ابھی چچی جان سے چائے کی ٹرے لے کر اوپر آئی تھی اور ثناء کی کھا جانے والی نظروں کا سامنا کر رہی تھی۔ کنول کچھ شرمندگی سے کُرسی پر پہلو بدل کر رہ گئی۔

''کون سی بات؟'' طوبیٰ ابھی بھی حیران تھی۔

''یہی کہ اسفر.....'' ثناء کنول کے اشارے پر خاموش ہوگئی۔طوبیٰ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ پھر قدرے سنبھلتے ہوئے بولی:

''کون؟ وہ اپنے اسکول والا اسفر؟''

منہ سے الفاظ نکلنے کے بعد طوبیٰ کو اپنے بھونڈے انداز کا ادراک ہوا۔

''غالباً ہم تینوں ایک ہی اسفر کو جانتے ہیں اور وہ ہے اسفر عباس، ہمارا اسکول فیلو۔''

ثناء نے چبا چبا کر کہا۔

''ہاں! تو؟'' طوبیٰ نے اُلٹا سوال داغ دیا۔

ثناء ابھی بھی ناراض نظر آ رہی تھی،''تم نے اسفر والی بات مجھے کیوں نہیں بتائی؟''

''مجھے بھی کہاں بتانا تھا اس نے۔'' کنول کو آخر اپنی صفائی دینے کا موقع مل گیا۔''وہ تو میں تائی امی کے ہاں موجود تھی اور اُسی وقت یہ فق صورت لئے گھر پہنچی۔اس کو دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔''

''پھر؟'' ثناء کو اشتیاق ہوا۔

''اسفر نے تم سے اظہار محبت کیا؟'' ثناء کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''یہ اتنی بھی ناقابل یقین اور قابل ذکر بات نہیں۔'' طوبیٰ نے بے پرواہی سے کندھے اچکائے اور پر سکون ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہو چائے کا کپ اُٹھا لیا۔اُس کی ساری توجہ چائے سے اُٹھنے والی بھاپ پر تھی جو ہوا میں مرغولے لے بنا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس وقت دنیا کا سب سے اہم کام اِن اشکال کا مشاہدہ کرنا تھا۔

''اور برائے مہربانی اپنے گلوں سے بانس نکال لیں۔ پورا محلہ سُن رہا ہے آپ کی گفتگو۔''

اچانک خیال آنے پر طوبیٰ نے اُلٹا اُن دونوں ہی کو گھُرک دیا۔

وہ تینوں سہانی شام سے لطف اندوز ہونے کے لیے جمع ہوئے تھے اور ایک چھوٹے سے وقفے

میں کایا پلٹ ہوگئی تھی۔لیکن طوبیٰ کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر وہ دونوں ہی اچنبھے میں تھیں۔

''مگر تمہیں مجھے بتانا تو چاہئے تھا۔'' ثناء نے کمزور سا شکوہ کیا۔

''اچھا بھئی اب اگر کسی نے مجھے نظر اُٹھا کر بھی دیکھا تو سب سے پہلے تمہیں اطلاع کروں گی۔'' طوبیٰ سخت کوفت کا شکار ہو رہی تھی۔اُس نے کنول کو گھور کر دیکھا تو وہ بھی خفیف ہوگئی۔

''وہ دراصل بس ایسے ہی اسکول کی پرانی یادوں کا تذکرہ نکلا تو اسفر کا بھی ذکر نکل آیا۔''

طوبیٰ کو کنول کا صفائیاں دینا بھی گراں گزر رہا تھا۔''مجھے تو سمجھ نہیں آتی یہ اسفر تم لوگوں کو اتنا یاد کیوں آتا ہے۔اسکول ختم ہوئے تین سال گزر گئے ہیں۔''

طوبیٰ کے غیر متوقع رویے پر وہ دونوں ہی خاموش ہوگئی تھیں۔طوبیٰ کے اسفر کے لیے پسندیدگی کے جذبات سے وہ دونوں ہی واقف تھیں اور اب اُس کا اس قدر شدید ردِعمل وہ بھی تب جب اسفر کھل کر اُس سے اظہار کر چکا تھا اُن دونوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''بات اسفر کی نہیں!'' ثناء نے بات سنبھالتے ہوئے کہا،بس میں حیران ہوگئی تھی کہ کسی نے پہلی بار میری دوست سے اظہارِ محبت کیا اور اُس نے مجھ سے تذکرہ تک نہ کیا۔ہم تو انتظار ہی میں بیٹھے ہیں کہ کوئی ہم سے بھی آ کے یہ کہے۔'' ثناء نے کنول کے ہاتھ پر تالی ماری۔

''میرے نزدیک یہ بالکل بھی اہم نہیں ہے۔'' طوبیٰ نے سنجیدگی سے کہا:

''میری ترجیحات کچھ اور ہیں۔فی الوقت میں اپنا سارا دھیان صرف پڑھائی پر لگانا چاہتی ہوں،اسی لیے میں نے ایک ایوننگ کورس بھی جوائن کر لیا ہے۔

''رحم کرو اپنے اوپر.....'' ثناء نے فکرمندی سے کہا:

''صبح یونیورسٹی،سہ پہر ٹیوشن اور پھر یہ ایوننگ کورس،تھوڑا وقت اپنی ذات کے لیے نکالو۔''

یہ سب کچھ میں اپنی ذات ہی کے لیے تو کر رہی ہوں۔'' طوبیٰ نے مضبوط لہجے میں کہا:

''میری تکمیل اسی میں ہے۔میری کامیابی ہی میری تکمیل ہے۔''

''بس کرو بھئی،آج کی شام تو تم لوگوں نے یونہی برباد کر دی۔ویسے ہی طوبیٰ دو ہفتوں بعد ہاتھ آئی

ہے اور سارا وقت سوال جواب ہی میں گزر گیا۔'' کنول کچھ بے زار ہوئی۔

''چلو برابر والی خالہ کے گھر سے کیریاں توڑ کر لاتے ہیں۔ ان کے آم کے درختوں پر بڑی ہی مزیدار کیریاں لگی ہیں۔''

''کیری کا تو نام بھی نہ لو۔'' طوبیٰ نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا:

''میرے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں۔''

''بھئی تم یہاں بیٹھو اور پھیکے بسکٹ کھاؤ، میں کنول کے ساتھ کیریاں توڑ کر لاتی ہوں۔'' ثناء ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوگئی۔

زیرے والے بسکٹ کترتے ہوئے طوبیٰ کی نظر ٹھنڈی ہوتی چائے پر پڑی۔ بھاپ اب غائب ہو چکی تھی اور چائے کے اوپر ایک جھلی سی جمنے لگی تھی۔ طوبیٰ کے اسفر کے لیے جذبات بھی بھاپ کی طرح اُڑ گئے تھے۔ ہاں لیکن ایک پرتی حفاظتی تہہ اُس کی محبت کے گرد ضرور بن گئی تھی، وہ اس کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ کسی خوبصورت یادگار کی طرح۔

اُس دن کا منظر ایک بار پھر طوبیٰ کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اسفر کی ستارہ آنکھیں بند تھیں اور اُس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ وہی تھے جس کی انجانے میں طوبیٰ نے کبھی تمنا کی تھی۔

''وہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں اسکول کے زمانے سے پسند کرتا ہوں۔''

طوبیٰ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اُس کو خود بھی حیرت تھی کہ کیوں اس طرح اچانک اسفر کے لیے اس کے جذبات سرد پڑ گئے تھے۔ بس اچانک ہی ایک بجلی سی کوندی تھی اور اس نے وہ کہہ دیا جس کو کہنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

طوبیٰ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری:

''کیا جگہ تھی اظہارِ محبت کی.....بس اسٹاپ۔'' اُس نے اپنے احساسات کو جواز دیا:

''بندہ کسی ڈھنگ کی جگہ کا ہی انتخاب کر لیتا ہے ایسی انمول بات کہنے کے لیے۔'' اُس نے غصے سے سوچا۔ ''لیکن وہ تو خاص لوگوں کی زندگی ہوتی ہے نا، میں تو طوبیٰ اکبر ہوں۔ مجھے کیوں ہر چیز طشتری

میں رکھ کر ملنے لگی۔ مجھے تو ہر چیز پوری جدو جہد کے بعد ملے گی۔''

اُس نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا:

''اللہ میاں، میں ہی کیوں ہوں اس امتحان کے لیے؟ کیوں ہمیں اتنا عام پیدا کیا ہے تو نے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر ابو اچھا کماتے، ہم چیزوں کو نہ ترستے۔ کنول کی طرح میں بھی گاڑی میں بیٹھ کر یونیورسٹی جاتی۔ ہر ویک اینڈ ہم رستوران جا کر کھانا کھاتے، انجوائے کرتے، میں بھی ثناء کی طرح نت نئے برانڈز کے کپڑے پہنتی اور میری بھی امیر کبیر پھپھو خالہ کے ہینڈسم بیٹے سے منگنی ہوجاتی۔ سب کچھ بیٹھے بٹھائے مل جاتا۔''

اُس نے دل ہی دل میں ہزاروں شکوے کر ڈالے۔''کسی گھسے پٹے ڈرامے کی ہیروئن کی طرح بس اسٹاپ پر کیے جانے والے اظہارِ محبت کو کبھی قبول نہیں کروں گی۔ اپنی زندگی سے مجھے ہر خوشی کشید کرنی ہے..... ہر خوشی .....اللہ میاں.....اگر یوں ہے تو یونہی صحیح۔''

آسمان سے نظر ہٹی تو سامنے گھر کی چھت پر ٹہلتے نوجوان جوڑے پر آ کر ٹھہر گئی، خوشی اور اطمینان اُن دونوں کے ہر انگ سے جھلک رہا تھا۔

"میں اتنی مادّہ پرست تو کبھی نہیں تھی، پھر کیوں مجھے اچانک اس رشتے سے نفرت ہو چلی ہے۔"

اُس کی اُلجھن اب بھی برقرار تھی ایک بار پھر اسفر کا چہرہ اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔اُس نے جب اپنی سختی سے میچی ہوئی آنکھیں کھولی تھیں تو وہ پُر یقین نہیں تھا کہ طوبیٰ اُس کے سامنے کھڑی ہوگی یا جا چکی ہوگی، آنکھیں کھلنے پر جو اُس نے طوبیٰ کی آنکھوں میں جھانکا تھا تو اُسے وحشت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

طوبیٰ کو یاد آیا کیسے اسفر کے چہرے پر اُس کو موجود دیکھ کر ایک اُمید بھری مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ شاید اُس نے تصور نہیں کیا تھا کہ آنکھیں کھولنے پر طوبیٰ اُسے وہاں ملے گی۔

''میں کب سے یہ بات تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں تم ناراض نہ ہوجاؤ۔''

حسبِ عادت اسفر نے بالوں کو انگلیوں سے درست کیا۔اس کے ہلکے گھنگھریالے بال اُس کے ماتھے

پر ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ستارہ آنکھیں اور گھنی پلکیں جو ہمیشہ طوبیٰ کی دھڑکنیں بے ترتیب کر دیتی تھیں، ایک طوفان برپا کر دیتی تھیں، اُس دن اچانک جیسے وہ طوفان تھم گیا تھا۔

گو کہ طوبیٰ نے اس دن کا بہت شدّت سے بھی انتظار نہ کیا تھا لیکن کوئی جذبہ تھا جو اُسے ہمیشہ اسفر کی طرف مائل کرتا تھا۔ اور آج جب اسفر اپنی پوری رعنائی کے ساتھ اُس کے سامنے اُس کی پہلی ان کہی خواہش پوری کرنے کھڑا تھا تو ایک خودکار سسٹم کی طرح جو الفاظ اُس کے منہ سے ادا ہوئے تھے وہ خود اُس کے لیے بھی ناقابلِ یقین تھے:

''آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ۔''

آس پاس کے شور میں ان دونوں کے درمیان گھمبیر خاموشی تھی۔ قریب ہی کسی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی تھی۔ اُن دونوں کے بیچ کے سناٹے میں آواز کچھ زیادہ ہی نمایاں تھی۔ گھنے سائے تلے دو ستارے ایک دم ہی بجھ گئے تھے۔ روشن چہرہ فق ہو گیا تھا۔ مسکراتے لب بھنچ گئے تھے۔ طوبیٰ کا سپاٹ چہرہ اسفر کو پیغام دے چکا تھا۔ اُس نے مزید کچھ نہ کہا۔ بس خاموشی سے طوبیٰ کے برابر سے گزر گیا۔

طوبیٰ کو اپنے ماموں کی شادی یاد آئی۔ شادی ہال قہقہوں سے جگمگا رہا تھا اور اچانک بجلی جانے سے ہر سو تاریکی پھیل گئی تھی، شور یک دم تھم گیا تھا۔ ویسی ہی تاریکی اور خاموشی عین شام کو پھیل گئی تھی.....

چار سُو.....!

....۞....

سرخرّم کے اسائمنٹ کے سلسلے میں وہ دونوں ہی یونیورسٹی کے انٹرنیٹ کیفے میں سر جوڑے مطلوبہ مواد اکٹھا کر رہی تھیں۔

"طوبیٰ، آج کا کام یہی روک دیتے ہیں۔ باقی کل کر لیں گے۔" ثناء کی عدم دلچسپی طوبیٰ کافی دیر سے محسوس کر رہی تھی۔

"اوفوہ، ثناء! تم بھی اتاؤلی ہو رہی ہو۔ کام تو مکمل کر لو، اسائمنٹ جمع کروانے کی تاریخ دو دن ہی دور ہے۔" طوبیٰ نے بدستور اسکرین پر نظریں ٹکائے ہوئے کہا۔

"ہاں تو کل کر لیں گے نا، دو دن پڑے ہیں ابھی پورے۔ اب اُٹھ جاؤ۔ پھپھو کے ساتھ چائے تو پی لوں آج پھر تو وہ اب رسم کرنے ہی آئیں گی۔" ثناء کے گلال چہرے پر طوبیٰ نے ایک نظر ڈالی اور شدید کوفت کے باوجود اُسے ہنسی آ گئی۔ مستقبل کی بہو ہونے کی حیثیت سے ثنا ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی تھی۔

"حد ہے ویسے ثناء ابھی جو ہونے والی ساس کے آگے پیچھے پھر رہی ہو، شادی کے بعد برائیاں کرتے نہ تھکو گی۔"

"جی نہیں، بہت اچھی ہیں میری پھپھو، اور اُن کا بیٹا بھی بہت سمجھدار ہے۔ دیکھ لینا ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔" ثناء نے بھی جھٹ سے جواب دیا۔

طوبیٰ نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ "ایسا کرو تُم جاؤ، آج میرے پاس گھر پر بچّے پڑھنے نہیں آئیں گے کیونکہ سب امتحانات سے فارغ ہوئے ہیں تو چھٹّی منا رہے ہیں۔ میں بھی جلد از جلد کام ختم کر کے نکل جاؤں گی۔" ثناء تو جیسے انتظار میں بیٹھی تھی۔ جھٹ پٹ چیزیں سمیٹتی طوبیٰ کو الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتی یہ جا وہ جا۔

طوبیٰ نے گہرا سانس لیا۔ وہ اپنی کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکی۔ ایک بے نام اداسی تھی اور ایک شناسا

چہرہ یادوں کے پردوں پر لہرایا تھا جسے اُس نے سر جھٹک کر یک دم ہی پسِ پشت ڈال دیا۔

"مجھے بہت آگے جانا ہے۔ میں اپنے پیروں میں کوئی بیڑیاں نہیں ڈال سکتی۔"

اُس نے ہمکلامی کی اور ٹک ٹک ماؤس کو کلک کرنے لگی۔ سوا چار بجے کے قریب وہ USB میں تمام کام محفوظ کر کے اُٹھنے ہی لگی تھی کہ اچانک اسکرین کے عین بائیں جانب محفوظ شدہ ایک فائل پر اُس کی نظر ٹھہر گئی۔

Student Side Hustle: Quick Cash

حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ طوبیٰ نے اُس آئکون پر کلک کر دیا۔ سیکنڈز میں جو دستاویز سامنے کھلی وہ رنگین صفحات اور سرخیوں سے مزیّن تھی۔ طوبیٰ اِس غیبی مدد پر پہلے پہل مشکور لیکن پھر کچھ مشکوک ہوئی۔

"اتنی آسانی سے کوئی چیز مجھے مل سکتی ہے کیا؟" دماغ نے دل کی طمانیت پر سوال اُٹھایا تھا۔

"اتنا ناشکرا پن بھی اچھی بات نہیں۔" دل نے گھرکا تھا۔

ہچکچاتے ہوئے بالآخر دسیوں دیے گئے لنکس میں سے اُس نے ایک لنک پر کلک کر دیا۔ وہ ایک ویب سائٹ کا لنک تھا جو طلبا کو کم وقت میں موثر کمائی کے کئی آپشن مہیّا کر رہی تھی۔

طوبیٰ کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ کس طرح کم وقت میں وہ آن لائن پیسہ کما سکتی تھی، ہدایات پڑھنے کے بعد اُسے بخوبی اِس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ بیان کردہ حکمتِ عملی کافی آسان لگ رہی تھی۔ سروے کرنا، مصنوعات کی جانچ کرنا یا فوری نقد رقم کے لیے مختصر مضامین لکھنا۔ طوبیٰ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ بے یقینی کے عالم میں طوبیٰ کی انگلیاں کی بورڈ پر آن لائن فارم پُر کرنے کے لیے حرکت کرنے لگیں۔

...۞...

''اسفر، یار کل فزکس کی کلاس میں سر نے کون سا ٹاپک پڑھایا تھا؟''

''ہوں؟'' اپنے برابر بیٹھے لڑکے کے پوچھے گئے سوال پر اسفر ایک دم گڑبڑا گیا۔

''دراصل میں کل غیر حاضر تھا تو اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' احمد نے وضاحت کی۔

اسفر نے اپنی کاپی کے صفحات اُلٹ پلٹ کے مطلوبہ صفحہ نکال لیا۔ احمد نے حیرت سے اسفر کی کاپی کو دیکھا، تاریخ لکھی تھی اور پورے صفحے پر گول دائرے بنے تھے، اُلجھے ہوئے دائرے۔

''ابے۔ یہ کون سی زبان میں لیکچر نوٹ کیا ہے تم نے؟'' احمد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

اسفر نے جھٹ سے کاپی بند کر دی۔ ''پتا نہیں سر کیا پڑھاتے ہیں۔ میر سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

''کیا بات کر رہے ہو یار؟ سر قاسم تو پوری فیکلٹی کے سب سے قابل اور مشہور اُستاد ہیں۔ چلو کوئی بات نہیں۔ میں کسی اور سے پوچھ لیتا ہوں۔''

اسفر نے اثبات میں سر ہلایا اور کتاب کے اوراق اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔

''کل رات بھی تو میں ان اسباق کا مطالعہ کیا تھا'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''لیکن.....'' رات بھر اسفر کتابیں کھول کر بیٹھا رہا تھا، لیکن مجال ہے جو ذہنی خلفشار سے ایک لمحے کے لیے بھی باہر آیا ہو؟ طوبیٰ سے ہوئی ملاقات کو سال بیت گیا تھا۔ وہ لمحہ اذیت ناک تھا لیکن اب مندمل ہو چکا تھا پھر بھی i am not interested کے الفاظ اُسے ایک طمانچے کی طرح محسوس ہوتے تھے۔

کتنی ہی دعائیں کی تھیں اُس نے اللہ کے حضور۔ عائشہ ہمیشہ کہتی تھیں کوئی بڑا کام کرنے جاؤ تو ضرور دو نفل پڑھ لینے چاہیں اور اس نے ان گنت نفل ادا کئے تھے کہ وہ من کی مراد پالے۔

لیکن کیا ہوا تھا! اتنی سفّاکی کی اُسے ایک فیصد بھی اُمید نہ تھی۔ دعاؤں پر سے اعتبار کھو دینے کو جی چاہتا تھا.....لیکن کفر کرنے کو بھی تو جگرا چاہئے۔

''کیا واقعی کوئی دعائیں سنتا بھی ہے؟'' اُس کا یقین ڈگمگا گیا تھا۔

....۞....

"اتوار کو آ رہی ہو نا پھر کنول کی طرف؟" ثنا نے سر فاخر کی کلاس ختم ہوتے ہی سوال کیا۔

''کیا کرنے؟'' طوبیٰ نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

''ارے۔ ہم تقریباً ہر ایک اتوار بعد ملتے ہیں تو یہ دوسرا اتوار ہے۔ بیٹھیں گے ساتھ چائے پئیں

گے۔'' ثناء نے تفصیل سے جواب دیا۔

''نہیں اس اتوار کو تو میری ایکسٹرا کلاس ہے۔'' طوبیٰ نے کتابیں بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جو کورس تم کر رہی تھی؟ ختم نہیں ہوا ابھی تک؟'' ثناء نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

''لیکن اتوار کو تو کوئی ادارہ کلاس نہیں رکھتا۔ یہ کیسا اَن پروفیشنل ادارہ ہے؟''

''ہاں ویسے تو نہیں ہوتی لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر ہمارا کورس تاخیر کا شکار ہو گیا ہے تو اس لئے اتوار کو ایکسٹرا کلاس ہے۔'' طوبیٰ کھڑی ہو گئی۔ ''لائبریری چل رہی ہو؟'' ثناء نے سر ہلایا اور جلدی جلدی کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''تو کلاس تو ایک گھنٹے کی ہو گی نا! تم فارغ ہو کر آ جانا۔ میں بھی دیر سے آؤں گی۔''

''اس اتوار مشکل ہے۔ اگلی دفعہ ان شاء اللہ!'' طوبیٰ نے معاملہ ختم کر دیا اور ثناء حیرت زدہ رہ گئی، وہ پچھلے ایک سال سے ہر مہینے ایسے ہی ایک اتوار کو کسی نہ کسی بہانے سے ایک تکون کی ملاقات کو التوا میں ڈال دیتی تھی۔ کنول نے بھی اس بات کو شدّت سے محسوس کرتے ہوئے ثناء سے تذکرہ کیا۔ وہ دونوں ہی وجہ سے لاعلم تھیں۔

سر جھٹکتے ثناء تیزی سے طوبیٰ کی ہمقدم ہوئی۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اپنے ادارے کا؟'' ثناء نے کچھ سوچنے والے انداز میں کہا۔

''کیوں تم نے جاسوسی کرنی ہے میری؟'' طوبیٰ نے چڑتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں بھئی۔'' اب کی مرتبہ ثناء بھی خفا ہو گئی۔ ''نہیں بتانا تو نہ بتاؤ۔ میں تو اپنے بھائی کے لیے پوچھ رہی تھی۔ اُس کے پیپرز ختم ہوئے ہیں تو اچھا ہے وہ بھی کہیں مصروف ہو جائے۔''

''کیئر یر بلڈرز'' طوبیٰ نے اس بار کوئی مزاحمت نہ کی۔ ''لیکن ایڈمن میں سے کوئی نہیں ہو گا اتوار کو، تو تم پیر ہی کو بھیجنا اپنے بھائی کو۔''

ثناء نے کچھ ٹٹولنے کے سے انداز میں طوبیٰ کی سمت دیکھا لیکن مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر پائی۔ اب اگر وہ مزید کُریدتی تو طوبیٰ نے چڑ جانا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ طوبیٰ اپنے خول میں بند

ہوجائے۔ وہ اس کی بچپن کی دوست تھی کب اُلجھی ہے اور کب پُرسکون وہ اس کو اندر باہر ہر طرح سے جانتی تھی۔

مالی طور پر طوبیٰ کنول اور ثناء دونوں سے خاصی کمزور تھی لیکن اُن دونوں نے کبھی اس فرق کو اپنی دوستی کے آڑے نہ آنے دیا تھا۔ حالانکہ طوبیٰ کے گھر کے حالات بھی ایسے کوئی گئے گزرے نہ تھے لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں طوبیٰ ہر شے کو فراموش کیے بیٹھی تھی۔ ثناء طوبیٰ کی ذہنی الجھنوں کا اندازہ تو لگا پائی تھی لیکن اس بات سے بے خبر تھی کہ اُن کی نوعیت کیا ہے۔

ہمیشہ کی طرح طوبیٰ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے آگے تھی اور ثناء اس کی رفتار پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لائبریری میں ایک خاموش کونے کا انتخاب کر کے جب دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں تو ثناء نے آخری کوشش کی۔

''طوبیٰ! کیا تم مجھے کچھ بتانا چاہ رہی ہو اور بتا نہیں پا رہی؟''

طوبیٰ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور ثناء نے طوبیٰ کی اپنی نوٹ بک پر سخت ہوتی گرفت کو۔ ''نہیں ثناء! تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں تم سے کچھ چھپاؤں گی؟''

''یہ تو تم ہی بہتر بتا سکتی ہو۔'' ثناء نے اُس کے ہاتھوں سے نظریں ہٹا کر چہرے پر جما دیں۔

''تم جانتی ہو مجھ سے کچھ بھی چھپانا تمہارے لیے آسان نہیں۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو۔'' طوبیٰ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اپنے نوٹس بنانے میں مصروف ہوگئی۔

....۞....

فرقان نے چائے کے ہوٹل کے پاس بائیک روکی۔ اسفر اُسے دور ہی سے نظر آ گیا۔ وہ اپنے موبائل پر بہت انہماک سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ شاید کوئی ویڈیو، ہاتھ میں چابی گھماتا فرقان اس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا دیکھا جا رہا ہے؟'' فرقان نے موبائل میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''فرقان نے برق رفتاری سے موبائل کا بٹن دبا کر اسکرین غائب کر دی۔

''کیا یار تم بھی اچانک وارد ہو گئے۔ کب سے انتظار کر رہا ہوں۔'' اسفر نے موبائل فون جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی ایسا کیا دیکھا جا رہا تھا جو میرے آتے بند کر دیا۔''

''کچھ خاص نہیں بس ایسے ہی!'' اسفر نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا، ''دو چائے!'' اُس نے کاؤنٹر پر موجود لڑکے کو آواز لگائی۔

''اور کیسا چل رہا ہے سب؟'' فرقان نے گہری نظروں سے اسفر کا جائزہ لیا۔ بظاہر سب بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔ طوبیٰ کے انکار کے بعد نہ ہی اسفر کا حلیہ بگڑا تھا اور نہ ہی وہ مجنوں بنا تھا لیکن کچھ اُلجھا اُلجھا وہ اب بھی رہتا تھا۔

''ٹھیک'' اسفر نے یک لفظی جواب دیا، ''تم بتاؤ کیا ارادہ ہے آگے؟''

''بس یار یہ گریجویشن کے بعد ہی دیکھیں گے اب کیا کرنا ہے۔ بزنس پڑھنے میں کوئی خاص مزا نہیں آ رہا۔ بس کتابی باتیں لگتی ہیں ساری۔ مجھے لگتا ہے اصل بزنس تو اسی وقت آتا ہے جب آپ مارکیٹ میں اُترتے ہیں۔''

''ہاں.....ایک طرح سے ٹھیک بھی ہے۔ لیکن اہم اصطلاحات، معلومات حکمتِ عملی یہ سب بھی تو اہم ہے۔ کوئی بزنس بھی ایسے ہی تو کامیاب نہیں ہو جاتا۔ ہر ایک پہلو کا جائزہ لینا چاہیے۔'' اسفر نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ ''میرے دادا کے دوست میٹرک پاس تھے اور پُرانے وقتوں میں جو بزنس شروع کیا تھا وہ انتہائی کامیاب بنایا۔ بس محبت اور لگن ہونی چاہیے۔''

''بھائی آج کل تو بس دعا ہی لگ جائے کسی کو تو بزنس کامیاب ہے ورنہ تو اچھے اچھوں کا پیسہ ڈوب جاتا ہے۔'' فرقان نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''دعا سے زیادہ دوا پر بھروسہ کرو تو زیادہ کامیاب ہو گے۔''

''ایسا نہیں ہے۔ دعا تب ہی پوری ہوتی ہے جب وہ ہمارے حق میں بہتر ہوتی ہے۔'' فرقان نے وضاحت دی جس کو اسفر نے ہنسی میں اُڑا دیا۔

''تم ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہو؟ اگر طوبیٰ نے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم دعا سے ہی انکاری ہو جاؤ۔''

''طوبیٰ کا ذکر یہاں کہاں سے آ گیا۔ اُس کو پورا حق تھا انکار کرنے کا سو اس نے کر دیا۔ رات گئی بات گئی۔'' اسفر پاؤں پر پاؤں رکھ کر جھلانے لگا۔

فرقان لاجواب سا ہو گیا۔ بغور اسفر کو دیکھتے ہوئے کہا:

''تمہیں پتا ہے تم آہستہ آہستہ بدل رہے ہو۔''

''اچھا واقعی؟'' اسفر نے فرقان کی ہنسی اُڑائی، اور کیا کیا پتہ لگایا ہے تم نے میرے بارے میں۔''

''تم اگر یہ سوچ رہے ہو کہ میری بات ہنسی میں اُڑا کر تمہاری جان چھوٹ جائے گی تو جگر ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔'' فرقان نے ڈھٹائی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

''تو بھائی میں کب تم سے جان چھڑا رہا ہوں۔ تمہیں ہی میں بدلا بدلا نظر آ رہا ہوں حالانکہ ایسا کچھ ہوا نہیں ہے لیکن چلو تم اپنی تسلی کر لو۔'' اسفر نے کھل کر پیشکش کر دی۔

''بتا دے یار! بچپن سے تیرا دوست ہوں۔ تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ کچھ تو گڑبڑ ہے۔''

فرقان اب بھی مصر تھا۔ اسفر نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

''بس عائزہ کی طرف سے تھوڑی پریشانی ہے اس کی طبیعت مستقل خراب ہے۔ اُس کی پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا ہے اور تم تو جانتے ہو وہ اپنے آرکیٹکٹ بننے کے خواب کو لے کر کس قدر حسّاس ہے۔''

فرقان خاموش ہو گیا۔ نہ جانے اُسے کیوں لگ رہا تھا کہ اسفر نے ابھی بھی اصل بات سے اُس کا دھیان ہٹایا ہے۔

''ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ابھی تو بس ٹیسٹ کروائے ہیں، دیکھو کیا رپورٹس آتی ہیں۔'' اسفر نے کھوئے لہجے میں کیا۔

''چلو اللہ بہتر کرے گا۔'' فرقان نے سادگی سے کہا لیکن اِک دم ہی اُس کی نظریں اسفر کی طرف اُٹھ گئیں، وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔ فرقان تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ اسفر کچھ بولے لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔

....۞....

''آپ سے مجھے طوبیٰ کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی۔''رضیہ نے اکبر کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی، کیا ہوا ہماری ہونہار بیٹی کو؟''اکبر فکر مند ہوئے۔

''بہت مصروف تو وہ رہتی ہی ہے لیکن پتا نہیں کیوں آج کل مجھے کھوئی کھوئی سی لگتی ہے۔ رات کو جاگ کر پڑھتی تو پہلے بھی تھی لیکن اب میں اکثر دیکھتی ہوں کتابیں کھلی ہوتی ہیں لیکن وہ دیواروں کو گھورتی ہے۔ایک دومرتبہ تو میں نے آواز دی تو چونک گئی۔''رضیہ نے لمبی چوڑی وضاحت دی۔

''بھئی پڑھائی کی فکر الگ، پھراوپر سے اپنا خرچہ نکالنے کے لیے بھی مستقل کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے ۔تھک جاتی ہوگی۔''اکبر نے بیٹی کی صفائی پیش کی۔

''ہاں وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مجھے واقعی اُس کی طرف سے فکر ہے۔آپ اسے سمجھائیں آپ کی بات مانتی ہے۔مستقبل کی فکر اچھی بات ہے لیکن اتنی ٹینشن لینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں ہمیں دوبارہ سائیکاٹرسٹ کی ضرورت نہ پڑ جائے۔''رضیہ کی تشویش برقرار تھی۔

اکبر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔"ٹھیک ہے میں بات کروں گا طوبیٰ سے۔لیکن تم ماں ہو، کیا پتا اُسے کیا بات پریشان کر رہی ہے۔ہوسکتا ہے وہ تم سے کھل کر بات کر لے۔"

اچانک رضیہ کچھ پر جوش سی ہوئیں:

''ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی آپ کو۔''

''اب اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟ کتنی باتیں جمع کر کے رکھی ہیں آپ نے۔''

اکبر نے ہنستے ہوئے کہا،''دیکھ لیں ایک بات ہے یا کئی باتیں ہیں؟''

"اب آپ سے نہ کروں تو کس سے کروں؟" رضیہ نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

''جی سرکار بالکل کیجئے ہم نے کب منع کیا ہے آپ کو۔آپ کی نہیں سنیں گے تو کس کی سنیں گے۔''

اکبر نے بھی تہیہ کر رکھا تھا آج رضیہ کو غصہ دلانے کا۔

''آج آپ کی بہن کا فون آیا تھا وہ اپنے بڑے بیٹے کے لیے طوبیٰ کا ہاتھ مانگ رہی ہیں۔''

رضیہ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ اکبر کے ماتھے پر بل پڑ گئے:

''میری اتنی قابل بیٹی کے لیے ایک وہی نکما رہ گیا ہے۔ البتہ مانگنا ہی تھا تو اس سے چھوٹے بلال کا مانگتیں، عذرا کو یہ بات کہنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔''

''آپ ہی کی بہن ہیں بھئی۔''

رضیہ کی بات پر اکبر کا غصہ کچھ اور زیادہ ہو گیا۔ لیکن کہتے بھی کیا۔ بس ایک غصیلی نظر اپنی بیگم پر ڈالی اور خاموشی ہی غنیمت جانی۔

''ویسے اتنا بھی نکما نہیں بابر۔'' رضیہ نے ڈرتے ڈرتے کہا،

''ایف اے کا نتیجہ خراب ضرور آیا تھا لیکن بھائی صاحب نے بھی کسی نہ کسی طرح اس کا داخلہ یونیورسٹی میں کرا ہی دیا تھا اور اب تو دیکھیں ڈگری بھی ہے اُس کے پاس۔ ابھی ۳۵ ہزار کی نوکری ہے، آگے کو بڑھ بھی جائے گی۔''

''بی بی صرف ڈگری اور تنخواہ ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ نہ اُسے نماز روزے سے کچھ شغف ہے نہ ہی کوئی اور گن مجھے اس میں نظر آتے ہیں۔ میری بیٹیاں ہیں کوئی بوجھ نہیں ہیں جو میں اُتار پھینکوں۔''

اکبر اپنی بیٹیوں کے معاملہ میں ویسے ہی بڑے حساس تھے۔ اب جو طوبیٰ کی بات آئی تو اُن کے لیے خود کو سنبھالنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

رضیہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''بوجھ تو میں کبھی نہیں سمجھتی اپنی بیٹیوں کو لیکن طوبیٰ کے بعد رمشہ نے بھی قد نکال لیا ہے۔ بس ان کی شادیوں کی فکر ہے مجھے۔''

''بیگم اتنی فکر مت کریں۔'' اب کی دفعہ اکبر بھی رضیہ کی پریشانی سمجھ رہے تھے۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ نہیں کیا آپ کو؟ بیٹیوں کو اسی لیے تو تعلیم دلا رہے ہیں ہم کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔''

رضیہ کی خاموشی دیکھ کر اکبر کو تاسف ہوا کہ خواہ مخواہ ہی اپنی بیگم کے آگے ناراضی ظاہر کی۔

''شادی زندگی کا ایک حصہ ہے، زندگی نہیں۔'' ہمیشہ کی طرح رضیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

...۞...

پہلا اسائمنٹ بہت ہی آسان تھا۔ اُسے ایک سروے کرنا تھا اور ہر فارم کے عوض اُسے ایک مخصوص رقم ادا کی جانی تھی۔ فارم آن لائن تھا تو کوشش کرنے میں کوئی نقصان نظر نہ آیا۔

"تُم نے جو فارم مجھے بھیجا تھا میں نے بھر دیا تھا۔" ثنا نے طوبیٰ کو مطلّع کیا۔

"اچھا، ٹھیک ہے،" طوبیٰ نے کام میں مصروف سرسری سا جواب دیا۔

وہ دونوں ابھی یونیورسٹی پہنچی ہی تھیں۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

" کچھ عجیب سوالات بھی تھے اُس میں، جو کافی ذاتی نوعیت کے تھے۔" ثنا نے تعجب کا اظہار کیا۔ "تم نے کہا تھا کہ کسی سائیکالوجی طالبہ کا اسائمنٹ ہے تو میں نے بھر تو دیا لیکن مجھے کافی سوچنا پڑا۔"

"ہاں" طوبیٰ کچھ گڑبڑا سی گئی۔ "کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔ آج کل جو LGBT کا فتنہ پھیلا ہوا ہے میرے خیال سے اُسی پر کوئی ریسرچ ہے تب ہی اتنی ذاتی نوعیت کا ایک آدھ سوال موجود تھا۔"

طوبیٰ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں ثنا کو حقیقت سے آگاہ نہ کر سکی۔

"پہلے ذرا دیکھ لوں کہ یہ سب سچ بھی ہے یا بس دھوکا ہے، پھر اپنی دوستوں کو اس کے بارے میں بتادوں گی۔" اُس نے دل کو تسلّی دی۔ بات کا رُخ موڑ دینے ہی میں عافیت تھی تو وہ چند مشکل سوالات حل کرنے میں مشغول ہوگئی اور ثنا کی توجہ بھی اُسی طرف مبذول کروالی۔

دو دن بھی نہیں گزرے تھے اور ایک ای میل کے ذریعے اُسے مقرر کردہ ہدف سے زیادہ فارم جمع کرانے کی مد میں نہ صرف پوری رقم بلکہ ۲ ہزار بونس بھی موصول ہوگیا تھا۔ طوبیٰ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بے انتہا خوش بھی تھی۔

"ارے واہ! میری زندگی میں کچھ اتنا آسان بھی ہوسکتا ہے۔" وہ ہمکلامی کے انداز میں کھلکھلائی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی؟" آج تو ہماری بیٹی بڑی خوش نظر آرہی ہے۔" اکبر طوبیٰ کو خوش دیکھ کر مسرور تھے۔ طوبیٰ کم ہی تمام افراد کے ساتھ موجود ہوتی اور ہمیشہ اُس کے سنجیدہ رویے سے سب ہی بخوبی

واقف تھے۔

''کچھ خاص نہیں ابّو! بس یونیورسٹی میں طلبا کے لیے کچھ آسان طریقوں سے معقول رقم کمانے کے بارے میں پتا چلا تھا۔ آزمایا تو سب صحیح نکلا۔ بلکہ آج ہی دو ہزار کا ڈرافٹ بھی موصول ہوا ہے۔ بس اِسی لیے خوش ہوں کہ آن لائن کچھ صحیح کام بھی ہو رہے ہیں اِس ملک میں۔''

اکبر سنجیدہ ہو گئے۔ ''بیٹا! دنیا میں جو بھی چیز آسانی سے ملے، سمجھ جاؤ وہ آزمائش بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھ بھال کر لو، صدیق سے مشورہ کرو اِس بارے میں۔ اُسے اِن سب چیزوں کا پتا ہے۔''

''ارے نہیں ابّو!'' طوبیٰ فوراً ہی محتاط ہو گئی۔ یہ سب مختلف تعلیمی ریسرچ سے منسلک ہے۔ نہ صرف طلبا کی مدد ہو جاتی ہے، بلکہ دوسرے طلبا کو بھی اپنا کوئی سروے یا اسائنمنٹ مکمل کرنے کے لیے آسانی بہم ہو جاتی ہے۔ مجھے تو یہ پلیٹ فارم بہت پسند آیا۔ طلبا ہی vendors ہیں اور طلبا ہی customers۔''

''ٹھیک ہے بیٹا، تمھیں ٹھیک لگتا ہے تو جاری رکھو۔ لیکن صدیق سے ضرور بات کر لینا۔'' اکبر نے ہمیشہ کی طرح طوبیٰ پر بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کیا جو اُس کی اصل طاقت تھا۔

...۞...

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو! ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!''

جیسے ہی رمشہ نے کیک کاٹا، سب نے تالیاں بجا دیں۔ کافی ٹیبل کے آس پاس رضیہ اور اکبر پوری فیملی کے ساتھ تھے، آج رمشہ کی سترہویں سالگرہ تھی۔ رضیہ کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اکبر اپنی بیٹی کی خوشی میں پوری طرح شریک تھے۔

رمشہ نے کیک کا ٹکڑا کاٹ کر اکبر کے منہ میں ڈال دیا۔ رمشہ کا جگمگاتا چہرہ اور چمکتی آنکھیں دیکھ کر ان کا دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ رمشہ کا ماتھا چوما اور ایک چھوٹا سا ڈبّہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ارے واہ! تحفہ بھی ہے!'' رمشہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ جلدی جلدی ڈبے پر چڑھا رنگین کاغذ کھولنے لگی۔

''ارے اپنی امی کو کیک نہیں کھلاؤ گی کیا؟'' اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اوہ ہاں!'' رمشہ شرمندہ ہوئی۔''سوری امی۔'' کیک کا ایک ٹکڑا اس نے رضیہ کی طرف بڑھایا۔

'' دیکھو بھئی میں پہلے ہی سالگرہ کے خلاف ہوں۔ دین میں اس کی کوئی اجازت نہیں اور یہ تحفہ بھی تمہاری سالگرہ کا نہیں بلکہ گیارہویں میں اچھا نتیجہ لانے کا ہے۔ سمجھیں؟'' رضیہ نے پورا لیکچر دے ڈالا۔

''جی بالکل سمجھ گئی۔'' رمشہ نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا اور سب ہی ہنسنے لگے۔ رضیہ کے بعد باری باری سب بھائی بہنوں کو کیک کھلا کر وہ ایک دفعہ پھر تحفے کی طرف جھپٹی۔

خوشی کے مارے اس کا چہرہ کھل اٹھا جب رنگین کاغذ کے نیچے سے ایک موبائل کا ڈبہ برآمد ہوا۔

''موبائل فون!'' وہ پوری قوت سے چلّائی۔

آناً فاناً ڈبہ کھول کر موبائل نکالا۔ وہ ایک سیکنڈ ہینڈ فون تھا جو صدیق نے اپنے کسی دوست سے خریدا تھا۔ کنڈیشن بھی اچھی تھی اور سب سے بڑھ کر آدھی قیمت میں مل گیا تھا۔ طوبیٰ رمشہ کی دیوانگی دیکھ کر مسکرا دی تو وہیں صدیق نے بھی سکون کا سانس لیا۔

موبائل فون تو اب ہر فرد کی ضرورت بن گیا تھا۔ رمشہ کالج جاتی تھی اور جب تک گھر واپس نہ آجاتی رضیہ فکرمند ہی رہتی تھیں۔ اب کم از کم وہ رابطے میں رہتی۔

ناخوش تھی تو بس حُسنہ جو ایک کونے میں منہ سجائے بیٹھی تھی۔

''مجھے کب ملے گا موبائل؟'' اس نے اِٹھلاتے ہوئے کہا اور اپنے ابو کے گلے میں جھول گئی۔

''جب آپ بھی کالج جاؤ گی تو ضرور ملے گا۔'' اکبر نے اس کے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسا۔

اب تنگ کرنے کی باری اصغر کی تھی۔''نہیں ابو! اسے اس کی شادی کے بعد موبائل دلانا چاہیے۔''

''کیوں بھئی؟'' حُسنہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کیونکہ تم کچھ بھی سنبھال کر نہیں رکھتی ہو۔ امی برتن اٹھانے کا کہتی ہیں تو تم آدھے برتن توڑ دیتی۔ استری کرنے کو بولو کپڑے تو جلا دیتی ہو اور تو اور صفائی کرنے کا بولو تو سو جاتی ہو۔ اب تمہیں موبائل

اسی وقت ملے گا جب تم سمجھدار ہو جاؤ گی اور تمہاری شادی ہو جائے گی۔" اصغر نے ایک نیا ہی نقشہ سب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''جی نہیں، میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں بھی طوبیٰ آپی کی طرح پہلے خوب پڑھائی کروں گی، کیریئر بناؤں گی، کسی قابل بنوں گی پھر سوچوں گی آگے کیا کرنا ہے۔''

طوبیٰ حیرت زدہ حسنہ کو دیکھتی رہ گئی۔"تو اتنی اہم ہوں میں گھر میں" اس نے حیرت سے سوچا۔

سب حسنہ کی بات پر ہنس دیئے لیکن رضیہ نے سب کو ایک ڈانٹ لگا کر خاموش کرا دیا۔''جب کالج جاؤ گی تو موبائل وغیرہ سب مل جائے گا یہ صرف ایک کھلونا نہیں بلکہ ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ اچھے برے کی تمیز سیکھ جاؤ سو سب مل جائے گا اس سے پہلے کچھ نہیں۔''

حسنہ نے اپنے ابو کی طرف دیکھا کہ شاید وہاں ہی سے کوئی سفارش ہو جائے لیکن انہوں نے بھی کندھے اُچکا کر اپنے مجبور ہونے کا عندیہ دیا۔

''بھئی گھر کی سلطنت تو آپ کی امی کے ہاتھ میں ہے۔ جو چاہے فیصلہ کریں۔'' اور اس کے ساتھ ہی سالگرہ کی یہ چھوٹی سی محفل برخاست ہوگئی

...۞...

''ہیلو''

''جی کون؟''

''آپ کون؟'' سوال پر سوال۔

''فون آپ نے کیا ہے۔ آپ کو نہیں پتہ کس نمبر پر کال ملائی ہے آپ نے؟''

''یہ نمبر علی کا نہیں ہے؟''

''جی نہیں رانگ نمبر!'' یہ کہہ کر رمشہ نے فون رکھ دیا۔

ایک گھنٹے بعد اسی نمبر سے ایک میسج اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

''یہ نمبر تو علی کے پاس تھا۔ آپ کے پاس کیسے آیا؟''

''جناب اب یہ نمبر میرا ہے اور میں کسی علی کو نہیں جانتی۔''

''میرا نام ریان ہے۔آپ برا نہ مانیں تو اپنا نام بتائیں گی؟''

کافی دیر رمشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔اسکرین ایک مرتبہ پھر جگمگا اُٹھی۔

''میں آپ مجبور نہیں کروں گا۔اگر آپ نہیں بتانا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔لیکن مجھے یقین ہے آپ کا نام بھی آپ کی آواز اور آپ کی شخصیت کی طرح خوبصورت اور پاکیزہ ہوگا۔

رمشہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔جو بھی تھا اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔

رمشہ نے آخر کار اس نے اس انجان بے تاب پر رحم کھا ہی لیا۔

''بے چارہ''اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

...۞...

ڈائننگ ٹیبل پر عباس کی پوری فیملی موجود تھی۔ آج مہینے کا دوسرا اتوار تھا اور دوپہر میں ہر ہفتے بریانی بنانے اور اہتمام سے کھانے کی روایت پر بخوبی عمل کیا جارہا تھا۔ سب اس وقت خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ عافیہ نے میکے آکر اپنے تین سالہ بیٹے کے ساتھ خوب رونق لگا رکھی تھی۔ تین سالہ عثمان بہت باتونی تھا اور بریانی اس کی پسندیدہ تھی۔ عافیہ چھوٹے چھوٹے نوالے اس کے منہ میں ڈال رہی تھی اور وہ پورے انہماک سے بریانی کھانے میں مصروف تھا۔

''عثمان، بریانی کیسی بنی ہے؟'' عائزہ نے پیار سے پوچھا۔

''اچھی'' مصروفیت کے دوران جواب آیا۔

''بس اچھی؟'' عائزہ اسے تنگ کرنے پر مصر تھی۔

''ہاں'' سر ہلا کر جواب دیا گیا۔

سب کی توجہ کا مرکز اس وقت عثمان ہی تھا۔

''اچھا تو یہ بریانی کس نے بنائی ہے؟''

''اللہ تعالی نے بنائی ہے۔''

اُس کے جواب پر سب ہی کا قہقہہ بلند ہوا۔

''لیکن یہ بریانی تو آپ کی نانو نے بنائی ہے''

''نہیں'' پرزور مذمت کی گئی۔ ''ماما کہتی ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ بریانی بھی اللہ نے بنائی ہے۔''

سب ہی عثمان کی معصوم باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے سوائے اسفر کے۔ وہ خاموشی سے سب کی گفتگو سن رہا تھا اور عثمان کی بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

عافیہ کی آواز آئی، "صحیح ہے نا! شروع ہی سے بچوں کے دماغ میں دینی باتیں ڈال دینی چاہئیں تاکہ

بڑے ہوں عقائد پختہ ہوں اور کوئی چاہ کر بھی ان کا ایمان متزلزل نہ کر سکے۔''

''حالانکہ یہ غلط ہے۔'' اسفر کی بات پر سب ہی چونک گئے۔''ایک عقیدہ ہم ننھے سے دماغ میں ٹھونس دیں۔اس سے بہتر یہ نہیں کہ وہ خود بڑا ہو کر صحیح اور غلط کا فیصلہ کرے اور جو صحیح ہو اس کو چنے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹا!'' عائشہ درشت لہجے میں بول پڑیں۔''بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔اگر ہم انہیں صحیح بات نہیں بتائیں گے تو وہ زمانے سے غلط باتیں سیکھ لیں گے۔اس لیے بہتر ہے ہم انہیں صحیح عقائد بچپن ہی سے حفظ کروا دیں۔''

اسفر نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔خوشگوار ماحول تھوڑی دیر کے لیے گھمبیر ہو گیا تھا لیکن پھر کچھ دیر میں سب اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ویسے بابا ایک بات نوٹ کی آپ نے؟ اسفر دن بدن سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے۔خیریت تو ہے نا بھائی؟'' عافیہ نے شرارت سے کہا۔

''ہاں تو کیا ہمیشہ بچہ ہی رہوں گا؟ بڑا نہیں ہوں گا؟'' اسفر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

عائشہ مسکرانے لگیں:''ہاں بھئی، میرا بیٹا بڑا ہو گیا ہے ماشاءاللہ!''

''نہیں امی مجھے تو کوئی اور ہی معاملہ لگ رہا ہے۔'' عائزہ نے بھی لقمہ دیا۔

اسفر نے عائزہ کو گھورا۔

''کیوں بیٹا اسفر! کوئی بات ہے تو بتاؤ۔''

''ابّو آپ بھی ان دونوں کی چڑیلوں کی باتوں میں آ رہے ہیں۔خواہ مخواہ ہی میرے پیچھے پڑی ہیں۔ اب ہر وقت کیا بندہ چھیڑ چھاڑ ہی کرتا رہے گا؟''

''ابّو دیکھ لیں ہمیں چڑیل کہہ رہا ہے۔پھر میں کچھ بولوں تو آپ منع نہ کیجیے گا۔''

اسفر نے عبّاس کی طرف کی گئی شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

''ہاں تو حرکتیں ہی تمہاری آگ لگانے والی ہیں تو چڑیل ہی کہوں گا نا!''

''اسفر!'' عباس کی تنبیہی پکار پر اسفر مسکراتا ہوا خاموش ہو گیا اور عائزہ بھی اسفر کو زبان چڑا کر کھانا

کھانے میں مصروف ہوگئی۔

ان بہن بھائیوں کے درمیان یہ نوک جھونک یونہی جاری رہتی تھی۔ اسفر نے میز پر سے اٹھتے ہوئے عائزہ کی چٹیا کھینچی۔

''آہ!'' عائزہ نے ایک سسکی لی اور ساتھ ہی ایک مکّا اسفر کی کمر میں دے مارا جسے وہ با آسانی اچھل کر دغا دے گیا۔

''ابّو دیکھیں اِسے۔'' عائزہ نے مدد کے لیے عبّاس کو پکارا۔'' اسے سمجھا دیں بالوں کا مذاق نہ کیا کرے۔'' عائزہ کو اپنے بال جان سے پیارے تھے۔ کمر سے نیچے جاتے بال بہت محنت اور دیکھ بھال کے بعد بڑھائے گئے تھے۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ عائزہ سیلف گرومنگ پر بھی بہت زیادہ دھیان دیتی تھی۔ ہونہار ہونے کے باعث وہ ویسے ہی سب کی لاڈلی تھی اور پھر نفاست پسندی نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔

...۞...

یہ سب کچھ اسفر کے پالتو بلے کی موت سے شروع ہوا تھا۔ صرف سات سال کی عمر میں وہ موت کی اٹل حقیقت سے آشنا ہوا تھا۔ بات کافی سنگین تھی اور سوال تھا بلو کے جنت اور دوزخ میں جانے کا۔ گو کہ عائشہ نے اسفر کو وقتی طور پر بہلانے کے لیے ہامی بھر لی تھی کہ بلو جنت میں ملے گا لیکن بچوں کی ذہانت کو بڑوں کو مات دینا آسان نہیں۔ یہ بات ایک گرہ کی طرح اسفر کے لاشعور میں چلی گئی تھی کہ بلو کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ اس نے ساری زندگی کوئی گناہ نہیں کیا لیکن وہ پھر بھی جنت میں نہ جائے گا۔

عائشہ نے باتوں ہی باتوں میں اسفر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جانور قیامت کے دن دوبارہ پیدا نہیں کیے جائیں گے لیکن ننھا اسفر کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ جو گہرا صدمہ اس کو لگا تھا اُسے شاید وقت کا دھارا ہی سنبھال سکتا تھا۔

''ہم بھی جانور ہی ہوتے تو اچھا تھا، نہ دوزخ کا ڈر ہوتا نہ جنت کی تمنا۔''

ایک دن باتوں ہی باتوں میں اسفر نے عباس کے آگے یہ کہہ دیا۔

''تو تم اللہ کے بنانے پر اعتراض کرو گے؟ جیسے وہ انگریز اپنے آپ کو ماننے سے انکاری ہیں تم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلو گے؟'' عباس کا غصہ سوا تھا۔

اسفر ایک دم کھسیا گیا ''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔''

''تو پھر اور کیا مطلب نکلتا ہے اس بات کا؟'' عباس کے عتاب سے بچنا اب اسفر کو ناممکن نظر آ رہا تھا۔ ''اپنے انسان ہونے پر غالباً آپ زیادہ خوش نہیں ہیں، آپ کو ان فرنگیوں کی طرح کتّا بلی بننے میں زیادہ دلچسپی ہے۔'' عباس ایک دفعہ پھر پھنکارے۔ ''آپ کے لیے بہتر ہوگا دین داروں کی محفل میں اٹھا بیٹھا کریں تاکہ یہ فضول قسم کے خیالات آپ کے دماغ میں نہ آئیں۔"

اسفر سر جھکائے بیٹھا رہا اور اس وقت کو کوستا رہا جب اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے لیکن ایک آگ تھی اس کے اندر اور بے سکونی بھی جس کو وہ کوئی معنی پہنانے سے قاصر تھا۔

''کیا واقعی انسان دوزخ یا جنت میں جائیں گے۔'' بجلی کی طرح یہ سوال اس کے دماغ میں کوندا اور

اگلے ہی پل وہ استغفار کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس نے اپنے موبائل فون میں قرآن کی تلاوت لگالی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کو وحشت ہونے لگی۔ حالانکہ قاری کی خوبصورت آواز دل میں اتر جانے والی تھی لیکن اس کے دل کے تاروں کو وہ آواز متاثر کرنے کے بجائے گھٹن میں مبتلا کر رہی تھی۔

بچپن سے بلا ناغہ وہ قرآن کی تلاوت کرتا رہا تھا۔ روز دو گھنٹے، مدرسے میں دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بھی زور وشور سے ایک ایسی زبان پڑھتا تھا جو اس کو بالکل سمجھ نہ آتی تھی لیکن کیونکہ اس کے پڑھنے سے اسے جنت میں جانے کا ٹکٹ مل جانا تھا تو وہ خوب دل لگا کر پڑھتا تھا۔ اس کا شمار بہترین قاریوں میں ہوتا تھا۔ قاری صاحب کا کہنا تھا اس کی آواز میں ایک سوز تھا۔

وہ گھنٹوں تلاوت لگا کر سنا کرتا اور تلاوت کی مشق کیا کرتا، لیکن آج وہ خوبصورت تلاوت جو وہ نہ جانے کب سے سنتا آ رہا تھا اسے گھٹن میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے اپنی شرٹ کے بٹن اور کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ دور افق پر سورج غروب ہونے کو تھا۔

''کیا ہوتا اگر میں مسلمان نہ پیدا ہوتا؟'' ایک بار پھر دل باغی ہو رہا تھا اور وہ اپنی سوچوں کے دھاروں میں بہتا جا رہا تھا۔

''شاید عیسائی ہوتا یا ہندو..... میرے ماں باپ مجھے بتاتے کہ خدا یسوع مسیح ہے یا پھر بھگوان۔ خدا تو تب بھی ہوتا۔ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میرا ہی خدا سچا ہے؟''

اب کی بار اس کی زبان سے لاحول نہ نکلا۔ وہ بس آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتا رہا جو شور مچاتے ہوئے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

''امی کے مطابق پرندے رب کی حمد وثناء کرتے ہیں، تو انھیں کیسے اپنے رب کا معلوم ہوا؟''

اُسے چڑیا کا وہ بچہ یاد آ گیا جو اڑنا سیکھ رہا تھا اور چڑا اور چڑیا اس کے آس پاس چوں چوں کرتے ہلکان ہو رہے تھے۔ کیا واقعی وہ اپنی اولاد کو یہ بتا رہے ہوں گے کہ اللہ کی عبادت کرو گے تو جنت میں جاؤ گے۔

اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا اور وہ بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔

...۞...

وکی سے اسفر کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ اصل نام تو اس کا وقار تھا لیکن سب اس کو وکی بلاتے تھے۔ وہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کا طالب علم تھا اور چونکہ اسفر نے کیمسٹری اور میتھ اپنے اختیاری مضامین منتخب کیے تھے اس لئے اکثر ہی وکی اور اس کے دوستوں پر نظر پڑتی تھی۔ ویسے تو بہت سے طلباء ہی وکی کی طرح گروپس کی صورت میں اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹس میں ہلّا مچائے ہوئے تھے لیکن وکی اور اس کے مزید چار دوست ان سب میں نمایاں تھے۔

وہ نہ صرف پڑھائی میں بہترین تھے بلکہ تمام غیر نصابی سرگرمیوں کو ترتیب دینے والے بھی وہی ہوتے تھے۔ اس دن بھی وہ لوگ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ''ایک دن کی بادشاہت'' کے عنوان سے کچھ مزاحیہ پروگرام ترتیب دے رہے تھے جب اسفر کی وکی سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔

''تم فزکس ڈیپارٹمنٹ سے ہونا!'' بڑی ہی بے تکلفی سے اس نے اسفر کو مخاطب کیا۔

اسفر حیرت سے سر اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔

''چلو آجاؤ یار پھر تم تو کام کے بندے ہو۔'' اس نے اسفر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اسفر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک روبوٹ کی مانند اس کے ساتھ چل پڑا۔

وکی ایک ہنس مکھ لڑکا تھا، اس کی بات جگر اور جان سے شروع ہوتی اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ چاہے کسی سے پہلی بار ہی کیوں نہ مل رہا ہو اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے بیٹھا ہوتا۔ لائبریری میں سمیسٹر کی شروعات میں ہی وکی اور اس کے دوستوں کا داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ وجہ تھی تین دفعہ لائبریری میں نظم وضبط خراب کرنا۔

''ارے یار دنیا میں موج کرنے آئے ہیں، کھل کے موج کریں گے۔ کسی کی کیا مجال کہ ہماری چھوٹی سی زندگی کو نظم وضبط کا پابند بنائے۔'' وہ اکثر ہی اس قسم کی باتیں کرتا تھا جو اسفر کو انتہائی بے ہودہ لگنے کے باوجود دماغ کے خلیوں کو دستک دیتی محسوس ہوتی تھیں۔

وکی کے چاروں دوست خرم، فراز، عیسیٰ اور احمد بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

وکی نے اسفر کو ایک دن کی بادشاہت کے ڈرامے میں ایک مشیر بننے کی دعوت دی تھی۔ دعوت دی یا حکم اسفر کو سوچنے سمجھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ صرف پہلا اور آخری کردار نہ تھا، یکے بعد دیگرے اسفر وکی کے کسی نہ کسی پروگرام میں شامل ہوتا رہا تھا۔ کیمسٹری کے قوانین سے لے کر میتھ کے فارمولوں

تک اس کی قابلیت قابلِ دید تھی۔

...۞...

''السلام علیکم'' اسفر اپنی تمام کلاسوں سے فارغ ہونے کے بعد گھر کی طرف روانہ ہو رہا تھا جب اچانک وکی سامنے سے آتا نظر آیا۔

''اسفر!!!'' ایسا پرتپاک استقبال ہوا گویا برسوں بعد اسفر امریکہ سے لوٹا ہے۔''کیا حال ہیں لالے۔ کدھر غائب ہے آج کل؟''

وکی سیدھا گلے لگ گیا تھا، وہ بھی ایسے کے اسفر کو لگا اس کی پسلیاں آج کے بعد دوسرا دن نہیں دیکھیں گی۔

''یار ابھی دو دن پہلے تو ملاقات ہوئی تھی۔'' اسفر نے اس کو یاد دلایا۔

''واقعی؟'' وکی نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔اسفر جانتا تھا یہ صرف اداکاری ہے ورنہ وکی جیسا ذہین لڑکا پورے ڈیپارٹمنٹ میں تو کیا یونیورسٹی میں بھی نہیں ہوگا۔

''اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟ فارغ ہی ہو ابھی تک؟'' اس نے اسفر کی پیٹھ پر ایک دھموکا جڑا۔

''بس سر نے ایک ریسرچ پراجیکٹ دیا ہے۔اس پر کام کر رہا ہوں۔اللہ کرے اچھا تیار ہو جائے تو جی پی اچھی بن جائے گی۔''

وکی نے ایک قہقہہ مارا

''اللہ نے ہی سارا کام کرنا ہے تو تجھے یہاں کیوں بھیجا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' اسفر نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔وکی بولا

''تم ہی نے تو کہا اللہ کرے۔ارے بھائی اللہ کیوں کرے تو خود کیوں نہ کرے؟''

اسفر ایک دم گڑبڑا گیا۔''ہاں ہاں کروں گا تو میں ہی لیکن وہ تو بس ایسے ہی زبان سے پھسل گیا۔''

''یار دیکھو۔اپنا تو ایک ہی اصول ہے۔جو ہے وہ بولو، جو نہیں نہ بولو۔'' اسفر نے نا سمجھی کہ عالم میں چلتے چلتے رُک کر اس کو دیکھا۔وکی نے ہنستے ہوئے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا۔

''ارے یار!'' وکی نے گہرا سانس لیا اور ادھر اُدھر دیکھا۔''یار بڑا ہی ڈرتا ہوں میں یہ اپنے

ڈیپارٹمنٹ کے مولویوں سے۔'' اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مذہبی جماعت کے اسٹوڈنٹ ونگ کے لڑکوں کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ ''یہ جو مذہبی پولیس گھومتی ہے نا آس پاس، کچھ پتہ نہیں ہوتا ان کا۔ کبھی بھی حملہ کر دیتے ہیں۔''

اسفر ابھی بھی چکرا رہا تھا۔ ''وہ کیوں حملہ کرنے لگے ہم پر؟''

وکی نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا

''اسفر کیا بات کر دی تو نے؟ ہم کہ ٹھہرے فلسفی۔ اور یہ دینی پولیس تو فلسفیوں کی پکی دشمن ہے۔ تو نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی فلسفی نے کسی مولوی کو مارا ہو لیکن یار ان مولویوں نے بڑے فلسفی مارے ہیں۔'' سرگوشی کرنے کے بعد وکی ایک بار پھر فلک شگاف قہقہے لگا رہا تھا۔ جبکہ اسفر اس کی گول گول باتوں سے گھن چکر بن گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر وکی کو آخر رحم آ گیا تو وہ گویا ہوا۔

''دیکھو! ابھی تم نے کہا اللہ کا نام تمہاری زبان سے پھسل گیا، لیکن کام تمہیں ہی کرنا ہے۔ تو جو کام خود کر رہے ہو اس کا کریڈٹ کسی اور کو کیوں دے رہے ہو؟''

وکی کی بات سن کر اسفر سناٹے میں آ گیا اور اس کے بڑھتے قدم ایک دم ہی رُک گئے۔

وکی اس سے دو قدم آگے نکل گیا۔

''کیا ہوا؟'' جب وکی کو احساس ہوا کہ اسفر ایک ہی جگہ کھڑا رہ گیا ہے تو اس نے مڑ کر پوچھا۔

''تم نے بہت عجیب بات کہی۔ تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' اسفر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وکی نے ایک گہرا سانس لیا اور دو قدم واپس آ کر ایک بار پھر اسفر کے گلے میں اپنا بازو ڈال کر بولا، ''دیکھو اسفر اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس سے کبھی یہ بات نہ کہتا۔ لیکن تم کو میں دیکھتا ہوں ہر جگہ لاجک سے بات کرتے ہو، اوٹ پٹانگ کہانیوں پر یقین نہیں رکھتے ہو، حق بات کرتے ہو، اسی لیے مجھے لگا کہ تم ایک حقیقت پرست انسان ہو۔'' اسفر ایک بار پھر وکی کے ساتھ اپنے قدم اٹھا چکا تھا۔

''میں حقیقت پسند ہوں لیکن مسلمان بھی ہوں۔ ظاہر ہے اللہ کے حکم سے ہی میں یہ کام کر رہا ہوں۔'' اسفر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لہجے کی لڑکھڑاہٹ یہ بتا رہی ہے کہ تمہیں خود بھی نہیں پتہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک رٹا رٹایا

جملہ ہے جو تمہاری زبان سے ابھی ادا ہوا ہے۔فرض کرو اگر میں ابھی کسی شخص کو قتل کر دوں تو کیا تم یہی کہو گے کہ اللہ کے حکم سے قتل کر دیا؟''

اب کی بار اسفر سچ مچ گڑبڑا گیا۔

''تم جیسے جینئیس بندے کے منہ سے اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔'' وکی نے چلتے چلتے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری۔''حقیقت پسند بنو میرے دوست۔ لا جک از ایوری تھنگ۔''

وکی تو یہ کہہ کر ہاتھ ہلاتا ہوا اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا جبکہ اسفر ابھی تک میکانی انداز میں قدم اٹھاتا چلتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کو کراس کرتا آگے ہی نکل جاتا ہے اگر سامنے سے آتے معاذ نے اس کو آواز نہ لگائی ہوتی۔

''سر طارق کی کلاس نہیں لو گے آج؟''معیز نے رکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں؟؟ آں.....'' اسفر ابھی تک اپنے حواسوں میں نہ تھا۔ جو خیالات اکثر اس کے دل و دماغ میں آتے تھے وہ اکثر ان کو شیطانی وسوسے سمجھ کر اپنے دماغ سے جھٹک دیا کرتا تھا۔آج کسی اور کے منہ سے سننا اُسے حیران ہی نہیں، پریشان بھی کر گیا تھا۔

''کیا ہوا بھائی، کن خیالوں میں گم ہو؟'' معاذ نے چٹکی بجائی۔

''ہاں سر طارق ہی کی کلاس لینے جا رہا ہوں۔'' اسفر نے جلدی سے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پایا۔

''تو بھائی ان کے کی کلاس ڈیپارٹمنٹ کے اندر ہے، باہر نہیں۔'' معاذ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔''خیریت نہیں لگ رہی اسفر بھائی، آج بڑے کھوئے کھوئے سے ہو؟''

اسفر نے تمام سوچوں سے سر جھٹک کر جان چھڑائی

''ارے نہیں بس کچھ سوچتے سوچتے آگے نکل گیا۔'' دونوں باتیں کرتے کرتے سر طارق کی کلاس لینے کے لیے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ یہ پہلا قدم تھا یا نہیں اس بات کا تو اسفر کو اندازہ نہیں تھا لیکن ہر چیز کو حقیقت پسندی سے دیکھنا اب ایک عادت ہی نہیں بلکہ فیصلہ بن چکا تھا۔

اپنے کئے کی سزا شیطان کے سر ڈالنا یا اچھے کام کی توفیق کا صلہ کسی اور کو دینا، یہ دونوں باتیں عجیب ہونے کا پہلے اُسے شائبہ تھا لیکن اب وہ یقین کا سفر جلد از جلد طے کر لینا چاہتا تھا۔ اور پھر وہ صرف

پہلی اور آخری گفتگو نہیں تھی جو اس موضوع پر وکی سے ہوئی ہو، اکثر ہی وہ دونوں ہلکے پھلکے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے لگے تھے۔ چاہے وہ بگ بینگ تھیوری ہو یا انسان کا بندر سے موجودہ شکل میں آنا۔ وکی بلا شبہ ایک ذہین اور چرب زبان لڑکا تھا۔ اپنے مخالف کو باتوں سے چپ کرانا اور موقع محل دیکھ کر دلائل کا استعمال کرنا تو کوئی اس سے سیکھتا۔

اسفر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ اس کا دماغ اور خیالات الجھنوں کی آماجگاہ تھا اور وکی وہ واحد شخص تھا جو نہ صرف اس کی ہر بات کو تحمل سے سنتا تھا بلکہ اس کے ہر اعتراض کا جواب لاجک سے دیتا تھا۔

وہ سوالات جن کو بچپن میں اس نے بارہا اپنے اساتذہ، قاری صاحب یا عباس سے کیے تھے جن کے جواب میں یا تو اسے اللہ کا خوف دلایا گیا تھا یا پھر جھڑکیاں، وکی کی طرف سے ان سوالوں کے جواب کسی حد تک اس کو مطمئن کرنے لگے تھے۔

''جو بھی چیز اس دنیا میں موجود ہے اس کا کوئی محرک ہے۔ پودا بیج سے نکلا ہے، بارش بادلوں سے برستی ہے، حرارت آگ سے ملتی ہے اور روشنی سورج سے اور اگر اس سائیکل میں پیچھے چلتے جائیں تو پتا چلتا ہے کہ ہر چیز کہیں نہ کہیں سے ضرور شروع ہوتی ہے۔ نقطۂ آغاز بہت اہم ہے اسی بنیاد پر ہمارے یقین کی عمارت کھڑی ہے اور اگر بنیاد ہی مبہم ہو تو عمارت کیسے مضبوط ہو سکتی ہے؟''

اسفر بغور وکی کی باتیں سن رہا تھا۔ خرم اور عیسیٰ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے جبکہ اسفر خاموشی سے آلو کے کرارے چپس کا ایک ایک ٹکڑا دھیرے دھیرے اپنے منہ میں ڈال رہا تھا۔ اس کی نظریں ہری ہری گھاس کے بیچ موجود کچھ پیلی اور سوکھی گھاس پر رینگتی چونٹیوں پر جمی تھی۔ وہ چیونٹیاں بڑی جانفشانی سے اپنے کام میں مگن تھیں۔ کسی جلدی میں وہ ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں۔ اسفر کو اپنا آپ بھی انہی چیونٹیوں جیسا لگا۔

بے مقصد ادھر سے ادھر بھاگنا، کبھی کسی سے ٹکرا جانا، پھر واپس نقطۂ آغاز پر آجانا اور پھر بھاگنا۔ اور اس دوڑ کا کوئی حاصل حصول نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے اچانک ہی طوبیٰ کی بہت شدت سے یاد آئی۔ کتنی ہی دعائیں مانگی تھیں۔ اُس نے طوبیٰ سے آخری دفعہ بات کرنے سے پہلے لیکن وہ کہیں

نہیں تھی اب اس کی زندگی میں البتہ اس کو چھونے کی خواہش اور اُس کے قرب کی خواہش ابھی تک اس کے دل میں ایک ایسی چنگاری کی مانند موجود تھی کہ جب بھی ہلکی سی ہوا لگے اور وہ بھڑک اٹھے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور واپس اپنے گرد و پیش سے باخبر ہونے کی کوشش کی۔ پیکٹ کے چپس ختم ہو چکے تھے اور وکی کی تقریر بھی۔

اب وہ سب کھڑے ہو کر اپنی اپنی جینز پر لگ جانے والی سوکھی گھاس کو جھاڑ رہے تھے۔ اسفر نے اپنے آپ کو بھی ایسا ہی کرتا پایا۔ ایسا اب اکثر ہی ہوتا تھا۔ اس کی روح اور اس کا جسم الگ الگ دنیاؤں کے مسافر بن جاتے اور پھر یک دم ایسے آ ملتے جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ اسفر اپنے اس خلفشار کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اُسے اپنی اِس حالت کی ذمہ دار طوبیٰ ہی نظر آتی۔

''نہ جانے وہ اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ کہاں ہوگی؟ شاید وہ بھی کسی یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھی ہوگی۔ اتنی ذہین جو تھی وہ۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسفر اس کی یادوں سے جان چھڑانے سے قاصر تھا۔

....۞....

حسبِ معمول طوبیٰ لائبریری میں موجود تھی۔ یکے بعد دیگرے طوبیٰ کو مختلف آن لائن کام موصول ہوئے تھے جس میں سے ایک شخصی آزادی، دقیانوسی نظام، اپنے لئے آواز اُٹھانا اور حقوقِ نسواں پر آواز اُٹھانے کے لیے نہ صرف مخصوص ہدایات کے ساتھ مضامین تحریر کرنے تھے بلکہ مختلف اخبارات و رسائل میں اُن کو شائع کروانا بھی ہدف میں شامل تھا۔

کچھ نکات پر بعض اوقات طوبیٰ کو اعتراض بھی ہوتا لیکن ترمیم شدہ مضمون ہی شائع کروانا لازمی تھا۔ ہر ہدف وہ با آسانی پورا کر رہی تھی اور تین ماہ سے لگا تار موصول ہونے والے منی ڈرافٹ مسلسل اُس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ لیکن تازہ آئی ہوئی ای میل کو آج طوبیٰ یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

ہدف مکمل ہونے کی آخری تاریخ کے ساتھ ترمیم شدہ تازہ اُس کا اپنا لکھا ہوا مضمون بھی تھا جو ہلکی سی الفاظ کی ہیر پھیر کے بعد اب اُس کو اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ ہم جنس پرستی کے خلاف لکھا گیا مضمون اب صرف ایک معلوماتی تحریر لگ رہی تھی۔

"میں یہ مضمون نہیں شائع کروا سکتی!" اُس نے حتمی انداز میں ہمکلامی کی اور کمپیوٹر لاگ آف کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اگلا دن اتوار کا تھا اور تمام گھر کے کاموں سے فراغت کے بعد اب اُس کی پڑھائی کا وقت تھا۔

"طوبیٰ! تمہارے ابّو بُلا رہے ہیں۔" باورچی خانے کی جانب جاتے ہوئے رضیہ نے طوبیٰ کے کمرے میں جھانک کر مطلع کیا۔

"جی ابّو! آپ نے بلایا؟" طوبیٰ لاؤنج میں بیٹھے اکبر کو کچھ پژمردہ سا دیکھ کر پریشان ہوئی۔

"ہاں بیٹا!" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ کب ہے؟"

اکبر نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "پندرہ ہزار کم ہیں اس میں۔" ایک عجیب سی شرمندگی تھی اُن کے لہجے میں جس نے طوبیٰ کو اندر تک زخمی کر دیا۔

کوئی بات نہیں ابّو، میں کچھ کر لوں گی۔" طوبیٰ نے لفافہ تھام لیا۔

"اے میرے اللہ، مجھے اس قابل بنائیں کہ میرا یہ ہاتھ ہمیشہ دینے والا ہو لینے والا نہیں۔" دل سے صدا نکلی تھی۔ پورے پندرہ نہ سہی لیکن اتنی رقم اُس کے پاس موجود تھی کہ وہ کنول یا ثنا سے اُدھار لے کر باآسانی فیس جمع کرا دیتی لیکن ٹھیک دو دن بعد ہی جو کچھ ہوا وہ اُس کے پیروں تلے زمین سرکانے کیلئے کافی تھا۔

ایک بار پھر وہ یک ٹک کمپیوٹر اسکرین کو تک رہی تھی۔ آن لائن دیئے گئے ہدف کو مکمل نہ کرنے کی صورت میں نہ صرف اُس کی ساکھ متاثر ہوئی تھی، بلکہ کمائی گئی رقم میں سے پچاس فیصد اُس کو واپس ادا کرنے تھے۔

"اوہ خدا!" طوبیٰ خالی ہاتھ اپنی گود میں دھرے بس اسٹاپ پر بیٹھی تھی۔ دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ راضی نامہ جو ہر آن لائن ایپلیکیشن استعمال کرتے وقت وہ ہر بار آنکھیں بند کر کے منظور کرلیا کرتی تھی آج اُس کے لیے وبال جان بن چکا تھا۔ تازہ موصول ہوئی ای۔میل میں نہ صرف راضی نامہ کی کاپی بلکہ شِق پر عمل نہ کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی دھمکی بھی موجود تھی۔

"طوبیٰ اکبر، تُم نے کیسے سوچ لیا تھا کہ اتنی آسانی سے تُم موجودہ مسائل سے دامن چھڑا لوگی؟"

دل و دماغ آج پھر باغی تھے۔ پچھلے تین مہینوں میں وہ ہر اتوار مختلف اہداف پورے کرنے میں مصروف رہی تھی اور آج اِس ریاضت کا یہ پھل ملا تھا۔

اکبر کے کہنے کے باوجود وہ صدیق سے بات نہیں کر پائی تھی۔ شاید اُس کے اپنے دل میں بھی یہ خدشہ تھا کہ اگر صدیق نے منع کر دیا تو اکبر اور رضیہ کبھی اُس کو اِس اسامی سے فائدہ نہ اُٹھانے دیتے۔ لیکن آج وہ اپنی بے پرواہی پر بے تحاشہ پچھتا رہی تھی۔

"اُف، یہ میں نے کیا کر دیا؟" اِس ایک سوچ کے علاوہ اُس کے دماغ میں اور کوئی سوچ نہ تھی۔ حساب کتاب کرنے کے بعد اُسے قریباً بیس ہزار روپے لوٹانے تھے اور ابھی جو وہ صرف چند ہزار اُدھار لے کر خوشی خوشی اپنی فیس جمع کروا کر مطمئین ہونے والی تھی، ہراساں بس اسٹاپ پر بیٹھی تھی۔

سامنے ٹریفک رواں دواں تھا، زندگی کہاں کسی کے ساتھ تھمتی ہے۔ یہ تو بس انسان ہی ہے جس کو رک جانا پڑتا ہے۔ تنہا۔

...۞...

''السلام علیکم'' اسکرین پر رومن اردو میں ایک پیغام جگمگایا۔

رمشہ نے مسکراتے ہوئے ان باکس کھولا۔ گو کہ یہ ایک انجانا نمبر تھا لیکن رمشہ کو پوری طرح حفظ تھا۔ وہ آنکھ بند کر کے بھی یہ نمبر ملا سکتی تھی۔ اس نمبر سے آیا ہوا یہ پہلا پیغام تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہر دفعہ بات چیت کے بعد رمشہ سارے پیغامات کو ڈیلیٹ کر دیا کرتی تھی۔

''وعلیکم السلام'' جواب مختصر تھا۔

''کیسی ہو تم؟ کہاں غائب ہو؟'' بے تابی سے جواب آیا۔ آپ سے تم تک کا سفر بہت جلد طے ہو گیا تھا۔ رمشہ کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں اور آنکھیں چمکنے لگیں۔

''اُف بے صبری'' اُس نے زیر لب کہا اور دانتوں سے ہونٹوں کو دبا لیا۔ اسکرین لاک تھی اور اوپر ہی سے پیغام پڑھنے کے بعد رمشہ جان بوجھ کر طوالت کے ساتھ ان باکس کھول رہی تھی۔

''یار جواب تو دو۔ سب ٹھیک تو ہے نا! تم نے کل رات کے بعد سے کسی پیغام کا جواب نہیں دیا۔''

موبائل اسکرین ایک بار پھر جگمگا اٹھی اور اس کے ساتھ ہی رمشہ کی آنکھیں بھی۔

''پلیز مجھے تنگ نہ کرو۔ میں تمہارے بارے میں بہت فکر مند ہوں۔''

اب کی بار رمشہ کو بھی رحم آ گیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ پڑھائی میں مصروف تھی۔'' جواب مختصر تھا۔

''اُف.....تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ تمہیں پتا ہے میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔ پلیز یار ایسا نہ کیا کرو۔''

دل کسی کلی کی طرح کھل اٹھا۔ ''ارے کل رات ہی تو بات ہوئی تھی۔''

''تمہیں پتا ہے کل رات سے آج تک 24 گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میرا تو دل چاہتا ہے میں ہر وقت تم سے بات کرتا رہوں۔''

''اُف یہ تو دیوانہ ہی ہو گیا ہے'' رمشہ دوہری ہو گئی اور اپنے جذبات کو قابو پانے کی پوری کوشش کی۔ یہ اس کا اور طوبیٰ کا مشترکہ کمرہ تھا۔ طوبیٰ اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ کتابیں تو رمشہ کے بھی سامنے کھلی تھیں لیکن اس نے فون کو سائلنٹ کیا ہوا تھا۔ بظاہر وہ پڑھ رہی تھی لیکن درحقیقت کتابوں میں لکھے الفاظ کی جگہ اسے صرف جگمگاتے ہوئے جذبات سے بھرپور حروف نظر آ رہے تھے۔

''کیا ہو گیا؟ پڑھ کیوں نہیں رہی ؟'' طوبیٰ نے چبھتی ہوئی آواز کے ساتھ گہری نظروں سے رمشہ کو گھورا۔

''پڑھ ہی تو رہی ہوں۔'' رمشہ نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''صرف موبائل میں لگی ہوئی ہو اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں میں۔'' طوبیٰ نے سرزنش کی۔

''میں پڑھ ہی رہی تھی۔ساتھ ہی اپنی دوست سے بات کرنے لگی۔نوٹس کا پوچھ رہی تھی۔'' رمشہ نے بے رخی سے جواب دیا۔

''یہ کہانیاں امی کو سنانا، مجھے نہیں۔'' طوبیٰ نے اسے گھُرکا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ دوست ہی سے بات کر رہی تھی اور کس سے بات کروں گی۔'' رمشہ نے کتابوں کے اوراق پلٹتے ہوئے جواب دیا۔

''رمشہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا کہ امی اور ابو کو شرمندگی اٹھانا پڑے یا پھر تمہیں خود ان کے سامنے سر جھکانا پڑے۔'' طوبیٰ نے تنبیہی انداز میں کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو آخر۔ جب میں کہہ رہی ہوں میں پڑھائی کے حوالے سے ہی بات کر رہی تھی خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہی ہو۔بس ایک تم ہی پڑھا کو ہو اس گھر میں؟ اور میں کیوں جھوٹ بولوں گی تم سے؟" رمشہ اِک دم ہی آپے سے باہر ہو گئی تھی۔اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور الفاظ لڑکھڑا گئے تھے۔

طوبیٰ لب بھینچے اسے دیکھتی رہی پھر کچھ توقف کے بعد بولی:

''میں نے کب کہا تھا تم جھوٹ بول رہی ہو؟''

اب کی بار رمشہ واقعی گڑ بڑا گئی۔''ہاں تو مطلب تو یہی تھا نا تمہارا۔ مجھے پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ میں بھی امی ابو سے پیار کرتی ہوں صرف تم نہیں۔''

وہ کتابیں رکھ کر اب بستر پر سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔''اور اب پلیز لائٹ بند کر دو مجھے سونا ہے۔صبح جلدی اٹھنا ہے کالج میں پریکٹیکل ہے میرا۔'' سر تک چادر تان کر وہ تن کر لیٹ چکی تھی۔

طوبیٰ ہکّا بکّا اسے دیکھتی رہ گئی۔دل میں تو آیا اسے خوب سنائے یا پھر امی ہی سے جا کر اس کی شکایت لگا دے لیکن پھر غصہ ضبط کرتے ہوئے اس نے بھی اپنی کتابیں سمیٹ لیں۔اس کا دل بھی پڑھائی سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔

''بھاڑ میں جائے میری طرف سے۔خود ہی جب فضول حرکتوں پر امی ابو پکڑیں گے تو لگ پتا جائے گا اور عقل بھی خوب ٹھکانے آجائے گی۔'' وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی، سونے کے لیے آنکھیں بند کیں تو ایک دم ایک شناسا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔سانولا رنگ،خوبصورت آنکھیں، ماتھے پر بکھرے بال۔گہری نیلی جینز اور ہلکے نیلے رنگ کی آدھی آستین والی ٹی شرٹ۔وہ بلاشبہ اسفر ہی تھا۔

لاکھ چاہنے کے باوجود وہ آنکھیں کھول نہ پائی۔ اِک موہوم سی خواہش تھی کہ وہ سراپا کچھ دیر اور بند آنکھوں کے سامنے رہے لیکن یک دم ہی ایک خوبصورت نسوانی چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

جتنا وہ ان یادوں سے جان چھڑانا چاہتی تھی اتنا ہی وہ پاؤں کی بیڑیاں بن کر ساتھ چلی آتی تھیں۔

"میری ترجیحات کچھ اور ہیں۔ مجھے زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔''

اپنا دھیان بانٹنے کے لیے ایک منتر کی طرح اس نے اپنے آپ کو باور کرانا شروع کیا اور کچھ ہی دیر میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

...۞...

اپنی باغیانہ سوچوں سے فرار کا اسے واحد حل یہی نظر آیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو کتابوں میں غرق کر لے۔ فرقان سے بھی اس کی ملاقات کئی ہفتوں سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی فیملی کی کسی شادی میں مصروف تھا۔

عائزہ کے بھی امتحانات سر پر تھے لیکن علالت کے باعث اس کی پڑھائی کا بے تحاشہ حرج ہو رہا تھا۔ آج بھی عائشہ اختر کے ساتھ اُسے ہسپتال لے کر گئی ہوئی تھیں۔ چار گھنٹے ہونے کو تھے اور وہ ابھی تک واپس نہ آئی تھیں۔ اسفر کو اب تشویش ہونے لگی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی کاپی پر لکھے لمبے لمبے نوٹس کی طرف اپنا دھیان لگا لیا۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد اس کا دل پڑھائی سے بالکل اُچاٹ ہو چکا تھا اور پورے جسم میں ایک بے چینی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے آپ کو پڑھائی میں بغیر کسی خلل کے مصروف رکھنے کے لیے آج کل اس نے اپنا موبائل آف کر رکھا تھا۔ حالانکہ یہ اس تجربے کا پہلا ہی دن تھا لیکن یہ دوسری مرتبہ تھا کہ وہ ایک بار پھر موبائل آن کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ موبائل بند کرنے کے تین گھنٹے بعد اور اب شام ڈھلے۔ ابھی وہ اختر کو نمبر ملانے ہی لگا تھا کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ اسفر نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو امی اور عائزہ اختر کے ساتھ گاڑی سے اترتے نظر آئے۔

''کہاں رہ گئے تھے آپ لوگ؟'' اسفر نے ان کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔ عائشہ حد سے زیادہ تھکی نظر آ رہی تھیں جبکہ عائزہ نڈھال تھی۔

''امی میں تھوڑی دیر سوؤں گی'' اُس نے بڑی چادر اتارتے ہوئے کہا اور ہلکے ہلکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف پاؤں بڑھا دیے۔ ''بیٹا پہلے کچھ کھا لو۔ دوا بھی کھانی ہے۔'' عائشہ نے فکرمندی سے کہا۔

''تھوڑی دیر بعد کھا لوں گی امی۔'' عائزہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

''کیا بات ہے امی، کیا کہا ڈاکٹر نے؟ اتنی دیر کیوں ہو گئی آپ لوگوں کو واپسی میں۔''

اسفر کو اب کی دفعہ واقعی تشویش ہوئی۔

''اتنی لمبی چوڑی لسٹ پکڑا دی ڈاکٹر نے ٹیسٹ کی۔ دعا کرو رپورٹس ٹھیک آئیں۔''

اسفر کی زبان کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا: ''ایسے کیسے اتنے ٹیسٹ کرا لیے ڈاکٹر نے کچھ تو کہا ہوگا۔'' اب کی بار وہ اختر سے مخاطب تھا جو خاموش ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے اسفر کو اس سوال کو بعد پر اٹھا رکھنے کے لیے کہا'' کچھ خاص نہیں بس وہ اپنی تسلّی کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی پیچیدگی نہ ہو۔''

عائشہ بھی متفکر تھیں۔'' کتنی مرتبہ اس کو کہا ہے کہ الّم غلّم نہ کھایا کرو، پتا نہیں کیا کھایا ہے کہ پیٹ میں مستقل درد ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ معدہ پرورم ہے اس کو۔'' وہ کچھ پُرسوچ انداز میں بولیں۔

''امی! آپ آرام کریں تھک گئی ہوں گی۔ نماز کا وقت بھی جا رہا ہے۔'' اختر نے عائشہ کو یاد دلایا۔

''ارے ہاں! اسفر، اختر تھکا ہوا ہے تم بازار سے کچھ سامان لے آؤ۔ پھل کھائے گی تو جلدی طبیعت سنبھل جائے گی عائزہ کی۔'' عائشہ لاؤنج سے جاتے جاتے اسفر کو ہدایت دیتی گئیں۔

عائشہ کے جاتے ہی اسفر اختر کی طرف متوجہ ہوا۔

''عائزہ کے کافی ٹیسٹ کروائے ہیں ڈاکٹر نے۔ ایک دوسرے ڈاکٹر کو بھی بلوایا اور اس سے کچھ مشورہ کیا۔ الگ لے جا کر مجھ سے بات کی اور بتایا کہ شاید بائیوپسی کروانی پڑے۔''

''بائیوپسی؟'' اسفر کی آنکھیں باہر ابل آنے کو تھیں۔

''ہاں۔'' اختر نے مختصر جواب دیا۔'' لیکن ابھی ان ٹیسٹ کی رپورٹس آجائیں تو ڈاکٹر حتمی جواب دیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم ذہنی طور پر تیار رہیں۔''

اسفر ابھی بھی صدمے کی کیفیت میں تھا۔

''لیکن کیوں بھئی؟'' ہمارا لائف اسٹائل تو بہت سادہ ہے؟ نہ ہم کوئی ایسی چیز استعمال کرتے ہیں جس سے کہ.....'' اسفر کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''چپ کرو تم'' اختر نے سختی سے کہا۔'' ابھی امی کو کچھ نہیں بتانا۔ تمہیں پتا ہے وہ عائزہ کے بارے میں کتنی حساس ہیں۔ میں نہیں چاہتا وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں۔''

یہ کہہ کر اختر تو چلا گیا لیکن اسفر اپنی جگہ پر منجمد رہ گیا۔

''کینسر'' اس کے دماغ میں آواز گونجی۔'' نہیں نہیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' اُس نے سختی سے اپنے

خیالات کی تردید کی لیکن دل تھا کہ تھم ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اِک دم ہی بے تحاشہ فکر مند ہو گیا تھا اور دماغ ممکنہ آنے والے حالات پر غور کرنے لگا۔ اگلے دن اس کا پہلا پرچہ تھا اور جو خبر، ایک شائبہ ہی صحیح، اُسے سننے کو ملی تھی وہ پڑھائی سے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے دو چند تھی۔

...۞...

''اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ میں مرا جا رہا ہوں اُس حسین چہرے کو دیکھنے کے لیے جس کی یادوں نے میرے دل کا چین اور راتوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔''

ریّان سے بات چیت شروع ہوئے اب تین مہینے گزر چکے تھے اور اس کا ملنے پر اسرار اب شدت پکڑتا جا رہا تھا۔

''نہیں ریّان! ابھی نہیں، میں امی ابو کے علم میں لائے بغیر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ وہ کیا سوچیں گے؟'' رمشہ نے بڑھتی دھڑکنوں کے ساتھ پیغام ٹائپ کیا۔

''ان کو بتاؤ گی تو کیا وہ تمہیں مجھ سے ملنے سے منع کریں گے؟''

''ہمارے خاندان میں لڑکوں سے دوستی کو کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔''

''لیکن ہمارا رشتہ تو پاکیزہ ہے، ہم نے کوئی غلط کام یا غلط بات تو نہیں کی۔ کسی سے بات کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔ پسند کا حق تو اسلام نے بھی دیا ہے۔''

رمشہ کی سمجھ میں نہ آیا اب وہ کیا کہے۔ ہر گزرتے دن وہ ریّان کے آگے کمزور پڑ رہی تھی۔ انہوں نے ابھی تک ایک دوسرے کی تصویریں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ بات شروع ہی سے طے کر لی گئی تھی کہ وہ تصویروں کا تبادلہ نہیں کریں گے۔ رمشہ کی اس شرط کے بعد ہی ریّان سے بات چیت آگے بڑھی تھی جو آہستہ آہستہ رمشہ کے دل میں جگہ بنانے لگی تھی۔ لیکن ریّان کے بڑھتے ہوئے اسرار پر رمشہ کے دل میں بھی ایک قدم آگے بڑھنے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

''اچھا تو کہاں لے کر جاؤ گے مجھے؟'' آخر کار رمشہ نے مثبت اشارہ دیا۔

''تم جہاں کہو جانِ من۔'' ایک بازاری سا جملہ جو رمشہ کو بیک وقت اچھا اور برا لگا۔ ''پلیز اس طرح بات نہ کیا کرو۔''

''کس طرح؟''

یہ جو الفاظ تم استعمال کرتے ہو مجھے بہت چیپ لگتے ہیں۔'' رمشہ خفا ہوئی۔

''اوکے بابا نہیں کروں گا۔خوش؟ اب بتاؤ کب ملنے آ رہی ہو؟'' رمشہ کے دل کی دھڑکن ایک دفعہ پھر بے ترتیب ہو گئی۔

...۞...

طوبیٰ نے دوبارہ رمشہ سے کچھ نہیں کہا لیکن ایک گہری نظر وہ ضرور رمشہ کے پر رکھے ہوئے تھی۔ چونکہ رضیہ موبائل فون کے ہر وقت ہاتھ میں رہنے پر سخت چڑتی تھیں تو کوئی بھی ان کے سامنے موبائل فون استعمال نہیں کرتا تھا۔

رمشہ صرف کمرے میں ہی اپنا فون استعمال کرتی تھی۔کسی سے فون پر بات کرتے اس نے رمشہ کو کبھی نہ سنا تھا لیکن اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ رمشہ کسی لڑکے سے نہ صرف باتیں کرتی ہے بلکہ وہ باتیں کس نوعیت کی ہیں اس کا اندازہ اسے بخوبی ہو رہا تھا۔طوبیٰ ان سب جذبات سے بخوبی واقف تھی لیکن اس عمر کی دوسری لڑکیوں سے کافی مختلف ہونے کے باعث محبت کا جذبہ اس کے لیے زندگی کی ریس میں ایک رکاوٹ کی طرح تھا جس کو ایک لمبی اور اونچی چھلانگ کے ساتھ پار کر لینے میں ہی عقل مندی تھی۔

رمشہ کے اکثر کوئی کام کرتے ہوئے گنگناہٹ اور اپنی ہی سوچوں میں مگن مسکرائے جانے پر طوبیٰ اکثر چڑ جاتی تھی۔اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

''آخر ایسا کیا ہوا ہے جو اتنا مسکرایا جا رہا ہے؟'' طوبیٰ نے عام سے لہجے میں پوچھا۔بہنیں ہونے کے باوجود وہ آپس میں اتنی بے تکلف نہ تھیں۔اس کی وجہ ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا نہ ہونا تھا لیکن اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ سب بہن بھائی ایک دوسرے کو کسی پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''کچھ نہیں،بس ایسے ہی۔'' رمشہ نے کندھے اچکائے۔

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری؟ اپریل میں پیپرز ہیں ناں!'' طوبیٰ نے یاد دہانی کرائی۔

''ہاں اچھی جا رہی ہے۔کالج میں تو بس نام ہی کی پڑھائی ہے۔کچھ ٹیچرز اچھی ہیں جو روز آتی ہیں اور کلاس بھی لیتی ہیں لیکن ایک دو ٹیچرز تو ایسی ہیں جن کی ہم نے آج تک شکل بھی نہیں دیکھی۔''

''ہوں.....ایسا ہی ہوتا ہے کالجز میں۔'' طوبیٰ نے سر ہلایا۔

''کوچنگ جوائن کر رہی ہوں میں۔'' رمشہ نے اطلاع دی۔

طوبیٰ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ یہ تو ایک عام رواج تھا اب۔ چاہے کتنے ہی اچھے کالج یا یونیورسٹی میں کیوں نہ ہو ٹیوشن سینٹر ہی جیسے کامیابی کی ضمانت تھے۔

اُس وقت تک طوبیٰ نہیں جانتی تھی کہ ٹیوشن سینٹر میں ایڈمیشن کے پیچھے ایک اور وجہ کارفرما تھی اور وہ تھی ریّان سے ملاقات۔ کالج کے لیے تو اکبر نے رمشہ کو گاڑی لگوا دی تھی کیونکہ کالج نہ صرف دور تھا بلکہ رمشہ راستوں کے معاملے میں بھی بہت بھلکڑ ثابت ہوئی تھی۔ لیکن کوچنگ سینٹر اُن کے علاقے سے کچھ ہی دور تھا اور رمشہ کے لیے وہاں آنا جانا کوئی مسئلہ نہیں بن سکتا تھا۔

...۞...

"آپی!" حُسنہ نے طوبیٰ کو مخاطب کیا اور یک ٹک اُسے دیکھے گئی۔
طوبیٰ اپنی الماری کی صفائی کرنے کے بعد بستر پر آ کر بیٹھی تھی جہاں حُسنہ اپنی پڑھائی میں مدد کروانے کے لیے پہلے سے موجود تھی۔ حساب کا ایک سوال سمجھنے کے دوران اچانک ہی حسنہ کی توجّہ طوبیٰ کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔
"کیا ہوا؟" اپنی طرف یوں حسنہ کو حیرت سے دیکھ کر طوبیٰ کنفیوز ہوگئی۔
"آج سے پہلے میں نے آپ کو کبھی آپ کی سونے کی بالیوں کے بغیر نہیں دیکھا۔" حسنہ نے طوبیٰ کے چہرے پر نظریں ٹکائے وضاحت دی۔
طوبیٰ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔
"آں۔ ہاں وہ بس دل کیا اُتارنے کا، کب سے تو پہنی ہوئی تھیں۔ بور ہوگئی تھی میں۔"
طوبیٰ نے بات سنبھالی اور اِس سے پہلے کہ حسنہ کوئی اور سوال کرتی طوبیٰ نے جھٹ اُس کی سرزنش کر ڈالی۔
"بجائے میری بالیوں پر دھیان دینے کے جو سمجھا رہی ہوں اُس پر دھیان دو۔ بار بار نہیں بتاؤں گی!"
حُسنہ بھی واپس اپنی نوٹ بک پر جُھک گئی۔ طلبا کی مدد کی آڑ میں کئے جانے والے ایک گھناؤنے کھیل کا اتفاقاً وہ مہرہ بن تو گئی تھی۔ لیکن اپنی غلطی کو سُدھارنا وہ خوب جانتی تھی نہ صرف بیس ہزار روپے کی رقم اُس نے واپس چکا دی تھی، ایک مکمل رپورٹ یونیورسٹی کے ایڈمن کو جمع کرانے کے ساتھ ساتھ ایک پورا آرٹیکل اُس نے ایک مشہور اخبار کو بھیج دیا تھا۔ جس اذیّت کا اُس نے سامنا کیا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور اُس کا سامنا کرے۔ اِس تنظیم کو بے نقاب کرنا اب اُس کا اصل ہدف تھا۔
اُس نے بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈالا تھا یہ وہ بخوبی جانتی تھی، اب بس اشتیاق تھا تو یہ جاننے کا کہ اب آنے والی مشکل کتنی بڑی ہوگی۔

...۞...

عائزہ کمرے میں اپنی کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی جب اسفر نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا عائزہ نے اسفر کو دیکھا تو ایک بے جان سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر جاگی۔ ''آجاؤ اسفر'' اس نے پاؤں سمیٹے اور کتاب گود میں رکھ لی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اسفر نے اس کی زرد رنگت کو تأسف سے دیکھا۔

''بس تھکن ہے پتا نہیں کیوں بہت زیادہ۔ جتنا آرام کر لوں اُترنے کا نام نہیں لیتی۔ عائزہ نے چڑتے ہوئے کہا۔ وہ انتہائی چست اور اپنا کیریئر بنانے کے حوالے سے انتہائی پرجوش لڑکی تھی لیکن پچھلے چند مہینوں میں نہ صرف اس کا وزن کم ہوا تھا بلکہ مستقل بیمار رہنے کے باعث وہ کافی چڑچڑی بھی ہوگئی تھی۔

''چلو ٹھیک ہو جائے گی اِن.....'' اسفر انشاءاللہ کہتے کہتے رک گیا۔ عائزہ اس کے اٹک جانے پر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میرا مطلب ہے ٹیسٹ ہو گئے ہیں سارے۔ ابھی رپورٹس آ جائیں گی تو مرض بھی پکڑا جائے گا، مریض تو ویسے ہی ہمارے قابو میں آ گیا ہے۔''

عائزہ کمزوری سی ہنسی ہنس دی۔ ''کیوں بھئی مریض کہاں بھاگا جا رہا تھا جو تم یہ کہہ رہے ہو۔''

''ارے مریض کہاں ہمارے قابو میں تھا۔ یونیورسٹی میں جب سے تمہارا داخلہ ہوا ہے وہ دن ہے اور آج کا دن ہے نہ کوئی بورڈ گیم نہ کیرم، نہ صحن میں کرکٹ.....سب ختم ہوگیا، میں تو ڈھونڈ تا ہی رہ گیا اپنی ایک عدد بڑی بہن کو جو نہ صرف مجھے ڈرا دھمکا کر پڑھاتی تھی بلکہ خوب انٹرٹین بھی کرتی تھی۔'' اسفر نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

عائزہ واقعی خوش ہوگئی۔

''بس اسفی ایک دفعہ یہ امتحانات اچھے ہو جائیں بس پھر فائنل پراجیکٹ رہ جائے گا۔ میری برسوں کی محنت رنگ لانے میں بس چند ہی مہینے ہیں۔'' عائزہ کی آنکھیں جگمگا اٹھی تھیں۔

''بالکل جناب..... پھر ہم بھی فخر سے کہیں گے کہ ایک ناہید معشوق اللہ ہمارے گھر پر بھی ہیں۔''

عائزہ اسفر کی بات پر کھلکھلا کر دی۔ سب جانتے تھے کہ ناہید معشوق اللہ جو کہ نامی گرامی انٹیریئر ڈیزائنر تھی عائزہ کی آئیڈیل تھی۔ یونیورسٹی سے ایڈمیشن سے پہلے ہی وہ ناہید معشوق اللہ کی پوری

بائیوگرافی کھنگال چکی تھی اور سب کو اس کے قصے سنا سنا کر عاجز کر دیا تھا۔

''ہاں بالکل، پھر میرا نام بھی پاکستان کی مایہ ناز فی میل آرکیٹکٹ میں شمار ہوگا۔'' عائزہ کی خوشی اس کے چہرے پر چھلکنے لگی تھی۔ ''انشاءاللہ'' عائزہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''بس اللہ جی یہ آخری سال بھی ایسے ہی اچھا کلیئر ہو جائے اور مجھے اچھی جگہ انٹرن شپ مل جائے، پھر جاب'' وہ پورے دل و جان سے دعا مانگ رہی تھی۔

اسفر اُسے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ اِک موہوم سی امید اس کے دل میں پھر جاگ اُٹھی۔

''شاید میری دعاؤں میں کوئی کمی ہوگی۔ شاید اس کی دعائیں قبول کرنے والا موجود ہو۔''

عجیب بے ہنگم سوچ تھی جو اسے دن بدن مزید الجھائے دے رہی تھی۔ کچھ بے بسی اور جھنجھلاہٹ سے وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ عائزہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرا بھی پیپر ہے دو دن بعد۔ پڑھنے جا رہا ہوں۔ تم بھی پڑھو مستقبل کی نامور آرکیٹیکٹ۔'' اسفر نے اپنی جھنجھلاہٹ کو ایک مسکراہٹ سے رفع کرنے کی کوشش کی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی اس کے دماغ میں آنے والی سوچوں کو پڑھ لے۔ اس کا ان سوچوں پر اختیار نہیں تھا۔ اب تک کتنے ہی واقعات ایسے ہو چکے تھے جو اس کے سامنے ایک نیا سوال لا کھڑا کر دیتے اور ان سوالوں کا جواب کم و بیش ایک ہی طرح کا ہوتا۔

''ان چیزوں کے بارے میں اتنا نہ سوچو۔''

''پاگل ہو گئے ہو کیا۔ ایسا نہیں کہنا۔''

''تم تو پکے جہنمی ہو۔''

''اللہ کی باتوں میں دخل اندازی نہ کرو اور نہ ہی اس کے کاموں میں۔''

''بس سنو اور اطاعت کرو، سوال نہ اٹھاؤ۔''

وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا آج پڑھائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اتنے الجھے دماغ کے ساتھ کتابوں میں دھیان لگانا اسفر کے بس کی بات نہیں تھی۔ عائزہ کے بارے میں وہ بے حد فکر مند تھا دھیان ہٹانے کے لیے اس نے فرقان کو کال ملائی۔ شاید آج موقع اچھا تھا کچھ دل ہلکا کرنے کے لیے۔

...۞...

آج رمشہ کے دل کی دھڑکن بہت بے ترتیب تھی۔ گال حدّت سے دمک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جسم کے اندر پارہ بھر گیا ہو، کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ آج کو چنگ جاتے ہوئے پورا مہینہ ہو گیا تھا اور ریّان کو ٹالتے ہوئے بھی۔ لیکن کل رات کی چیٹ میں بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ریّان سے ملنے پر رضامند ہو گئی تھی۔

ریّان کے دباؤ میں آ کر اس نے حامی تو بھر لی تھی لیکن دل کے کسی کونے میں ایک احساس اسے ملامت کر رہا تھا۔ اکبر اور رضیہ نے کبھی بچوں کو کسی بات سے روکا ٹوکا نہیں تھا اور نہ ہی بے جا پابندیاں لگائی تھیں لیکن کچھ اصول ایسے تھے جن پر وہ سب سختی سے کاربند تھے۔

رضیہ لڑکے اور لڑکیوں کے آزادانہ میل جول کے سخت خلاف تھیں اور اس بات کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ طوبیٰ چاہتے ہوئے بھی اپنی ٹین ایج کے اوائل سالوں میں اسفر کے جذبات سے باخبر ہونے کے باوجود میل جول نہ بڑھا پائی تھی اور نہ ہی ان کے خاندان میں سے کسی نے ایسا کیا تھا۔

رمشہ پہلی تھی جو ان کے خاندان میں سے کسی ڈیٹ پر جا رہی تھی۔ حالانکہ موجودہ زمانے میں یہ سب بہت عام ہو گیا تھا لیکن اکبر اور رضیہ کے لیے یہ اب بھی اتنا ہی معیوب اور ناپسندیدہ تھا جتنا دس سال پہلے ہوتا ہوگا۔

لاثانی ریستوران اس کے کو چنگ سینٹر سے دس منٹ کی دوری پر تھا۔ ریّان نے ہی یہ ریستوران منتخب کیا تھا۔ رمشہ جتنا متامل ہو رہی تھی اس کے لیے آسان ترین آپشن وہی تھا جہاں وہ بآسانی پہنچ جاتی۔ ہلکا آسمانی کاٹن کا جوڑا پہنے آج کچھ اور ہی روپ تھا رمشہ کے چہرے پر۔ گہری سیاہ آنکھوں پر گھنی پلکیں، بوٹا سا قد اور گلابی رنگت۔ کم عمری اپنے آپ میں ایک حسن ہے اور جب نئے نئے عشق کی تاپ مل رہی ہو تو حسن دو چند ہو ہی جاتا ہے۔

رمشہ جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی۔ سوٹ کا ہم رنگ دوپٹہ سر پر لیے ہوئے اس نے ہلکی گلابی لپ اسٹک اپنے بیگ میں ڈالی جو وہ بآسانی رکشے میں بیٹھ کر لگا سکتی تھی۔ دوپٹہ کس کر چہرے کے گرد لپیٹا تاکہ کانوں میں ڈالی بالیاں نظر میں نہ آئیں۔

رمشہ کو رضیہ سے زیادہ ڈر طوبیٰ کا تھا۔ جن نظروں سے طوبیٰ رمشہ کو جانچتی تھی وہ رمشہ کے تن بدن

میں آگ لگانے کے لیے کافی ہوتی تھیں۔ رضیہ کی طرف سے اسے بےفکری تھی کہ ان کو اس ملاقات کی بھنک بھی نہ پڑنی تھی۔

رمشہ کو پورا یقین تھا کہ طوبیٰ اس کے اور ریّان کی دوستی کے بارے میں سب کچھ نہ سہی تو کافی کچھ جانتی ہے۔ حالانکہ موبائل فون کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ ہی اپنے آپ سے جدا کرتی تھی اور نہ ہی ان لاک چھوڑتی تھی پھر بھی طوبیٰ کی خاموش نظریں اسے ہمیشہ تنبیہ کرتی ہوئی محسوس ہوتیں، اس دن کے بعد سے طوبیٰ نے رمشہ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن رمشہ بس خوامخواہ ہی طوبیٰ سے چڑنے لگی تھی۔

ابھی بھی جیسے ہی وہ گھر کی دہلیز پار کرنے لگی طوبیٰ ایک دم سامنے آ گئی۔ وہ یونیورسٹی سے واپس آ رہی تھی۔ شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے، گرمی کی وجہ سے طوبیٰ کا چہرہ بھی تمتما رہا تھا اور بسوں کے دھکے کھانے کے بعد اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی، تب ہی رمشہ کو یوں اہتمام سے تیار دیکھ کر وہ ایک دم دروازے پر ہی رک گئی۔ اس کے ماتھے پر ہلکا سا بل آیا۔

''اتنی جلدی جا رہی ہو؟ تمہاری کلاس تو ساڑھے پانچ شروع ہوتی ہے نا!'' طوبیٰ نے تنقیدی نظروں سے اسے گھورا۔

''اتنے سوال جواب تو امی بھی مجھ سے نہیں کرتیں جتنی تم کرتی ہو۔ خیر اطلاعاً عرض ہے کہ آج بینش کی سالگرہ ہے اور ہم جلدی کو چنگ میں جمع ہو کر کیک کاٹیں گے۔'' طوبیٰ خاموشی سے اس کے برابر سے گزرنے لگی۔ ''اب تم پوچھو گی یہ بینش کون ہے؟'' رمشہ خود بھی نہیں جانتی تھی اتنی دلیری اس کے اندر ایک دم کہاں سے آ گئی تھی۔ بینش میری کو چنگ میں نئی دوست ہے۔''

طوبیٰ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ''میں نے کوئی وضاحت نہیں مانگی۔ تم سمجھ دار ہو اور اپنا اچھا برا خوب جانتی ہو۔'' یہ کہتے ہی طوبیٰ گھر میں داخل ہوئی اور دروازہ لاک ہونے کی آواز رمشہ کو شاک سے واپس کھینچ لائی۔

''میں ایسا کیا کرنے جا رہی ہوں جو مجھے اتنی تنبیہ کر رہی ہے۔'' رمشہ نے مشتعل ہوتے ہوئے سوچا۔

اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی طوبیٰ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ جس احساس

سے وہ کل رات سے سرشار تھی اس کا مزا کرکرا ہو گیا تھا اور قدم بھاری ہو گئے تھے۔ کچھ بے بسی اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ اُس نے رکشہ اسٹینڈ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

...۞...

حسبِ معمول وہ دونوں اُسی چائے کے ہوٹل پر بیٹھے تھے۔ اسفر دور خلاؤں میں گھور رہا تھا اور ساتھ ساتھ چائے کی چسکیاں بھی لیتا جا رہا تھا۔ فرقان خاموشی سے اسفر کو کسی غیر مرئی شے پر نظر ٹکائے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا کہ شاید اسفر بات شروع کرے لیکن پھر اس نے ہار مان کر اسفر کو مخاطب کیا ''پیپرز کیسے ہو رہے ہیں تمہارے؟''

''آں..... ہاں پیپرز.....'' ابھی تو ایک ہی ہوا ہے، صحیح ہوا ہے۔'' پھر خاموشی تھی۔

''گھر میں سب خیریت؟''

''ہاں خیریت ہے.....بس عائزہ کی طرف سے تھوڑی پریشانی ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا؟ اس کی بیماری کافی لمبی ہو گئی.....'' فرقان نے اسی کو اسفر کی پریشانی کی وجہ گردانا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ معاملہ کچھ سیریس ہے ورنہ اسفر بہت باتونی نہ سہی لیکن ایک ہنس مکھ لڑکا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ اس کے لیے انجان سے انجان تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے سوال بھی اتنے عجیب و غریب ہوتے کہ فرقان سوچ میں پڑ جاتا، وہ اسفر کی باغیانہ سوچ پر کبھی غصہ کرتا تو کبھی لاعلمی کے باعث خاموش ہو جاتا۔ لیکن آج کل اس کی پریشانی کا سبب حقیقی تھا اور اسے اسفر سے پوری ہمدردی تھی۔

''ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں؟'' فرقان نے پوچھا۔ اسفر کا توقف اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

''بلڈ ٹیسٹ کروائے ہیں ڈاکٹرز نے کئی۔'' اسفر کی آواز میں فکرمندی نمایاں تھی۔

''رزلٹ آ گئے؟''

''کچھ رپورٹس آ گئی ہیں، کچھ میں ابھی وقت لگے گا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟'' اسفر نے لمبا سانس کھینچا۔

''چلو اللہ خیر کرے گا، انشاءاللہ۔'' بے ساختہ ہی یہ جملہ فرقان کے منہ سے ادا ہوا لیکن اسفر نے جن شاکی نظروں سے اسے گھورا تو فرقان کچھ گڑبڑا گیا۔

''میرا مطلب ہے اللہ تعالیٰ شفا دیں گے اسے تم لوگ علاج تو کر ہی رہے ہو۔''

اسفر کچھ بیزار ہوا اور بالآخر بول پڑا

''اگر اب اللہ ہی نے کرنا ہے تو ہم خواہ مخواہ ہی پریشان ہوتے ہیں۔''

فرقان کے لب بھنچ گئے۔ اسفر عائزہ سے کتنا قریب تھا یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن اس حساسیت میں وہ حد سے گزر جائے گا اس کا فرقان کو قطعاً اندازہ نہیں تھا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو اسفر..... اللہ کی ذات ہی شفا دینے والی ہے۔'' فرقان کوئی بھی حدیث بیان کرنے میں جتنا محتاط اب ہو گیا تھا اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ گو کہ اس کا گھرانہ بہت مذہبی نہ سہی لیکن بہت ماڈرن بھی نہ تھا۔ نماز روزہ کی پابندی اپنے گھر میں اس نے اول روز سے دیکھی تھی۔ باقی اسلامیات کے مضامین میں اور وقتاً فوقتاً حالات و واقعات نے جو علم بخشا تھا بس اس کے پاس اتنا ہی علم تھا اس سے زیادہ مذہب کو جاننے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

''اور بیماری؟ بیماری دینے والی ذات کون سی ہے؟'' اسفر نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے'' فرقان نے تنے ہوئے لہجے میں جواب دیا

''لیکن وہ آزمائش کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔''

''اچھا'' اب اسفر کا انداز تمسخر اڑانے والا تھا: ''تو ہم اتنے خوش باش تھے کہ اللہ نے سوچا کہ چلو اس کو امتحان میں ڈال دیں۔ پوری دنیا میں اور کوئی نہیں بچا یہ امتحان لینے اور دینے والا، ہے نا!''

اب کی بات فرقان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

'' دیکھو اسفر! اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتی۔ تم گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو۔'' فرقان غرّایا ''منہ سے الفاظ نکالنے سے پہلے سوچ تو لو کیا کہہ رہے ہو۔ ہر کسی کے اوپر مختلف طرح کی آزمائش آتی ہے۔''

ابھی فرقان کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ اسفر نے اِسے ٹوک دیا ''اور یہ آزمائش ہم جیسے مڈل کلاس لوگوں کے اوپر ہی آتی ہے؟ امراء بری ہیں اس آزمائش سے؟''

اسفر کے زہر خند لہجے نے فرقان ششدر کر دیا۔ کئی ساعتوں تک تو اسے یقین ہی نہ ہوا کہ جو الفاظ اس کے گنہگار کانوں نے سنے ہیں وہ اس کے اس دوست نے کہے ہیں جو انتہائی سادہ لوح مسلمان تھا۔ جب تک فرقان اپنے کھوئے ہوئے حواس واپس بحال کرتا اسفر چائے کے پیسے میز پر رکھ کر کھڑا

ہو چکا تھا۔

فرقان کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔

اسفر اپنی انگلیوں کی پوریں اپنی جینز کے جیبوں میں اڑسے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ جیسے کوئی پرندہ اپنے غول سے الگ ہو جائے اور تنہا ہی اڑتا جائے۔

فرقان کے دماغ میں ابھی تک جھڑ چل رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اسفر کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرے تا کہ ایک ہی دفعہ میں اس کی عقل ٹھکانے آ جائے لیکن اگلے ہی لمحے ایک ادراک کی کرنوں نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ وہ بھی خاموشی سے کھڑا ہو گیا اور پھر ایک لمبا سانس بھرتے ہوئے ہاتھ اسفر کے کاندھے پر رکھ دیا۔

''فکر نہ کرو یار، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' حسب معمول انشاءاللہ اس کے زبان پر آتے آتے رک گیا۔ اس نے عقیدت سے ان الفاظ کو دل ہی دل میں دہرایا اور بائیک کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اسفر کی شاکی نظروں کو وہ بالکل فراموش کر دینا چاہتا تھا۔

دو قدم چلنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اسفر اُس کے ساتھ نہیں تھا۔

''کیا ہوا؟'' گھر نہیں جانا'' اس نے استفسار کیا۔

''تم جاؤ، مجھے کچھ کام ہے۔'' یہ کہہ کر اسفر نے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔

فرقان خاموشی سے اس کو فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر جاتے دیکھتا رہا۔ اور پھر مایوسی سے بائیک کی چابی نکال کر ایک جانب بڑھ گیا۔

اُس رات نہ جانے کتنی ہی دیر اسفر سڑک کے کنارے بے مقصد چلتا رہا۔

نہ ہی وہ کوئی عمدہ بنی ہوئی شاندار سڑک تھی جہاں اس کے قدم خود بخود آگے بڑھتے جائیں اور نہ ہی آس پاس کے نظارے کوئی حسین۔ خستہ حال سڑکوں کے ساتھ ساتھ جا بجا ڈھابے کھلے تھے جو پوری آب و تاب کے ساتھ رات گئے اس شہر کے باسیوں کو راحت فراہم کرتے تھے۔ سڑک پر گاڑیاں زن کر کے شور مچاتی اس کے پاس سے گزر رہی تھیں اور کچھ بائیک سوار رانگ سائیڈ آ کر بار بار اس

کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ ایک جنگ تھی جو اس کے اندر چھڑی تھی۔ وہ اس آوارگی اور شور شرابے میں اپنے آپ کو کھو دینا چاہتا تھا۔

اچانک اس نے اپنے بالکل عقب میں بائیک کی تیز آواز سنی۔ وہ ایک دم کنارے ہو گیا تا کہ بائیک کو رستہ مل جائے لیکن خلافِ توقع بائیک اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ دو بھاری بھرکم آدمی شلوار قمیض میں ملبوس تھے اور بائیک کے رکنے سے پہلے ہی پیچھے بیٹھا آدمی اچھل کر بائیک سے اُترا۔

''موبائل نکال! موبائل نکال۔'' اس نے ریوالوار کے اشارے ساتھ انتہائی درشتی سے کہا اور اسفر نے کسی روبوٹ کی مانند اپنا موبائل نکال کر اس آدمی کے حوالے کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ بائیک اپنے سواروں سمیت وہاں سے غائب ہو چکی تھی اور اسفر ایک شاک کے عالم میں وہاں کھڑا تھا۔

لمحہ بھر پہلے محسوس ہونے والی الجھن اور ذہن پر چھائی دھند ایک ہی دم کہیں غائب ہو گئی تھی۔ نہ اسے اب سامنے سے آتی کوئی تیز روشنی پریشان کر رہی تھی اور نہ ہی آس پاس گزرتی گاڑیوں کا شور۔ ہر طرف اِک سنّاٹا تھا اس کے اندر بھی اور اس کے باہر بھی۔ تب ہی اچانک سامنے سے آتے ایک آدمی نے کندھا ہلایا۔

''کیا ہوا، لے گئے؟'' نہ جانے وہ تصدیق کر رہا تھا جیسے اسے اسی بات کا انتظار تھا یا پھر وہ یہ سب کچھ براہ راست دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا اسفر نے سمجھنے کی کوشش کی۔ آس پاس کا شور دھیمے دھیمے واپس لوٹ آیا۔ بھاری مونچھوں کے نیچے سے جھانکتے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں پُر اشتیاق۔

''ہوں!'' اسفر نے دھیمی آواز کے ساتھ گردن اثبات میں ہلا دی۔

''چلو خیر ہوئی، کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔'' اُس اجنبی نے اسفر کی پیٹھ ایسے تھپتھپائی جیسے گویا اسفر کے کوئی خراش نہ آنے میں اسفر کا کمال ہو اور جو لوگ ابھی موبائل چھین کر فرار ہو گئے گویا یہ ان کا بڑا احسان تھا کہ وہ صرف موبائل لے کر گئے اور جان بخش گئے۔

''جاؤ بیٹا اب گھر پہنچو جلدی۔ خدا کا شکر کرو، اس ہی نے بچا لیا۔''

اتنی دیر میں قریب سے کوئی دوسرا گزرتا شخص بھی اس معاملے میں دلچسپی لے چکا تھا۔ اسفر نے اُن دونوں اشخاص سے پیچھا چھڑانے میں ہی عافیت سمجھی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کی طرف گامزن ہو

گیا۔ اس کے دماغ میں اب صرف اُن دو بائیک سواروں کا حلیہ تھا اور دل میں بے حد غصہ۔ نیا موبائل ان حالات میں لینا اتنا آسان نہیں تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اور پھر ان دو اجنبیوں پر جو خوامخواہ ہی اس معاملے میں بے پناہ دلچسپی رکھتے تھے اور پھر ان چوروں پر، شہر کے حالات پر، اپنی بے بسی پر اور پھر اپنے وجود پر۔

''اب فرقان صاحب سے پوچھتا ہوں بھلا اس میں کیا بھلائی تھی؟'' اس نے نخوت سے سوچا۔ گھر ابھی بھی کافی دور تھا۔

...۞...

ہلکے آسمانی رنگ پر سفید اور سُرخ پھولدار پرنٹ کا دوپٹّہ رمشہ پر خوب جچ رہا تھا۔ رنگت صاف ہونے کے باعث گالوں پر لگا ہلکا سا بلش کچھ زیادہ ہی چمک رہا تھا یا شاید جذبات کی حدّت تھی جو سمٹ کر چہرے سے جھلک رہی تھی۔ قاتل ہونٹوں پر ہلکا لپ گلاز چہرے کی شگفتگی کو اور بڑھا رہا تھا۔ دوپٹّہ اس نے مضبوطی سے چہرے کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ آج بڑی مشکل سے سب سے بچ کر وہ تیار ہو کر گھر سے نکلی تھی تو خلافِ توقع طوبیٰ نے اسے دروازے پر ہی جا لیا تھا۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا وہ جو بھی سوچتی رہے رمشہ نے سر جھٹک کر مزہ کرکرا کرنے والے خیالات سے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کی لیکن طوبیٰ کی نظریں اس کو مسلسل بے چین کیے دے رہی تھیں آج پہلی بار وہ کسی سے ملنے آئی تھی۔

"ایک نامحرم سے۔" دل نے ایک اور کچوکا لگایا۔

"ہم اپنے کزن سے بھی تو ملتے ہیں اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔"

اس نے آسانی سے اپنے آپ کو دلاسہ دیا۔ "ان کے ساتھ بھی ہم بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔" ایک اور جواز تراشا۔ "ہاں لیکن چھپ کر تو نہیں ملتے نا۔" ایک زوردار نفی کسمسائی۔

اس کا دل اس زور سے دھڑکا اسے لگا کہ اب رک جائے گا۔ وہ مطلوبہ ریستوران کے سامنے کھڑی تھی۔ عمارت بہت بلند و بالا تھی نہ ہی بہت عالیشان لیکن ایک اچھے علاقے میں ہونے کے باعث ریستوران بہرحال نفیس تھا۔ رمشہ نے کس کر باندھا ہوا دوپٹہ ڈھیلا کیا اور ٹشو پیپر سے چہرے پر آیا ہلکا سا پسینہ خشک کرنے لگی تب ہی ایک لڑکے کو اس نے داخلی دروازے کے قریب ہی بائیک روکتے ہوئے دیکھا۔ اس کا دل ایک دم اچھل کر حلق میں آ گیا اور دروازے کی طرف بڑھتے قدم یکدم ہی رک گئے۔

وہ کوئی بائیس پچیس سال کا نوجوان تھا جو چست جینز کے اوپر کالے رنگ کی آدھی آستین کی ٹی شرٹ پہنا ہوا تھا۔ حسبِ عمر، مناسب شکل وصورت، چہرے پر مہاسے تھے اور قابلِ ذکر بات تھی منہ میں دبا گٹکا۔ بائیک میں چابی گھماتے ہوئے اس نے منہ سائیڈ پر کر کے ایک پچکاری ماری اور ہاتھ کی

پشت سے منہ صاف کر کے ریستوران کے داخلی دروازے کے باہر موجود تین عدد سیڑھیوں کو ایک ہی جست میں پار کر کے وہ دروازے پر موجود دربان کے پاس موجود تھا۔ رمشہ اپنی جگہ منجمد سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"کیا یہی تھا وہ شخص جس کے لیے وہ گھر والوں سے بینش کی سالگرہ کا بہانہ بنا کر آئی تھی؟" اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اور دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ کو لاکھ ملامت کی۔

"امّی اس لیے مجھے یہ ڈائجسٹی کہانیاں پڑھنے سے منع کرتی تھیں۔" اسے یاد آیا۔ "میں بھی بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر چلی آئی۔"

اسے اپنے اوپر سخت غصہ آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو چہرہ جذبات کی حدّت سے لال ہو رہا تھا اب وہ خفّت کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

"میں نے کیسے سوچ لیا کہ وہ پرنس چارمنگ ہی ہوگا۔"

"محبت کوئی صورت سے تھوڑی نہ کی جاتی ہے۔" دل نے اک کمزور سی کوشش کی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے دماغ میں شدت سے گونجنے والا یہ جملہ زبان سے بھی ادا ہو گیا تھا تب ہی پاس سے گزرنے والے ایک راہگیر نے اُسے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ رمشہ ایک دم سٹپٹا گئی اور ایک سواسی ڈگری گھوم کر سڑک پر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

اسے ڈر تھا کہ ریستوران کے دربان کے پاس کھڑا نوجوان کہیں اس کو پہچان کر اس کے پاس ہی نہ آ جائے۔ لال دانتوں والے اس نوجوان کی تصویر جیسے دماغ میں چپک سی گئی تھی۔ رمشہ کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے منہ پر ایک زوردار تمانچہ لگائے لیکن رکشے کی تلاش نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

"کیا مصیبت ہے؟" وہ بہت زیادہ جھنجھلائی ہوئی تھی۔

آج سے پہلے اس نے کبھی قسمت کو نہ کوسا تھا یہ کام تو طوبیٰ بخوبی سرانجام دیا کرتی تھی لیکن آج اس کا دل چاہا کہ وہ نہ صرف قسمت کو بلکہ اپنے اپ کو بھی خوب کوسے جس کو اپنے وقتی جذبات کو سنبھالنے کا ذرا ہنر نہ تھا۔ ایک کمزور تنکے کی مانند وہ جوش میں بہتی گئی تھی اور اس وقت اذیت زدہ خوف میں مبتلا تھی۔ دور سے رکشہ آتا نظر آیا تو بے صبری سے ہاتھ دیا۔ "کہیں کوئی کمبخت پیچھے سے پہچان ہی نہ لے۔"

"جی باجی کدھر جانا ہے؟" اُس کے سامنے رکشہ روک کر رکشے والے نے نچلا ہونٹ آگے کو نکال کر

پان کی پیک منہ کے اندر سنبھالی اور بڑی خوبی سے پورا جملہ ادا کیا۔

"در فٹے منہ۔" رمشہ کا جی چاہا رکشے اور اسے چلانے والے دونوں پر لعنت بھیج کر پیدل ہی گھر چلی جائے لیکن پھر خوف کی دو دھاری تلوار کے آگے مجبور ہو کر فٹ سے رکشے میں بیٹھ گئی۔" آج سارے پنواڑی ہی لکھے ہیں میرے نصیب میں۔"

اس نے کس کے چہرے کے گرد دوپٹہ لپیٹا اور وہ خوبصورت لٹیں جو بڑی ادا سے دانستہ دوپٹے سے باہر نکال لی گئی تھی بڑی بے دردی سے کان کے پیچھے اُڑس لی گئی تھیں۔ پرس سے ٹشو پیپر نکال کر اپنا چہرہ زور سے رگڑ ڈالا بالکل ویسے ہی جیسے بچپن میں رضیہ مچاڑ کر صابن سے ایسے رگڑ رگڑ کر دھلاتیں جیسے دھوبن کپڑوں کو رگڑتی تھی۔ستیا ناس آج اس کا دل وہ الفاظ بول رہا تھا جو اس نے خوابوں میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی اس کی زبان سے ادا ہوں گے۔

"بھیا آگے سے دائیں موڑ لینا۔" اس نے اکھڑے سے لہجے میں کہا۔

رکشے والا مستعدی سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اُس کا کوچنگ سینٹر گھر اور ریستوران کے درمیان میں تھا تو دس منٹ میں ہی وہ اپنی منزل پر موجود تھی۔ رکشے سے وہ تیز قدموں سے چلتی داخلی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ پرس میں پڑا موبائل گھوں گھوں کرنے لگا۔

بے دلی سے اس کا ہاتھ پرس کے اندر گیا اور توقع کے عین مطابق ریّان کا نمبر اسکرین پر چمک رہا تھا۔ رمشہ نے جھٹ سے لائن کاٹی اور فٹ سے موبائل آف کر دیا۔

کلاس کب شروع ہوئی، ٹیچر نے کیا پڑھایا کیا نہیں، کب وہ ایک میکانی انداز میں گھر کی طرف گامزن ہوئی اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بس ایک ہی احساس تھا اور وہ تھا متلی کا احساس۔ اُس کو ہمیشہ سے پان کھا کر سڑک پر تھوکنے والوں سے شدید گھن آتی تھی اور آج جن صاحب سے وہ عشق فرما رہی تھیں غالباً وہ انہی میں سے ایک تھے۔

گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں گئی جہاں طوبیٰ عصر کی نماز ادا کر رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ طوبیٰ کی دعائیں کتنی لمبی ہوا کرتی تھیں۔ جانے وہ کیا راز و نیاز کیا کرتی تھی اپنے رب کے ساتھ۔ لیکن جس سرعت سے رمشہ کمرے میں داخل ہوتے ساتھ ساتھ باتھ روم میں داخل ہوئی تھی طوبیٰ کو

اپنی دعائیں مختصر کرنی پڑیں۔

''خیریت؟'' طوبیٰ ابھی تک مصلّے پر بیٹھی اپنی انگلیوں کی پوروں پر اذکار کرنے میں مصروف تھی۔

''ہوں.....'' جواب مختصر تھا۔ رمشہ کے پھولے منہ سے طوبیٰ کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہ تھا کہ جس ارادے سے وہ نکلی تھی وہ پورا نہیں ہو پایا تھا۔

جب رمشہ کی طرف سے خلاف توقع کوئی جواب مزید نہ ملا تو طوبیٰ نے مزید کُریدنے سے اجتناب کیا اور مصلّیٰ تہہ کرنے لگی۔ اپنی یادداشت میں وہ صرف اس دن کو کھوج رہی تھی جب رمشہ نے کسی بات پر منہ پھلایا ہو اور دو منٹ سے زیادہ خاموشی اختیار کی ہو۔ جب بھی اس کے مزاج کے خلاف کچھ ہوا ہو اس نے کسی صورت اس کو تسلیم نہ کیا تھا۔ اور تو اور طوبیٰ کے سامنے ہی اس کے دل کی بھڑاس نکلتی تھی۔ لیکن آج کچھ انہونی ہی تھی۔

طوبیٰ کمرے سے باہر کسی کام سے جانا چاہ رہی تھی لیکن دانستہ یا نا دانستہ وہ ہر کام اس قدر دھیرے سے کر رہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مواقع رمشہ کو فراہم کرے۔ اس کے پیٹ میں اب مروڑ اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

''یا خدا۔ ایسا کیا ہو گیا ہے جو اتنے سالوں کی عادت کے برخلاف ایسا ہو رہا ہے؟'' طوبیٰ عجب مخمصے میں تھی۔ خاموش آتش فشاں کو چھیڑے یا خاموشی سے باہر نکل جائے۔

اُس نے بستر کے قریب جا کر آہستگی سے رمشہ کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ رمشہ آنکھیں میچے ضبط کی انتہاؤں پر تھی۔ طوبیٰ کو اب کہ سچ مچ تشویش ہوئی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' طوبیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ رمشہ سوتی بن رہی۔ طوبیٰ نے اس کو مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور پیچھے ہٹ گئی۔

''موبائل!'' طوبیٰ کے دماغ میں جھما کا سا ہوا ''کہیں چھن تو نہیں گیا یا ٹوٹ گیا..... ایک ہی چیز ہے جس سے اتنا بڑا صدمہ لگ سکتا ہے۔''

اُس نے لپک کر رمشہ کا بیگ اٹھایا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو موبائل ہاتھ میں تھا۔ طوبیٰ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ رمشہ کا موبائل اور آف؟ آج سورج مغرب سے ہی نکلا ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور بٹن دبا کر موبائل آن کر دیا۔

مختصر سی بیپ کے ساتھ ہی رمشہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' رمشہ نے کسی شیرنی کی طرح موبائل طوبیٰ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔طوبیٰ ایک لمحے تو ہکا بکا کھڑی رہی لیکن پھر اس کی تیوری پر بھی بل پڑ گئے۔

''تمیز نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

موبائل آن ہوتے ہی تواتر سے پیغامات موصول ہونے کی ناختم ہونے والی بیپ بجنا شروع ہوگئی۔ رمشہ نے بنا دیکھے موبائل کے بٹن پر کس کر ہاتھ رکھ دیا۔تواتر سے پیغامات کی وصولی اور موبائل کو آف کرنے کی زبردستی میں موبائل ہینگ ہوگیا اور اس نے اپنی زبان بند رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔

جب رمشہ نے طوبیٰ کو اپنی طرف پوری طرح متوجہ پایا تو تھوڑا پرسکون ہونے کی کوشش کی۔ اور واپس بستر پر بیٹھ گئی۔

''آج بینش کی سالگرہ نہیں تھی؟'' طوبیٰ بھی ہار ماننے والوں میں سے کہاں تھی۔ بڑے محتاط انداز میں اس نے تیر چلایا۔

''ہاں تھی،ختم ہوگئی۔''

''تصویریں لیں؟'' طوبیٰ اب بھی باز نہ آئی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس ایسے ہی۔''

''کون سا کیک تھا؟''

''یہ تم کیوں کسی تھانیدارنی کی طرح میرے پیچھے پڑی ہو۔ جا کر اپنا کام کیوں نہیں کرتیں؟'' طوبیٰ نے ایک گہرا سانس لیا۔

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ کوئی سالگرہ نہیں ہے۔'' رمشہ کو جیسے اچھو لگ گیا۔ بڑی مشکل سے اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

"ہاں!" جواب مختصر تھا اور مزید کسی بحث کی گنجائش بھی ختم ہوگئی تھی۔رمشہ نے ہار مان لی۔

''بھئی ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔''

طوبیٰ انتظار کرتی رہی کہ شاید پٹاری میں سے مزید کچھ نکلے گا لیکن رمشہ منہ لپیٹ کر لیٹ چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب رمشہ نے طوبیٰ کو حقیقت بتانے سے گریز کیا تھا۔ بتاتی بھی تو کیسے غلطی تو اپنی ہی تھی اور سب کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کرنا کہاں اس کی سرشت میں شامل تھا۔ ایک پیغام سے شروع ہونے والی داستان کی عمر ایک افسانے جتنی بھی ثابت نہ ہوئی تھی۔ کہانی تو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ اور یہ بات طوبیٰ کو بتانے کا مطلب تھا آ بیل مجھے مار۔ وہ جو پہلے ہی اس بات پر یقین نہ رکھتی تھی کہ محبت جیسی کوئی چیز دنیا میں نہیں ہوتی۔

''یہ تو صرف ایک بزنس ڈیل ہوتی ہے۔ کچھ لو کچھ دو۔ مال سمجھ آ رہا ہے تو لو ورنہ آگے بڑھ جاؤ۔ move on اسی کو تو کہتے ہیں۔''

طوبیٰ کی باتیں ابھی بھی اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔

''یہ لو.....'' چائے کا مگ ہاتھ میں تھماتے ہوئے طوبیٰ بستر پر بیٹھ گئی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو طوبیٰ.....محبت جیسی کوئی چیز دنیا میں نہیں ہوتی۔ سب لین دین ہے۔''

طوبیٰ خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

''تم ٹھیک کہتی تھی، ماں بھی تو اس اولاد کو زیادہ پیار کرتی ہے جو اسے زیادہ سکھ دیتی ہے، معاشرہ بھی اسی فرد کو سراہتا ہے جو اس کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ باقی کی تو دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ اور خدا..... خدا بھی تو اسی کو زیادہ پسند کرتا ہے جو اس کا اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوتا ہے۔''

طوبیٰ خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔ پھر کچھ پرسکون انداز میں بولی:

''نہیں..... خدا بے نیاز ہے۔ اسے ہماری محبت کی ضرورت نہیں۔ اس سے محبت کرنے کی ضرورت دراصل ہمیں ہی ہے۔ کیونکہ اسی میں فلاح ہے ہماری۔''

رمشہ یک ٹک اسے دیکھے گئی اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ شاید کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔

.....۞.....

''کب؟'' عائشہ کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں۔

وہ ایک دم پریشان ہوگئیں جب اسفر نے بتایا کہ گھر واپسی میں آج اس کا موبائل چھن گیا۔

''تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟'' وہ اٹھ کر اسفر کے پاس آ گئیں اور سر پر ہاتھ پھیر کر بغور جائزہ لینے لگیں۔

''نہیں کچھ بھی نہیں کہا۔ بس موبائل دے دیا اور وہ چلے گئے۔''

اسفر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا اس کے ساتھ ہوا ہے۔ صرف ایک اشارے پر اس نے کیسے اپنا موبائل کسی کے حوالے کر دیا۔ کیا وہ اس کو قدر خوفزدہ تھا کہ ذرا سی مزاحمت کا شائبہ بھی اس کے دماغ میں نہ آیا۔ عائشہ اب اس پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

''شکر ہے کہ اللہ کا اس نے جان بچالی میرے بچے کی۔'' اب وہ باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھیں۔

''جان کے ساتھ مال بھی بچا لیتا اللہ، وہ کیوں نہ بچایا۔'' اسفر نے طنزاً کہا۔

عائشہ نے ایک دھپ اس کے شانے پر رسید کی۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے، جان کا صدقہ مال ہوتا ہے۔'' وہ اب واپس اپنی جگہ پر بیٹھ چکی تھیں اور ان لٹیروں کو کوسنے میں مصروف تھیں۔

''خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔''

اسفر کچھ دیر خاموشی سے انہیں بڑبڑاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''خدا کیوں غارت کرے ہم کچھ کیوں نہ کریں؟'' اسفر نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ دی حالانکہ اس کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ اس کے نتائج کچھ اچھے نہ ہوں گے۔

حسب توقع عائشہ کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ ''بیٹا کیسی باتیں کر رہے ہو۔ اور آ جائے گا موبائل۔ جانے والی چیز تھی چلی گئی۔''

اسفر ابھی بھی مطمئن نہ تھا۔ پہلے پہل صرف شبہات اس کے دل میں جنم لیتے تھے، پھر وہ شبہات منطق کے ساتھ سوچوں کا روپ دھار گئے اور اب وقتاً فوقتاً جو لاوا اس کے اندر پک رہا تھا باہر اُبلنے لگا تھا۔

آخر کب تک وہ نہ سمجھ میں آنے والی باتوں پر اندھوں کی طرح تقلید کرتا۔ لیکن ایمان کی جو جڑیں اس کے اندر تک سرایت کی ہوئی تھیں، اس کی سوچوں کو یقین کا سفر طے کرنے میں مانع رکاوٹ حالات و واقعات کے سبب کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

.....۞.....

آج پھر کئی ہفتوں بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اسفر کے قدم کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک مقناطیسیت تھی اس سے جس سے وہ لاکھ دامن چھڑانا چاہتا تھا لیکن چھڑا نہیں پا رہا تھا۔ اس کو وکی کی باتوں میں حقیقت کے سوا کچھ نہ نظر آتا تھا لیکن آج وہ سوچ کر آیا تھا کہ اپنی ذات کی نفی کر کے ہی وہ وکی کو غلط ثابت کر دے گا۔

جو کچھ اس کے دماغ میں تھا وہ بس شیطانی خیالات تھے۔ بچپن سے یہی تو سنتا آیا تھا کہ جو بھی برا خیال آتا ہے وہ شیطان دماغ میں ڈالتا ہے۔ گو کہ وہ خود بھی شیطان کے ہونے یا نہ ہونے پر اب شک کا شکار ہو چکا تھا لیکن رات بھر جاگنے کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے عقائد پر سوال نہیں اٹھائے گا۔ جو ہے جیسا ہیں چلتا رہے گا۔

حسبِ معمول وکی کا چوتھا پیریڈ فری تھا اور اسفر نے اسی لیے اس وقت کا انتخاب کیا تھا حالانکہ کے اس وقت وکی سے ملنے کے لیے اُسے اپنا ایک اہم پیریڈ چھوڑنا پڑا تھا۔ ویسے بھی آج کل کہاں اس کی سمجھ میں پروفیسرز کے قصے آتے تھے۔ بس خالی الذّہنی کی کیفیت میں ہے وہ یونہی بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی دھیان بھٹکتا تو ٹیچرز کی آوازیں واپس آنے لگتیں ورنہ وہی کیا حقیقت کیا سراب کی جنگ تھی جو ہر وقت اس کے دماغ میں بپا رہتی تھی۔

''اسفر، میرے دوست!'' ہمیشہ کی طرف وکّی کا پرجوش استقبال کا انداز۔

''اس وقت یہاں کیسے؟ ابھی تو تمھاری کلاس ہوگی نا!''

ہاتھ ملا کر اسفر اس کے ساتھ ہی کچھ دور ڈیپارٹمنٹ کے باہر رکھی بنچ پر بیٹھ گیا۔

''باقی لوگ نظر نہیں آ رہے، وہ کہاں ہیں؟'' اسفر نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

''احمد آج آیا نہیں، خرّم لائبریری گیا ہے کوئی کتاب ایشو کروانی ہے اور عیسیٰ فراز کے ساتھ ہی ڈیپارٹمنٹ تک گیا ہے۔ اس نے ابھی تک اپنا اسائنمنٹ جمع نہیں کروایا تھا۔ سر سے منتیں کرنے گیا ہے؟'' وکی نے تفصیلی جواب دیا اور آخر میں ہنستے ہوئے ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلا لیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف ہاتھوں پر سنبھال لیا۔

ایک سکون تھا اس کے چہرے پر جس سے اسفر کو بے تحاشہ حسد محسوس ہوا۔

''اور سناؤ کیا چل رہا ہے سب؟'' پھر اچانک جیسے اس سے کچھ یاد آیا، تم نے نمبر بدل لیا ہے کیا؟ میں امتحانات کے بعد تمہیں رابطہ کر رہا تھا لیکن ہو نہیں پایا۔''

''ہاں میرا موبائل چھن گیا تھا۔'' اسفر نے مختصراً جواب دیا۔

''ارے، کب؟''

''بس پیپرز کے دوران، ایک پرانے دوست سے ملنے گیا تھا وہیں سے واپسی میں۔''

''چلو خیر ہوئی لا لے، تمہارا اللہ اور دے دے گا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہارا اللہ نہیں ہے کیا؟'' اسفر نے بڑی تحمل مزاجی سے اصل گفتگو کا آغاز کیا۔

''نہیں بھائی میرا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔''

اس کی سفاکی پر اسفر کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وکی مذہب سے بہت دور ہے اور اس کی اکثر باتوں سے اتفاق بھی تھا لیکن جب آج وکی نے جب صاف گوئی کی انتہا کر دی تو اسفر کے لیے یہ بات ہضم کرنا واقعی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

''مذاق مت کرو۔ ایسا کیسا ہو سکتا ہے؟'' اسفر نے اٹکتے ہوئے کہا۔ وکی کے سامنے اس موضوع پر بات کرتے اکثر ہی اس کی آواز لڑکھڑا جایا کرتی تھی۔ اس کی اکثر دلیلوں کے جوابات اسفر کے پاس نہ ہوتے تھے۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟'' وکی نے گردن موڑ کر اسفر کو گھورا۔ ''چلو مجھے بتاؤ، وہ کیا چیز ہے جو تمہیں یہ یقین دلاتی ہے کہ خدا موجود ہے؟''

اسفر اس سوال کے جواب کے لیے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ ''ظاہر سی بات ہے میں قرآن کی وجہ سے خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں قرآن کو وحی الٰہی کے مکمل صورت دیکھتا ہوں۔''

''اچھا'' وکی نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا

''تو بس تم ایک کتاب کی وجہ سے اس بات پر یقین کر لو گے کہ خدا موجود ہے؟ یعنی کوئی بھی شخص آ کر تمہیں ایک کتاب دے اور کہے یہ اللہ کی کتاب ہے تو مان لو گے؟''

اسفر کی کان کے لوئیں سرخ ہو گئیں۔ خدا کی ذات پر یقین بھلے ہی متزلزل ہو گیا تھا لیکن یہ سب کسی

سے کھلم کھلا سننا نا قابل برداشت تھا۔ اس نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پایا۔

''تم بھی تو فزکس کی اس کتاب میں لکھی ساری باتوں پر یقین کر لیتے ہو صرف اس وجہ سے کہ یہ ایک مستند لکھاری نے لکھی ہیں، تو تمہیں کیوں میرے قرآن پر یقین رکھنے پر اعتراض ہے؟''

وکی نے بڑے آرام سے نفی میں گردن ہلائی

''نہ! میں اس وجہ سے اس کتاب کے فارمولا پر بالکل یقین نہیں کرتا کہ یہ ایک مستند آدمی نے لکھی ہے۔ میں اس پر اس لیے یقین رکھتا ہوں کیونکہ اس میں سب کچھ ایک ثبوت کے ساتھ لکھا ہے۔ ہر بات کی توجیہ موجود ہے۔ مختلف تجربات کی روشنی میں ایک نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس لیے میں اس کتاب پر یقین کر لیتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے آ کر کہے کہ دنیا گول نہیں اصل میں چوکور ہے اور وہ اس کے ٹھوس ثبوت پیش کرے تو بلاشبہ میں اس پر یقین کر لوں گا۔ لاجک از ایوری تھنگ۔''

اسفر نے ایک مختصر سانس لی، وہ وکی کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ ''قرآن میں بھی حکمت ہے، رہنمائی ہے اور بہت سی ایسی معلومات ہیں جن کو سائنس نے چودہ سو سال بعد کہیں جا کر صحیح ثابت کر دیا ہے اور.....''

''اور بعض ایسے سائنسی معجزات بھی ہیں جن کی وضاحت انسانی علم سے نہیں ہو سکتی۔''

وکی نے درمیان ہی سے اسفر کی بات کاٹ دی اور پھر ایک گہرا سانس لیا:

''دیکھو میرے دوست! میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا کہ تم میری طرح سوچنا شروع کر دو جس طرح مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو میں نے خود ریسرچ کر کے جانی ہیں۔ میں بالکل قرآن کے اعتقاد کا متعرف ہوں لیکن میں ان مظاہر کی فطری وضاحتیں بھی کھوجتا ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیں۔ قرآن مجید میں جن باتوں یا سائنسی معجزات کا تذکرہ کیا ہے یا تو وہ بس کہانیاں ہیں جو نسل در نسل چلتی آ رہی تھیں اور کسی بھی شخص کے لیے ان کو دوبارہ لکھنا مشکل نہیں تھا اور رہے سائنسی معجزات تو ان کو اکثر اتفاقیہ یا پہلے سے موجود علم پر مبنی تشریحات سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن کیا تم کائنات کی وسعت اور اس میں جس ترتیب سے ہر پیچیدگی کو سلجھایا گیا، اس کو بھی جھٹلاؤ گے؟'' اسفر نے پوچھا ''یہ سب چیزیں اشارہ کرتی ہیں کہ انہیں بنانے والا کوئی ہے۔''

وکی ایک بار پھر نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ''یہ سچ ہے کہ کائنات نا قابل یقین حد تک پیچیدہ بھی ہے اور منظم بھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ پیچیدہ ہیں تو ضرور اس کو کسی نے بنایا ہی ہوگا۔''

تو تمہارے خیال میں آسان چیزیں خود بخود وجود میں آسکتی ہیں؟'' اسفر نے کھوکھلی آواز میں کہا اور اس کا مذاق اڑانے کی کوشش تھی جب کہ وہ اس حقیقت سے آشنا تھا کہ اس کی آواز کی طرح اس کے دلائل بھی کھوکھلے تھے۔

''اسفر، تم میری بات سمجھ نہیں رہے ہو، میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ پیچیدہ اور وسیع چیزیں بھی سادہ چیزوں کی مانند ارتقا اور فزکس کے قوانین کی صورت میں ابھر سکتی ہے۔ میں بھی پہلے ہی کہہ چکا ہوں ہر چیز کی ابتدا کہیں نہ کہیں سے ہوتی ہے۔''

اسفر نے ایک دم وکی کے بعد اچک لی ''یہی تو میں کہہ رہا ہوں، زندگی کی ابتدائی کہیں نہ کہیں سے ہوتی ہے اور وہ ابتدا کرنے والا خدا ہی تو ہے۔''

''زندگی کی ابتدا کی تحقیق پر بہت کام ہو چکا ہے اور ابھی بھی اس پر کام جاری ہے۔ سائنسدان ابیوجینس (abyogenesis) کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ کسی حد تک کامیابی بھی پا چکے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس سے زندگی کسی بے جان چیز سے سے بھی جنم لے سکتی ہے۔ اگر ابھی اس بات کا ثبوت نہیں ہے تو ثبوت تو اس بات کا بھی نہیں ہے کہ اس کی ابتدا کرنے والا موجود ہے۔''

اب کے اسفر کے پاس بھی جواب نہ تھا۔ وہ کیا کہتا کہ اللہ پر اس کو اس لیے یقین ہے کیونکہ بچپن سے اسے یہی بتایا گیا ہے۔ اس نے کبھی اُس عظیم ہستی کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ یہ گناہ ہے، سوال کرنے کو ہمیشہ غلط بتایا گیا ہے۔ آخر مبہم آواز میں اس نے آخری دلیل بھی دے دی۔

''مجھے اس بات سے سکون ملتا ہے کہ مجھے کسی نے تخلیق کیا ہے اور اس دنیا میں آنے کی کوئی وجہ ہے۔''

وکی نے اب باقاعدہ اس کا بغور جائزہ لیا۔ بڑھی ہوئی ہلکی شیو، آنکھوں کے گرد حلقے، میلے پچیلے کپڑے اور اتری ہوئی صورت بالآخر وکی کی ہنسی چھوٹ گئی اور ابھی تک وہ جو انتہائی مطمئن اور سوبر انداز میں سوالوں کے جواب دے رہا تھا، اسفر کا بے تحاشہ تمسخر اڑا رہا تھا اور دہرا ہوئے جا رہا تھا۔

"ویسے تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا نہیں ہے کہ تمہیں ایسی بات سے سکون مل رہا ہے۔'' اس نے ہنستے ہنستے بمشکل یہ جملہ ادا کیا اور ایک بار پھر ہنسی سے دہرا ہو گیا۔

اسفر اس کو خاموشی سے تکتا رہا۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ اس کو ایسے مات ہوگی کہ وہ بغلیں جھانکنے لگے گا۔ اس کا دل چاہا وہیں سارے خیالات پر لعنت بھیج کر اٹھ کر وہاں سے چلا جائے لیکن وکی کی بات کو رد کرنا فی الوقت اس کے بس میں نہیں تھا۔

''دیکھو یار، تم کو میں ہمیشہ تذبذب کے عالم میں دیکھتا ہوں، میں تمہاری حالت کو سمجھ سکتا ہوں کیونکہ اس سب سے میں قریباً آٹھ ماہ پہلے گزر چکا ہوں، لیکن بالآخر میں نے حقیقت جان لی اور سکون پا لیا ہے۔ میرے نزدیک اعلیٰ مقصد کی عدم موجودگی، زندگی کے خوبصورتی کو کم نہیں کرتی۔''

اسفر نے کندھے اُچکا دیے۔ وکی کو اسفر کے ذہنی کیفیت کا بہت اچھے سے اندازہ ہو رہا تھا۔ اسفر کی خاموشی اس کے اندرونی خلفشار کی غماز تھی۔

وکی کو اس پر ترس آیا۔ بالکل اسی طرح وہ بھی ایک عذاب میں مبتلا تھا۔ وہ جتنا زیادہ باریکیوں کو کھوجتا اتنا زیادہ الجھتا جاتا لیکن بالآخر سوشل میڈیا پر اس کے کچھ ہم خیال دوستوں نے اس سے اس بے بسی کی دلدل سے نکال لیا تھا۔ انٹرنیٹ ایک ایسی جادوئی زنبیل تھی جس میں ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔ بس چند کلکس کی دیر تھی اور اس جیسے ہزاروں لوگ اس کے سامنے آ گئے۔ خدا ہے یا نہیں، لاکھوں لوگ اس بحث میں مبتلا تھے اور اکثریت خدا کے وجود کی انکاری تھی۔ سائنسی توجیہات ہر بات کا جواب دے رہی تھیں۔

دوسری طرف اخلاقیات کی کل ذمہ داری بجائے شیطان کے انسان کے اپنے سر ڈال دی گئی تھی۔ وکی نے راہِ نجات پالی تھی۔ وہ اب ایک ملحد تھا لیکن اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ باقاعدہ اعلان کرنے کی صورت میں شاید اس کو نئی صبح کا سورج بھی دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

اس نے دھیمے سے اسفر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسفر کا دل چاہا وکی کا ہاتھ جھٹک دے اور وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن کس بنیاد پر وہ ایسا کرتا؟ اس کے پاس وکی کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

''ان سوچوں سے نہ لڑو اسفر، ان کے ساتھ بہتے جاؤ۔ جب تم یہ مان لیتے ہو کہ خدا اور شیطان جیسی کوئی طاقت موجود ہی نہیں تو یقین جانو تم ایک بہتر انسان بن سکتے ہو۔''

اسفر کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا اور وہ بے ساختہ بول پڑا۔ ''کیا ہوگا اگر لوگوں کو خدا ڈر نہ ہوگا؟ وہ اپنی من مانی کریں گے، اخلاق تو خدا کے قانون سے ہی آتا ہے۔''

"ڈر ہی کا تو کھیل ہے لالے،" وکی کا ایک بار پھر موڈ میں آ چکا تھا اور اب اپنی جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر اس کو کھول رہا تھا۔ اسفر کو لگا وکی چیونگم کا پیکٹ نہیں بلکہ اس کی پرتیں کھول رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک۔ کچھ ہی لمحوں میں سفید رنگ کی اجلی خوشبودار چیونگم وکی کے ہاتھ میں تھی۔ اسفر یک ٹک چیونگم کو دیکھتا رہا۔

وکی نے چیونگم کے اوپر لگے باریک سے جھلّی نما ریپر کو بھی اتار پھینکا۔

''میرے نزدیک اس حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد کہ خدا جیسی کوئی ہستی موجود نہیں ہے انسان زیادہ راست باز بن جاتا ہے۔ اس کے اندر جب ڈر اور خوف نہیں ہوتا تو اس کی جگہ ذمہ داری لے لیتی ہے۔ خواہ وہ ذاتی تعلقات ہوں، علم کا حصول ہو یا معاشرے پر ایک مثبت تاثر قائم کرنا، ہر بات کا ذمہ دار بس میں ہوں کوئی اور نہیں۔'' وکی نے چیونگم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور ایک حصہ اسفر کی طرف بڑھا دیا۔

''اخلاقیات کیا مذہبی لوگوں کے پاس ہوتی ہیں؟ تم مجھے بتاؤ کیا مذہب لوگ ہی سب سے زیادہ فساد نہیں کرتے؟ پائنچے ٹخنوں سے اونچے، چہرے پر ڈاڑھیاں اور بیوی بچوں پر تشدّد۔ نہ ٹریفک قوانین کی پابندی اور نہ ہی سڑکوں پر نقش و نگار بنانے پر کوئی شرمندگی۔ اپنے آس پاس دیکھو تو سب سے زیادہ نڈر تمہیں مذہب کا شور مچانے والے ہی نظر آئیں گے۔ چاہے مدرسہ ہو یا سیاست کا میدان، ان مذہب کے نام پر لوگوں کی عزت و ناموس پامال کرتے تمہیں کئی لوگ نظر آئیں گے جن کو تمہاری لاجک کے مطابق سب سے بلند مقام پر ہونا چاہیے۔"

اسفر نے چیونگم منہ میں ڈالی اور کڑوا ذائقہ خوشگوار مٹھاس میں بدل گیا۔ اس نے وکی کے خیالات کی تردید نہیں کی۔ اس کی خاموشی وکی کے لیے اشارہ تھی کہ وہ اپنی بات جاری رکھ سکتا ہے۔

''اپنا تو ایک ہی اصول ہے بھائی!'' وکی نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا، ''انسانیت۔ یہی میرا مذہب بھی ہے اور دین بھی۔ کر بھلا تو ہو بھلا!''

وکی نے بانگ لگائی تو اسفر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اُسے یاد نہیں تھا وہ آخری بار کب مسکرایا تھا لیکن آج وہ ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آزاد فضا میں سانس لینا اسے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

''سوال اٹھانا اور اپنے عقائد کا ازسرِنو جائزہ لینا سمجھ بوجھ کا ایک حصہ ہی ہے۔''

آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور دھوپ کی تمازت کے ساتھ روشنی بھی دھیرے دھیرے مدھم ہو رہی تھی۔

...۞...

خوش ہونا تو طوبیٰ نے چھوڑ ہی دیا تھا اور با آواز ہنسنا تو شاید منع تھا اسے۔ اس کی خوشی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ خلاؤں میں گھور نہ رہی ہو اور نارمل انداز میں بات چیت کر رہی ہو۔ ہمیشہ سے تو وہ ایسی نہ تھی۔ لیکن بیس کے اوائل میں آنے سے پہلے ہی کسی لڑکی کا اتنا سنجیدہ ہو جانا یقیناً اس کے چاہنے والوں کے لیے فکرمندی کا سبب تھا۔

اُس کا آرٹیکل جس میں اُس نے ایک بہت بڑے Scam کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی تھی کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا سکا تھا۔

اب پتا نہیں یہ اچھا تھا یا بُرا لیکن طوبیٰ کے اندر تھوڑی اور تباہی ضرور مچا گیا تھا۔

رواں ہفتہ طوبیٰ کو یونیورسٹی کی طرف سے لیپ ٹاپ ملا تھا۔ یہ اس اسکیم کا نتیجہ تھا جو کچھ عرصہ پہلے ہی اچھی کارکردگی دکھانے والے طلباء کو بذاتِ خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے چلائی گئی تھی جس میں کچھ تعلیمی بہبود کے اداروں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔ طوبیٰ کا نام ان پچاس طلباء میں سولہویں نمبر پر تھا جنہوں نے یہ لیپ ٹاپ حاصل کیا تھا۔

طوبیٰ آدھی رات کو بھی لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ پر تجسس آنکھوں سے وہ اب تک درجنوں ویب سائٹس دیکھ چکی تھی لیکن اب تک اپنی مطلوبہ معلومات حاصل نہ کر پائی تھی۔

کمرے کی لائٹ روشن دیکھ کر رضیہ بیگم چلی آئیں۔

''ابھی تک جاگ رہی ہو، بیٹا؟ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔ سو جاؤ جا کے۔''

''ہاں بس جا رہی ہوں۔'' طوبیٰ نے مصروف انداز میں جواب دیا اور پھر ایک نظر اٹھا کر رضیہ کو دیکھا "میں تو روز ہی دیر تک جاگ کر پڑھ رہی ہوتی ہوں بلکہ اس سے زیادہ دیر تک۔" اس نے سوالیہ نظروں سے رضیہ کی طرف دیکھا۔

رضیہ اس کے ساتھ ہی بستر پر بیٹھ گئیں۔ ''ہاں وہ تو ہے، بس ایسے ہی کہہ رہی تھی۔''

''اگر آپ کو لگ رہا ہے کہ میں وقت ضائع کر رہی ہوں تو ایسا بالکل نہیں ہے۔''

طوبیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

رضیہ چپ سی ہوگئیں۔ وہ طوبیٰ کے آگے سے آگے بڑھنے کی لگن سے اب کچھ پریشان ہونے لگیں تھیں۔ وہ خود ایک صابرہ اور شاکرہ تھیں اور ہمیشہ یہی سبق انہوں نے اپنی اولاد کو پڑھایا تھا لیکن ان کی اولاد کے نزدیک اب دنیا میں رہنے ہنسنے اور جینے کے طریقے بدل گئے تھے۔ جوان اولاد کے آگے وہ زیادہ تو کچھ نہ بولتیں، ہاں اپنا مؤقف ضرور سامنے رکھ دیتی تھیں۔

''میں جانتی ہوں میری بچی'' رضیہ کے لہجے میں زمانے بھر کی محبت تھی اور ممتا کے آگے کہاں کوئی زورہ آور رہا ہے۔طوبیٰ کو بھی اپنے لہجے کی سختی پر تاسف ہوا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور سر مسہری کی پُشت پر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کیے دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

''بس میں چاہتی ہوں میں، بہت جلدی بہت امیر ہو جاؤں۔ اتنی سخت روٹین سے اب میں تھک رہی ہوں۔''

رضیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہوگئیں۔ انہیں پتا تھا طوبیٰ چڑ جائے گی۔''جو ہے اسی پر قانع رہو'' یہ ایک ایسا جملہ تھا جس سے اسے نفرت تھی۔

''میں ایک بہتر زندگی چاہتی ہوں یا شاید بہترین، مجھے فرق نہیں پڑتا کہ یہ کیسے ہوگا، بس ہو جائے۔''

رضیہ نے طوبیٰ کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ جب کوئی اپنی دی گئی نعمتوں پر قانع نہ ہو اور یونہی خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے تو ایسے ہی ہلکان ہوتا ہے۔لیکن یہ بات وہ طوبیٰ سے کہہ نہ پائیں۔ اس وقت انہوں نے خاموشی سے سننا ہی مناسب سمجھا۔

میں بہترین زندگی چاہتی ہوں جہاں مجھے خرچ کرنے سے پہلے سوچنا نہ پڑے، مجھے رکشوں اور بسوں کے دھکے نہ کھانے پڑیں، میں کسی کی قیمتی چیز دیکھ کر لاحول پڑھ کر اپنے دل میں آنے والے حسد کو نہ دباؤں۔ مجھے زندگی سے سب چاہیے۔ سب کچھ۔''

رضیہ کو وہ ایک ضدی بچے کی طرح لگی جسے ہر قیمت پر اپنی من پسند چیز چاہیے تھی۔

''طوبیٰ، زندگی ہمیں ہمیشہ ہمیں موقع دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔لیکن جب کچھ لوگ غلط طریقوں سے نفع کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ منہ کے بل گر جاتے ہیں جبکہ دھیمے دھیمے ترقی کرنے والے، ایمانداری کا پاس رکھنے والے دائمی کامیابی پا لیتے ہیں، وقتی فائدے کے لیے پوری زندگی داؤ پر لگا دینا سراسر بیوقوفی ہے۔''

طوبیٰ نے لب بھینچ لیے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بالآخر وہ بول پڑی۔

''دھیرے دھیرے چلتے چلتے بوڑھی ہو جاؤں گی میں۔ اس عمر میں وہ سب پانے کا کیا فائدہ جس کو خرچ کرنے میں مزا بھی باقی نہ رہے۔''

''چلو پھر کسی امیر کبیر بوڑھے آدمی سے شادی کرا دیتے ہیں تمہاری۔'' رمشہ جو ان دونوں کی گفتگو سے جاگ چکی تھی جمائی روکتے ہوئے بولی۔

''ہٹ، بے شرم!'' رضیہ نے ہنستے ہوئے اسے گھُرکا۔

رمشہ اب اٹھ کر بیٹھ گئی اور بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی ''ویسے آپ لوگوں کو اس قدر گھمبیر گفتگو کرنے کے لیے اور کوئی وقت نہیں ملا؟ اب ایسے وقت میں اور اس طرح کے حالات میں ایسے ہی آئیڈیاز آئیں گے دماغ میں، ویسے میں نے کچھ غلط نہیں کہا، آپ لوگ اس تجویز پر عمل کر سکتے ہیں۔ طوبیٰ کو ڈھیر سارا پیسہ چاہیے اور وہ بھی جلد از جلد، اس سے بہتر تجویز کیا ہو سکتی ہے۔''

''اچھا بس رہنے دو یہ بے شرمی کی باتیں۔ شادی ایک پاکیزہ رشتہ بنانے کا نام ہے بزنس کرنے کا نہیں۔'' رضیہ نے رمشہ کو خاموش کرا دیا۔

''نہیں امی، رمشہ ٹھیک کہہ رہی ہے، طوبیٰ نے پُرسوچ انداز میں کہا، چوری ڈاکا یا فراڈ کرنے سے بہتر یہ نہیں کہ آپ تھوڑا کمپرومائز کر لیں اور اچھی بزنس ڈیل کر لیں۔ شادی بھی بزنس ہی تو ہے۔ وفاداری لو، وفاداری دو اور دھوکے کے بھی کسی بھی عام کاروبار کی طرف ممکنات موجود ہیں۔''

رضیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اپنی ہونہار اور معصوم بچیوں کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر انہیں اندازہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔

''میں تو تھک گئی ہوں اب اس طرح کی زندگی گزارتے، میں وہ کچھ کرنا چاہتی ہوں جس کی لوگ صرف خواہش ہی کر سکتے ہوں۔ میں دنیا دیکھنا چاہتی ہوں، اڑنا چاہتی ہوں۔ شادی کسی سے بھی ہو ایک جوا ہی ہے۔ تو اپنی مرضی کا نمبر منتخب کیوں نہ کریں۔ نمبر لگ گیا تو وارے نیارے ورنہ صبر کی دوا تو ہم ہمیشہ سے ہی کرتے آئے ہیں۔''

''بس کر دو اب تم دونوں یہ بیکار کی باتیں۔ حد ہو گئی ہے۔ شکر ادا کرو اللہ نے اتنا نوازا ہے، سر پر چھت ہے، اچھا کھاتی ہو، اچھا پہنتی ہو، تعلیم حاصل کر رہی ہو.....'' ابھی رضیہ اور بھی بہت کچھ کہنا

چاہتی تھیں لیکن رمشہ منہ پر چادر لپیٹ کر لیٹ چکی تھی اور طوبیٰ اپنی کتابیں کھول رہی تھی۔

''میں مذاق کر رہی تھی امی مجھے تو شادی کرنی ہی نہیں ہے۔''

رضیہ نے تاسف سے اپنی لڑکیوں کو دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب اولاد کو ماں باپ پرانے خیالات کے لگنے لگتے ہیں۔ رضیہ کو اندازہ ہوا وہ وقت آن پہنچا تھا اُن کی سوچ سے پہلے ہی۔

...۞...

وکی سے ہونے والی آخری ملاقات کے بعد سے اسفر کے اندر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وہ اب انتہائی پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ایسا جیسے کسی پنجرے سے آزاد ہو گیا ہو اور آس پاس کھلی فضا ہو، طوبیٰ اس کو اب بھی بہت یاد آتی تھی، نہ جانے کیا تھا اس میں ایسا کہ اسفر آج دو سالوں بعد بھی اس کے سحر سے نکل نہ پایا تھا۔ کتنے ہی سال اس نے طوبیٰ سے خاموش محبت کی تھی۔

''کاش..... میں نے کبھی اسے نہ بتایا ہوتا اور ایسے ہی اس محبت سے اپنے آپ کو سینکتا رہتا۔''

آج یونیورسٹی سے چھٹی لی تھی کیونکہ عائزہ کی رپورٹس لے کر ڈاکٹر کو دکھانی تھیں۔ وہ اور عائشہ ایک ٹھنڈے کمرے میں بیٹھے تھے۔ بڑی سی میز پر چند میڈیکل فائلز رکھی ہوئی تھیں اور پیچھے براجمان چالیس کے اوائل میں سفید کوٹ میں ملبوس خوش شکل ڈاکٹر بغور رپورٹس کا مطالعہ کر رہی تھی۔

عائشہ بے آواز دعائیں پڑھتی جا رہی تھیں۔ دل میں کچھ کھٹکا تھا لیکن انہوں نے دعاؤں کے غلاف میں خود کو مکمل طور پر لپیٹ رکھا تھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ، رپورٹس ٹھیک ہیں؟'' عائشہ کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ڈاکٹر عندلیب نے ایک گہرا سانس لیا اور مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ ''سب ٹھیک ہے'' کا عندیہ دیا۔

''بس تھوڑی پیچیدگیاں ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

''آپ میرے ساتھ باہر آیئے۔''

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر عندلیب رپورٹس ہاتھ میں لیے باہر نکل گئیں اور اسفر سن جسم کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کاریڈور میں آ گیا۔ ایک عجیب سی سرسراہٹ جسم میں محسوس ہوئی۔ کاریڈور کمرے جتنا ٹھنڈا نہیں تھا لیکن بہت گرم بھی نہیں اس کے باوجود اسفر کو محسوس ہوا اس کی پیشانی پر پسینہ تھا۔

''سوری میں نے نام نہیں پوچھا آپ کا؟'' ڈاکٹر عندلیب نے بڑے ہی پروفیشنل انداز میں کہا۔

''اسفر!'' سرعت سے جواب آیا۔

''اسفر صاحب! مجھے افسوس ہے رپورٹس زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں، مس عائزہ کو کینسر ہے۔''

اسفر کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو، بے اختیار ہی اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ جب حلق میں کانٹے پڑ جائیں تو تھوک نگلنا بھی کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

''کینسر!'' اسفر کے منہ سے بمشکل آواز نکلی..... ''کون سی اسٹیج ہے؟'' اسفر کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''اسٹیج ٹو، اووری کینسر، الحمدللہ ہم یہ بات جلدی جان گئے ہیں یہ بات ہمارے لیے کافی حوصلہ افزا ہے۔ لیکن بہت جلدی اس کا علاج شروع کر دینے کی ضرورت ہے۔ کیموتھراپی سے شروع کریں گے۔ مجھے اندازہ ہے یہ آسان نہیں ہوگا لیکن امید کرتی ہوں ہمیں مثبت نتائج ملیں گے۔'' ڈاکٹر عندلیب انتہائی پروفیشنل انداز میں اسے مکمل صورتحال سے آگاہ کر رہی تھیں۔

اسفر نے میکانکی انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا اور بمشکل آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ضبط کیا۔

''وہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا!'' اسفر کو اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر عندلیب نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ''اسفر ہر کیس مختلف ہوتا ہے اور حتمی طور پر یہ بات کہنا پیشہ وارانہ نہیں، ہاں لیکن دعائیں قسمت بدل دیتی ہیں۔ بس آپ دعا کے ساتھ ساتھ علاج کریں۔ مکمل علاج سے اور گھر والوں کے بلند حوصلوں سے ہم یہ جنگ ضرور جیت جائیں گے۔ آپ اپنے آپ کو اس میں اکیلا نہ محسوس کریں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

اسفر نے ایک گہرا اور لمبا سانس کھینچا اور مکمل طور پر اپنے آپ کو ممکنہ صورتحال کے لیے تیار لیا۔

''بہت شکریہ ڈاکٹر!'' اسفر نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''اسفر یاد رکھیں اب میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے، جذباتی سہارے کے لیے مختلف گروپس ہوتے ہیں، آپ کی راہنمائی کے لیے ہر طرح کی مدد میسر ہے، کینسر اب لاعلاج نہیں ہے، بس آپ اللہ سے اچھی اُمید رکھیں۔''

اسفر رپورٹس کو گھورنے لگا جواب اس کے ہاتھ میں تھیں۔

''اس چیز سے کیسے امید رکھوں جس کا وجود ہی نہیں۔'' اس نے نخوت سے سوچا۔'' عائزہ علاج سے ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے اپنے آپ کو یقین دہانی کروائی اور ڈاکٹر عندلیب کے پیچھے واپس کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ خبر کسی طرح عائشہ کو سنانی ہے وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عائشہ نے عجلت سے پوچھا''ڈاکٹر صاحبہ سب خیریت تو ہے نا!'' ان کے لہجے میں ہزار خدشے چھپے تھے۔

''جی جی، میں نے مسٹر اسفر کو تفصیل بتا دی ہے۔ جلد ہی ہم علاج شروع کریں گے اور انشاءاللہ عائزہ مکمل صحت یاب ہو جائیں گی۔''

عائشہ ڈاکٹر عندلیب کے جواب سے مطمئن تو نہ ہوئی تھیں لیکن پھر بھی کچھ پوچھے بغیر خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اسفر کی امید کے برخلاف کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اسفر کا خیال تھا وہ ضرور ضد کریں گی کہ انہیں بتایا جائے ان کی چہیتی بیٹی کو کیا ہوا ہے یا ڈاکٹر نے کمرے کے باہر ہی اسفر کو سب کچھ کیوں بتایا۔

اسفر بھی سُرعت سے ان کے پیچھے ہو لیا۔ ہسپتال سے باہر نکلتے ہی انہوں نے کار پارک کے مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا۔

''امی! گاڑی اس طرف ہے۔'' اسفر نے ان کو روکنا چاہا۔

''مجھے معلوم ہے بیٹا!'' ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے پر اسفر کو اچنبھا ہوا۔

عائشہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ کے پاس جا پہنچیں وہ کمزور سا بزرگ ہلکے لیکن صاف ستھرے شلوار قمیض میں ملبوس ایک بڑی ٹوکری لیے بیٹھا تھا جس پر طرح طرح کے کانچ کے ڈونگے رکھے تھے۔ جیسے ہی کوئی بڑی گاڑی آتی وہ بڑی مشقت سے اپنی ٹوکری اٹھاتا اور سنبھالتا ہوا اس گاڑی کے پاس جا پہنچتا۔

اسفر عائشہ کے ساتھ چند ہی بار آیا تھا لیکن اس آدمی کو ہر مرتبہ اس جگہ پایا تھا۔ عائشہ نے پانچ سو کا نوٹ اس شخص کی طرف بڑھایا تو اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر اسفر ایک لمحے کو لرز سا گیا۔ ایسا لگا جیسے سرمئی رات میں کوئی بجلی کوندی ہو۔

''کون سا مگا چاہیے آپ کو۔'' وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔

''میری بیٹی بیمار ہے، بس اس کے لیے دعا کر دیں۔'' عائشہ کی رندھی ہوئی آواز نے اسفر کا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔

''کیا امی نے ڈاکٹر عندلیب کی تمام باتیں سن لی ہیں؟'' اسفر کے دماغ میں اِک دم جھماکا ہوا۔''لیکن دروازہ تو مکمل طور پر بند تھا۔نہیں ایسا ممکن نہیں۔''اس نے اپنے خیال کی زوردار تردید کی۔''تو پھر.....'' وہ سخت پریشان ہوا کہ عائشہ کیسے جان سکتی تھیں کہ عائزہ کی بیماری کی نوعیت کیا تھی۔

"اس بابا جی کو پیسے دینے سے اگر مریض ٹھیک ہوتے تو یہ خود کسی ہسپتال کے مالک ہوتے۔امی بھی نا بے کار اب صدقے خیرات میں پیسے خرچ کریں گی۔اب تو ہمیں ایک ایک پائی کی اشد ضرورت ہے۔'' اسفر سخت کوفت میں مبتلا ہوا۔

فٹ پاتھ پر کھڑا شخص اپنی ٹوکری اب زمین پر رکھ چکا تھا اور باقاعدہ دونوں ہاتھ اٹھائے بڑے جذب کے ساتھ دعا مانگ رہا تھا۔

''امی کیا ضرورت تھی اتنی زیادہ بھیک دینے کی؟'' اسفر نے چھوٹتے ہی کہا۔

عائشہ نے سخت لہجے میں تردید کی،''وہ بھیک نہیں میری عائزہ کا صدقہ ہے، جو میں نے ایک حقیقی مستحق تک پہنچایا ہے۔''

''آپ کو بڑا پتا ہے یہ بابا جی مستحق تھے؟'' اسفر نے چڑتے ہوئے کہا۔

''بیٹا انسان کی نظر ہونی چاہیے۔اگر انسان اپنے تمام حسیات اور شعور کو بروئے کار لائے تو حقیقی مستحق تو کیا، ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جائے۔''

اسفر ایک لمحے کو چونک گیا۔لاکھ ہمت جُٹانے کے بعد بھی اسے ابھی تک یہ حوصلہ نہ ہوا تھا کہ وہ کسی اور کے سامنے اس بات کا تذکرہ کرتا کہ اس کی آنکھیں کھل چکی ہیں اور وہ ایک حقیقت شناس شخص ہے،لیکن جب بھی ممکنہ نتائج کے بارے میں سوچتا تو چپ سادھ لیتا،عقلمندی اسی میں تھی کہ خاموش رہا جائے، جو لوگ برسوں ایک عقیدہ پر کاربند رہے ہوں ان کو ان کے عقیدے سے پھیرنا یا پھر قائل کرنا اتنا آسان نہ تھا کجا یہ کہ اِن نازک حالات میں ان کو اور پریشان کیا جاتا۔اسفر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی عائشہ خاموش تھیں۔ اسفر نے گردن موڑ کر ان کا جائزہ لیا۔ چہرے پر اداسی کے آثار رقم تھے لیکن اگر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حد سے زیادہ پریشان تھیں تو بالکل غلط ہوتا۔

''آپ پوچھیں گی نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا؟'' اسفر کو عائشہ کا ردعمل اب چبھنے لگا تھا۔

''جب ڈاکٹر تمہیں کمرے سے باہر لے گئیں تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ عائزہ کی رپورٹس حوصلہ افزا نہیں ہیں۔'' ایک گہرا سانس لینے کے بعد آنکھوں کے گیلے کنارے وہ انگلی کی پوروں سے خشک کرنے لگیں۔ بغیر گردن موڑے بھی اسفر جانتا تھا کہ وہ آنسو روکنے میں ناکام ہیں۔ جتنی بہادری کا مظاہرہ وہ کر چکی تھیں۔ اسفر کے لیے وہی بہت تھا۔

گھبرانے کی بات نہیں، ابھی کینسر اسٹیج ٹو پر ہی ہے، ٹریٹمنٹ سے جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' اسفر یہ کہنا چاہتا تھا لیکن کینسر کا نام زبان پر لانے سے پہلے ہی جیسے زبان سوکھی لکڑی ہو گئی تھی، شاید اس وقت چُپ رہنے ہی میں عافیت تھی۔

.....۞.....

وہ حسب معمول ایک نئے آفس میں کئی نوجوان امیدواروں کے درمیان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی پچھلے دو مہینوں کا یہ معمول اعصاب شکن بن چکا تھا۔ دبیز صوفوں پر بظاہر آرام دہ حالت میں براجمان نوجوانوں کے دل کا حال وہ بخوبی جان سکتی تھی۔طوبیٰ ایک بت کی مانند سیدھی بیٹھی تھی اور نظریں سامنے موجود ایک خوبصورت دروازے پر مرکوز تھیں۔ اس بند دروازے کے پیچھے کئی چھوٹے چھوٹے فرعون موجود تھے جو ہر بار بڑی بے دردی سے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔

ان دو مہینوں میں وہ اَن گِنت انٹرویوز دے چکی تھی۔ مسکراتے چہرے، اس کی ہر حرکت کو جانچتی نگاہیں، اس کے خدوخال کو تولتے مشاہدے، لب و لہجے کو پرکھتی سماعتیں اور اس پر پنجرے میں بند پھڑ پھڑاتا اس کا دل۔طوبیٰ چپ چاپ آس پاس بیٹھے امیدواروں کے چہرے پڑھ رہی تھی لیکن یہ تجزیئے آنکھوں سے آگے کہیں نہیں جا رہے تھے۔آخر وہ سب اس کے حریف تھے۔

اُس نے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو فون پر کچھ ہدایات سن رہی تھی۔فون بند کر کے وہ دوبارہ اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گئی۔

''مصروفیت بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔''اس نے دل میں سوچا۔

''مریم افتخار، برائے مہربانی تشریف لے آئیں۔'' ایک ٹک ٹک سے تیار لڑکی اپنا پرس اور فولڈر سنبھالتی کاؤنٹر تک آئی۔ کچھ گفت وشنید کے بعد اس کو خوبصورت دروازے سے اندر بھیج دیا گیا۔ طوبیٰ نے فون پر رسیپشنسٹ کو تقریباً گڑگڑاتے ہوئے سنا۔

''چائے تو پلوا دو سر درد سے پھٹ رہا ہے۔'' فون بند کر کے پیشانی پر انگلیاں مسلتی وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو چکی تھی۔ نہ جانے کیوں طوبیٰ بس یک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

اس کی زندگی کی بھی کوئی کہانی ہوگی۔ مجھ سے کچھ مختلف۔شاید اسے بھی زندگی سے کچھ شکایتیں ہوں

گی میری طرح۔ پتا نہیں کبھی اس کی شکایتوں کی سنوائی ہوئی ہو گی یا نہیں؟''

اپنی سوچوں میں غلطاں وہ یونہی بیٹھی تھی جبکہ آس پاس نوجوان اپنے اپنے موبائلز میں مگن تھے۔طوبیٰ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان سب کے بیچ اپنا پرانا بٹن والا موبائل نکالنا اپنا مذاق بنانے کے مترادف تھا۔ وہاں اکثریت کھاتے پیتے گھروں سے آئے ہوئے نوجوانوں کی تھی۔ کچھ بے حد اسٹائلش اور گلیمرس اور کچھ شاید اُن جیسا بننے کی کوشش میں مصروف۔ان سب میں وہ ان چند لڑکیوں میں سے تھی جنہوں نے دوپٹا لے رکھا تھا اور ان میں بھی وہ واحد تھی جس کے سر پر موجود تھا۔

''طوبیٰ اکبر!'' بالآخر اس کا نام پکارا گیا۔حسبِ معمول ''نصر من اللہ و فتح قریب'' کا ورد کرتی وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی زبان ان الفاظ کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اسے اب احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اس کے لب حرکت میں مصروف ہیں۔ستم یہ تھا کہ بس الفاظ اپنے معنی کھو چکے تھے۔ امیدیں دم توڑ رہی تھیں اور ارادے مضمحل ہو چکے تھے۔

پچھلے تمام دنوں کی طرح وہ بھی ایک ناکام دن تھا۔ وہ اس کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اُسے یہ سوچنا ہی عجیب لگتا تھا کہ جب اسے کامیابی کے نوید ملے گی تو وہ کیسا محسوس کرے گی۔ بی بی اے کے بعد ہی اس نے نوکری کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اکبر اور صدیق نے اس کی بھرپور مخالفت کی تھی لیکن ماسٹر کی فیس پورے وقت پر جمع نہ ہو سکنے کی صورت میں ایک سال کا وقفہ مصلحت بن گیا تھا۔

وہ اسٹاپ پر کھڑی اب دوسری بس کا انتظار کر رہی تھی جو گھر تک جاتی تھی۔

دو مہینے پہلے جب وہ نک سک سے تیار پہلا انٹرویو دینے نکلی تھی تو رکشہ بک کرواتے ہوئے بہت پرجوش تھی۔صرف اٹھارہ دن بعد ہی اسے سمجھ آ گئی تھی کہ صرف آنے جانے پر اتنا کرایا خرچ کر دینا سراسر حماقت تھی۔ مطلوبہ بس آنے کے بعد وہ بمشکل اس میں سما گئی۔ کنڈیکٹر کی وہی پرانی صدائیں.... باجی آگے ہو جاؤ۔ باجی کرایہ نکالو۔ بس فرق یہ تھا کہ کرایہ دینے کے بعد طوبیٰ کے کان اس کی آوازوں کے لیے بند ہو جایا کرتے تھے۔ بس میں بہت حبس تھی لیکن اس سے زیادہ حبس اس کی زندگی میں تھا۔

...۞...

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وارڈ میں موجود لوگ اب اسے جاننے لگے تھے۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ عائزہ کو خود ہسپتال لے کر آئے۔ حالانکہ ان سب سے اس کی پڑھائی بُری طرح متاثر ہوئی تھی لیکن انسانیت کی جس سیڑھی پر وہ اس وقت کھڑا تھا اس وقت اس کے لیے عائزہ سے زیادہ کوئی اہم نہ تھا۔ اس کا ایمان انسانیت تھا اور وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہی بہترین مذہب ہے۔

ٹریٹمنٹ کے دوران ہی ایک دن اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو وہ طوبیٰ کو ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا، سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ جان گیا تھا کہ برابر والے بستر پر خوش دلی سے لیٹا وہ کمزور وجود طوبیٰ کا نہیں تھا لیکن اتنی گہری مشابہت پر وہ حیران ضرور ہوا تھا۔

مدیحہ کا تعلق کوئٹہ سے تھا اور وہ بھی درمیانے طبقے کے ہی لوگ تھے لیکن اسفر کے خاندان کے برعکس اس کا خاندان خاصہ مذہبی تھا، ساتھ موجود افراد کے سر پر ٹوپی ہوتی اور خواتین اگر کوئی ساتھ ہوتیں تو عبایا اور نقاب کا اہتمام ہوتا۔ واحد مدیحہ ہی تھی جو بس ایک بڑی چادر لیا کرتی تھی جو موقع در موقع کمزور کاندھوں سے ڈھلک جاتی تھی۔

مدیحہ بہت زندہ دل لڑکی تھی۔ کینسر جیسا مرض بھی اسے کمزور نہیں کر سکا تھا۔ خوش مزاج تو عائزہ بھی تھی لیکن دواؤں کے اثر اور بگڑتی جسمانی حالت کے باعث عائزہ خاصی چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس مدیحہ نہ صرف ٹریٹمنٹ روم میں رنگ بکھیرتی بلکہ تمام دوسرے مریضوں کی ہمت بندھانے کا کام بھی اس نے اپنے ذمّہ لے رکھا تھا۔

عائزہ کی اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی اور ساتھ ہی اسفر سے بھی اچھی سلام دعا۔ ٹریٹمنٹ کے دوران بھی نماز کا اہتمام اس کی اسفر کے علاوہ باقی سب کے لیے خاص خوبی تھی۔ دعا پر اس کا اعتماد انتہائی پختہ تھا۔ چائے پینے کو بھی اس کا جی چاہتا تو ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند اللہ سے مانگا کرتی، ''اللہ میاں جی مجھے چائے پلوا دیں۔'' اور کچھ ہی دیر بعد کوئی نہ کوئی شخص اس کے لیے اس کی مطلوبہ شے لیے حاضر ہوتا۔ اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

حسب معمول وہ عائزہ کے ساتھ ایک لکڑی کی کرسی پر اپنی کتابیں لیے بیٹھا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھائی زور وشور سے جاری تھی۔ نہ ہی وہ عائزہ کو اس کے حال پر چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی اپنی پڑھائی کو۔ نتیجہ یہ کہ وہ عائزہ کے ساتھ ہر وقت اپنی کتابیں لیے پھرتا۔ ابھی بھی وہ بغور فزکس کے کچھ قوانین کو سمجھنے کی تگ و دو میں تھا کہ ایک زوردار آواز آئی

''اللہ میاں جی! آج تو دہی بڑے کھانے کا بڑا دل ہے، اللہ میاں جی، دہی بڑے تو کھلا دیں۔''

اسفر نے چونک کر برابر والے بستر پر دیکھا جہاں وہ حسب معمول کسی دوسری مریضہ کے ساتھ خوش گپیوں میں اپنی بانگ لگانے کے بعد مصروف ہو چکی تھی۔ اُسی اثناء میں کمرے کے ایک کونے سے ایک خاتون مسکراتی ہوئی چلی آئیں۔

''بیٹا! آپ کو دہی بڑے کھانے ہیں؟'' انہوں اپنے ایک ہاتھ سے اپنا دوپٹہ سنبھالا دوسرے ہاتھ سے ایک پلاسٹک کا ڈبہ جو ڈھکا ہوا تھا۔

''جی باجی! قسم سے بڑا دل چاہ رہا ہے۔'' اس نے اپنی آنکھوں کو زور سے میچا۔

"میرا بیٹا ہے وہ...." انہوں نے کمرے کے کونے میں لیے تقریباً ۲۵ سالہ نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

''کینسر تشخیص ہوا ہے۔'' ان کی اداسی سوا تھی۔ ''ابھی دو ہفتے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔''

آپ بھی میری بیٹی کی طرح ہو۔'' ڈبہ مدیحہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں

''آپ کا دل چاہ رہا ہے، آپ کھا لیجئے۔''

مدیحہ نے ہر تکلف بالائے طاق رکھتے جھٹ سے ڈبہ پکڑ لیا، اسفر پڑھائی کو چھوڑ چھاڑ اس اتفاق پر مسکرا رہا تھا۔

یہ میرے اللہ جی کی پلاننگ ہے انہیں پتا تھا میں ان سے کیا مانگنے والی ہوں، تب ہی تو انہوں نے آپ کو یہاں بھیجا۔ اتنی دیر میں مدیحہ ڈبہ کھول چکی تھی۔

''ہمم..... بڑے لذیذ ہیں بھئی باجی جی، جادو ہے آپ کے ہاتھوں میں۔''

وہ خاتون خوش دلی سے مسکرائیں اور واپس کمرے کے کونے کی طرف روانہ ہوگئیں۔

"دیکھا تم نے، کیسے اللہ میاں جی نے دہی بڑے بھجوائے میرے لیے، یہ تو تمہارے لیے بھی مانگے تھے میں نے۔'' اب وہ عائزہ کے پاس موجود تھی۔

عائزہ نے اس کا ہاتھ پرے کر دیا، ''نہیں اسے دور ہٹاؤ، مجھے متلی ہو رہی ہے۔'' مدیحہ نے ڈبہ جھٹ سے اسفر کی طرف بڑھا دیا جسے اسفر نے گڑبڑا کر تھام لیا۔

''کھایئے کھایئے، اللہ میاں جی نے آپ کے لیے بھیجے ہیں،'' مدیحہ نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔ دو قدم چلنے سے بھی اس کا سانس پھول گیا تھا۔

''تو آپ کے اللہ میاں جی آپ کی ہر بات سنتے ہیں۔'' اسفر نے ہنستے ہوئے کہا

''ویسے میں تو اسے محض ایک اتفاق ہی کہوں گا۔'' مدیحہ نے جن خالی نظروں سے اسفر کو گھورا، اسفر کہہ کر پچھتایا۔

''آپ کو لگتا ہے یہ اتفاق ہے؟'' مدیحہ نے انتہائی حیران کن لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بالکل!'' اسفر نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''یعنی میرے ساتھ روز کوئی اتفاق ہوتا ہے۔'' مدیحہ نے مزید حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بالکل، اب اس کمرے میں اتنے سارے لوگ ہیں، آپ با آواز بلند آواز لگاتی ہیں اتنے لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی خواہش پوری کر دیتا ہے۔''

''اچھا!'' مدیحہ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی بچے سے بات کر رہی ہو۔''

''ذرا آپ بھی آواز لگایئے، دیکھتے ہیں یہ اتفاق آپ کے ساتھ ہوتا ہے یا نہیں'' وہ اب باقاعدہ اپنے ہاتھ سینے پر باندھے کر کھڑی ہوگئی۔

اسفر تھوڑی دیر مسکرایا لیکن پھر اپنے سر پر مدیحہ کو مستقل کھڑا پا کر کچھ پریشان ہوگیا۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا!'' اسفر نے بالآخر جان چھڑانا چاہی۔

''نہیں نہیں، آپ کچھ بھی مانگ لیں اللہ میاں جی سے۔'' مدیحہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

اسفر کچھ لمحے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا پھر بول اٹھا

''میں چاہتا ہوں میری بہن کل سے ایک دم ٹھیک ہو جائے۔''

''نہیں ایسے نہیں۔'' مدیحہ کی بات پر اسفر گڑبڑا گیا۔

''بالکل ایسے مانگیں جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنے بڑے سے کچھ مانگتا ہے۔'' مدیحہ نے چمکارتے ہوئے کہا۔ اسفر اب شدید کوفت کا شکار ہوا ''شاباش، گھبرائیں نہیں، بولیں۔''

اسفر کچھ دیر لب بھینچے اسے دیکھتا رہا اور پھر بلند آواز میں بولا ''مجھے اپنی بہن کے لیے مکمل صحت چاہیے۔'' سب کی نظریں اب مدیحہ اور اس پر ہی جمی تھیں۔

''ارے نام تو لیں کس سے مانگ رہے ہیں؟'' اسفر بدمزہ ہو رہا تھا۔

''میں کسی دعا پر یقین نہیں رکھتا۔'' بالآخر اسفر کے منہ سے وہ الفاظ نکل ہی گئے جس کو لاکھ چاہتے ہوئے بھی وہ کم از کم اپنے گھر والوں کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا۔

عائزہ جن اجنبی نگاہوں سے اسفر کو دیکھ رہی تھی، اس کی تاب لانا اسفر کے لیے ناممکن ہو رہا تھا۔

''مطلب؟'' مدیحہ نے نا سمجھی کہ عالم میں پوچھا ''آپ دعا پر یقین نہیں رکھتے؟'' مدیحہ نے شاید اپنے آپ ہی سے سوال کیا ''اچھا!'' وہ کسی سوچ میں گم تھی۔

''سمجھ گئی۔'' اس نے پھر گہرا سانس لیا۔ مدیحہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اسفر اب تک اسے کھری کھری سنا چکا ہوتا لیکن اس میں جو بات تھی اسفر چاہ کر بھی اسے کوئی تلخ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

''آپ مایوس نہ ہوں۔'' ایسا ہو جاتا ہے کبھی کبھی کہ انسان کو لگتا ہے یہ پریشانی میرے حصے ہی میں کیوں آئی وغیرہ وغیرہ۔ اور انسان کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے، لیکن یقین جانیے آخر میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میرے ماموں کو بھی ہوا تھا کینسر..... وہ بھی بھلے چنگے ہو گئے تھے۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ ایک سال بعد ایکسیڈنٹ میں رحلت فرما گئے۔ لیکن بھئی کینسر سے تو شفا مل گئی تھی نا!''

وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں بلکہ خلوص سے دعا کریں، اللہ میاں جی عائزہ کو مکمل صحت دے دیں۔''

اسفر کے خاموش لب دیکھ کر اس نے پہلے تو آنکھوں سے اشارہ کیا پھر بالآخر بول پڑی:

''بولیں نا میرے پیچھے۔''

''نہ میں کسی خالق پر یقین رکھتا ہوں اور نہ کسی دعا پر جب کوئی خالق ہی نہیں تو پھر دعا کیسی؟''

اب کی بار مدیحہ تو مدیحہ وہاں موجود ایک ایک فرد ہکّا بکّا اسفر کی شکل دیکھ رہا تھا۔

''ارے میاں پگلا گئے ہو کیا؟ کیا اول فول بک رہے ہو؟'' ایک بزرگ جو کسی مریض کے ساتھ وہاں موجود تھے اسفر کی بات پر اِک دم ہی بھڑک گئے۔

اب جب بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی تھی تو اسفر نے بھی اپنے عقیدے کو راز میں نہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ بعض اوقات آپ چیزوں کے بارے میں سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اور کبھی وہ ایک لمحے میں وقوع پذیر ہو جاتی ہیں۔

''آپ کے عقیدے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، آپ کو بھی میرے عقیدے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' اسفر نے بھی دوٹوک جواب دیا۔ نہ جانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی جو وہ اِک دم سب کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔

''جب میں سچ جانتا ہوں تو میں ہی کیوں چپ رہوں۔'' یہی ایک بات تھی جو اسفر کو توانائی فراہم کر رہی تھی۔ کوئی خود اعتمادی سی خود اعتمادی تھی۔ تمام لوگ اسفر کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور مدیحہ وہ تو کسی سناٹے میں تھی، بالکل عائزہ کی طرح۔

بڑی مشکل سے اسفر وہاں سے جان بچا کر نکلا ورنہ ان بڑے میاں نے اچھے خاصے مشتعل افراد جمع کر لیے تھے۔ عائزہ کو سہارا دے کر اسفر گاڑی تک لایا لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی عائزہ نے جس انداز سے اپنا ہاتھ کھینچا اسفر حیران رہ گیا۔

جس خونی رشتے کے لیے وہ دن رات ایک کیے ہوئے تھا آج وہی دھتکار رہی تھی جبکہ وہ پوری طرح اسی کے آسرے پر تھی۔

کیمو کی ڈوز لینے کے بعد عائزہ کی حالت ویسے ہی کافی خراب ہوتی تھی لیکن آج وہ پژمردگی کے

بجائے ایک تناؤ کی کیفیت میں تھی، ایسا لگتا تھا اسفر کے ساتھ سوکھی ٹہنیاں تن کر بیٹھی تھیں جن کے سارے پتے جھڑ چکے تھے۔

اسفر عائزہ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ چند سیکنڈ بعد ہی بول پڑی

''کب سے خیالات بدل گئے تمہارے؟''

اسفر نے لب بھینچ لئے کیونکہ جو کچھ بھی وہ کہتا عائزہ سمجھ نہ پاتی۔

''اللہ پر یقین نہیں ہے تمہیں؟'' لہجہ انتہائی زہریلا تھا۔ اسفر کو حیرت ہوئی کہ جہاں رونے کے لیے بھی طاقت نہ ہوتی تھی وہاں اسفر کا احتساب کرنے کے لیے خاصی توانائی میسر تھی۔

''عائزہ! بہتر ہے ہم ابھی اس موضوع پر بات نہ کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پریشان ہو۔''

''میں تمہارے بارے میں نہ جان کر زیادہ پریشان ہوں گی۔'' عائزہ تھوڑی نرم پڑ رہی تھی۔

شاید اسے بھی اندازہ ہو رہا تھا حالات کی سنگینی کا جس کا درشتگی سے مقابلہ مناسب نہیں تھا۔

''ایسا کیوں ہوا ہے اسفر کہ .... تمہارا اللہ پر ہی سے یقین اُٹھ گیا ہے؟'' عائزہ بمشکل جملہ مکمل کر پائی ''اسفر! ہم مسلمان ہیں، ہمارا جینا مرنا اللہ کے نام پہ ہے۔''

''کس نے کہا تم سے؟'' اسفر نے انتہائی سکون سے سوال کیا۔

''کیا مطلب؟'' عائزہ سے سٹپٹا گئی۔

''تمہیں یہ کس نے بتایا کہ ہمارا جینا مرنا اللہ کے نام پر ہے؟'' اسفر نے آرام سے پھر سوال کیا۔

''ہمارے نبی نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچایا ہے، اسفر کیا تمہیں یہ بات نہیں پتا؟'' عائزہ جھلاّ گئی۔

''نہیں مجھے یہ بات نہیں پتا، فی الوقت میں ایک کورا کاغذ ہوں، تم جو بات دلیل کے ساتھ کرو گی میں مان لوں گا، بس تمہاری دلیل میں وزن ہونا چاہیے۔''

اسفر احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا تاکہ عائزہ کو کوئی جھٹکا نہ لگے۔ بعض اوقات ہلکے سے جھٹکے سے بھی اس کی کراہ نکل جایا کرتی تھی۔ کیمو نے اس کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

عائزہ نم آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی، نڈھال ہو کر اس نے ہولے سے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا

دیا۔جتنی تکلیف اسے ان چند مہینوں میں ہوئی تھی، اپنے چہیتے بھائی سے ملنے والی موجودہ اذیت ان سب سے سوا تھی۔ دو آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے بہہ نکلے،ان آنسوؤں کو قید کرنے کے لیے فی الوقت اس کے پاس پلکوں کی کمزور رکاوٹ بھی موجود نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اللہ سے شکوہ کیا کرتی تھی ''میں ہی کیوں؟'' اور آج اس کا دل بس ایک ہی تسبیح پڑھ رہا تھا

''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' صحت یا زندگی ہو نہ ہو،بس میرا ایمان باقی رہے، یا رب میرے گھر والوں کا ایمان باقی رہے۔''

ہلکان سی نیم بے ہوشی کے عالم میں اس کے خاموش لبوں سے بس یہی دعا نکلی۔

...۞...

''آ گئیں بیٹا!'' یہ جملہ رضیہ ہر نفس کے گھر آنے پر بولتی تھیں۔

کسی نے کیا کیا، کیا کہا، کیا جواب دیا، رستہ کیسا گزرا۔ رضیہ کا سوالنامہ سب کے لیے ایک جیسا ہوتا تھا مگر طوبیٰ ایک جیسے جوابات روز دیتے دیتے اکتانے لگی تھی۔ اس کا گھر میں بات چیت کرنا بہت کم ہو گیا تھا اور اس بات کو سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً اس کا حوصلہ بھی بڑھاتے لیکن وہ ہر بات ہی سے زچ ہونے لگی تھی۔

''زیادہ پریشانی تو نہیں ہوئی راستے میں؟'' رضیہ نے رٹا رٹایا سوال دہرایا۔

''نہیں'' طوبیٰ نے حتی الامکان پرسکون رہنے کی کوشش کی۔ روز کی طرح رضیہ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ روشن اور گول چہرہ اب پتلا لمبا ہو گیا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے تھے اور ہونٹوں پر سیاہی آنا شروع ہو گئی تھی۔ آنکھیں گڑھوں میں غائب ہونے لگی تھیں۔ دو ہفتے پہلے ہی مختلف ٹیسٹ کے نتیجے میں جو رپورٹ سامنے آئی تھی اس کے مطابق رضیہ کے جگر میں انفیکشن ہو گیا تھا۔ علاج بروقت شروع ہو گیا تھا لیکن خاصہ مہنگا تھا۔ اکبر اپنی تمام جمع پونجی لیے رضیہ کی صحت کے لیے کوشاں تھے۔ صدیق بھی اپنی نئی جاب کے ساتھ ہر ممکن مدد کر رہا تھا لیکن مہنگائی کے بے قابو جن کے آگے سب ہی بے بس نظر آ رہے تھے۔

''کیسا رہا آپ کا انٹرویو، آپی؟'' حسنہ باورچی خانے سے برتن دھو کر باہر نکلی ہی تھی کہ اسے طوبیٰ نظر آ گئی۔

''ویسا ہی جیسا ہر بار ہوتا ہے۔'' طوبیٰ نے پنوں سے سیٹ دوپٹہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

''یعنی اچھا!'' حسنہ خوش دلی سے کہا۔

''میں تھوڑا آرام کر لوں پھر بات کرتے ہیں۔'' طوبیٰ نے بات کو سمیٹا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''کھانا تو کھالو!'' رضیہ نے پکارا۔

''بھوک نہیں ہے ابھی۔'' اُس نے مڑے بغیر جواب دیا اور بستر پر جا گری۔ ایک بار پھر انٹرویو کا پورا حال اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

انٹرویور نے طوبیٰ کو سر سے پاؤں تک ایسے دیکھا تھا جیسے وہ مشتری سے آئی ہوئی کوئی مخلوق ہو، وہ ادھیڑ عمر کا شخص جس کے سر کے بال کافی جھڑ چکے تھے گول چہرہ اور فربہ جسم کے ساتھ بمشکل اپنی کرسی میں سمایا ہوا تھا۔ طوبیٰ کی سی وی کا جائزہ لینے کے بعد اب وہ بغور طوبیٰ کا جائزہ لے رہا تھا۔

طوبیٰ کو ایک دم بے چینی کا احساس ہوا اور وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''ابھی تو صرف BBA کیا ہے آپ نے اور جاب کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔'' انٹرویو کرنے والے نے عام سے لہجے میں کہا۔

''میں جاب کے ساتھ اپنی پڑھائی جاری رکھوں گی۔'' طوبیٰ نے بھی دوٹوک جواب دیا۔

انٹرویور نے ایک تیکھی نگاہ طوبیٰ پر ڈالی ''آپ جانتی ہیں ناکارپوریٹ کلچر میں موو کرنے کے لیے وقت پہلی شرط ہے جو دن میں کسی بھی وقت مانگا جا سکتا ہے۔''

طوبیٰ جو اس کے ایکسرے کرنے والی آنکھوں سے پہلے ہی زچ بیٹھی تھی بمشکل اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے بولی

''کام کی نوعیت کے حساب سے ظاہر ہے میں وقت کا تعین کروں گی لیکن جہاں تک دن کے کسی بھی حصے کا سوال ہے میرا خیال ہے یہ جاب ڈسکریشن مخصوص جابز کے لیے ہوتی ہے۔ میں نے جس آسامی کے لیے درخواست دی ہے اس میں بھی یقیناً وقت کا تعین پالیسی کے مطابق ہوگا۔''

میز کی دوسری طرف بیٹھے شخص نے کچھ ناگوار تاثرات کے ساتھ بازو اپنے سینے پر باندھ لیے اور اپنی آرام دہ کرسی پر آگے پیچھے جھولنے کے ساتھ ساتھ ازسرنو طوبیٰ کا معائنہ شروع کر دیا۔

''ہم اپنے ملازمین کے رکھ دکھاؤ اور طور اطوار کو لے کر کافی حساس ہیں اور لباس اس معاملے کی پہلی شرط ہے تو کیا آپ ہمارے ماحول کے مطابق اپنی ڈریسنگ سینس کو بہتر بنا پائیں گی؟''

سامنے بیٹھے شخص کے طوبیٰ کے سر پر لیے حجاب پر برملا تنقید پر طوبیٰ ششدر رہی گئی۔

''کمپنی کو میرے کام کی مہارت سے مطلب ہے یا میرے لباس سے؟'' طوبیٰ نے ایک بار پھر اپنے اندر اٹھتے ابال کا گلا گھونٹا۔

''محترمہ میں نے پہلے ہی کہا کہ ہم اپنے ادارے کی ساکھ کو لے کر کافی حساس ہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ آپ ایک کارپوریٹ ادارے میں انٹرویو دینے آئی ہیں؟''

اس شخص کا انداز انتہائی ہتک آمیز تھا۔

وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ انتہائی سرد مہری سے طوبیٰ کے منہ سے الفاظ ادا ہوئے۔

''اگر میں یہ دوپٹہ اتار دوں تو کیا میں آپ کے ادارے میں کام کرنے کی اہل قرار پاؤں گی؟''

سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ دوبارہ سی وی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے بڑے لاپرواہ انداز میں کہا

''ہوں، میرے خیال میں آپ ہمارے لیے کچھ فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہیں۔''

طوبیٰ ہاتھ لپیٹ کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی۔ تو گویا صرف میرا حجاب آپ کے ادارے کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتا ہے؟''

اس شخص کی ابرو تن چکی تھی لیکن وہ خاموش رہا۔

''کیا آپ لباس تبدیل کرتے ہیں تو آپ کے اپنے کام میں مہارت بھی ساتھ اتر جاتی ہے؟''

''بی بی! مجھے نہیں لگتا آپ ہمارے ادارے میں کام کرنے کے لائق ہیں۔ آپ جاسکتی ہیں۔''

انتہائی بدتمیزی سے کہا گیا جملہ بھی طوبیٰ کے چہرے سے طنزیہ مسکراہٹ کو جدا نہ کرسکا۔

''مجھے لگتا ہے، یہ ادارہ اس کا اہل نہیں کہ اس قابلیت کو ہائیر کرسکے۔''

پیچھے وہ شخص بہت کچھ کہہ رہا تھا لیکن طوبیٰ نے اس کی آوازوں کے لیے کان بند کر لیے تھے۔

''یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔'' ایک تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ وہ اس عالیشان عمارت سے باہر نکل

آئی تھی۔ وہ بہت اعتماد کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہوئی تھی لیکن نکلتے وقت ایک آگ تھی جو اندر بھڑک رہی تھی۔

...۞...

اسفر اس راز سے پردہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا لیکن شومئ قسمت اس کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوٹا تھا۔ اسے رہ رہ کر مدیحہ پر تاؤ آ رہا تھا۔ جس معصومیت پر اُسے پیار آتا تھا آج وہی بچگانہ باتیں اُسے زہر خند لگ رہی تھیں۔ اُسے اپنے خیالات و احساسات پر کوئی شرمندگی نہ تھی، فکر تھی تو بس اس ممکنہ تکلیف کی جو اس کے عقائد کی تبدیلی کی وجہ سے اس کے والدین کو پہنچنے والی تھی۔

اضطرابی کیفیت میں وہ کمرے کے چکر کاٹ رہا تھا۔ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہا تھا درحقیقت وہ بھی آسان نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا جیسے وکی کی باتیں اس کے دل کو لگا کرتی تھیں، ہر شخص ان باتوں سے باآسانی قائل ہو جائے گا لیکن صورتحال مکمل طور پر متضاد تھی۔

ایک زوردار غرّاہٹ کے ساتھ اس نے کمرے میں رکھی الماری پر مکا دے مارا۔

درد کی شدید لہر سرعت سے پورے بازو میں سرایت کر گئی وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ ہاتھ کو گھٹنوں کے بیچ دبائے وہ شدت سے کراہ رہا تھا کہ عائشہ ہانپتی کانپتی دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔

''کیا ہوا اسفر سب ٹھیک تو ہے؟'' ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور غالباً وہ مصلّے سے اٹھ کر آئی تھیں۔ آج کل ان کی زندگی میں بس دو ہی اہم کام تھے۔ عائزہ کی تیمارداری اور اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں اور وظیفے کرنا۔

بمشکل اسفر سیدھا ہوا تکلیف کی شدت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھ ابھی بھی جھنّا رہا تھا۔

''کچھ نہیں امی بس ہاتھ الماری سے ٹکرا گیا۔''

عائشہ سکتے کے عالم میں الماری کو تکنے لگیں جہاں غلطی سے ہاتھ لگنے کے کوئی آثار نہ تھے البتہ اس بوسیدہ لکڑی کی الماری کے دروازے پر کسی وار کے آثار ظاہر تھے۔ سب کچھ سمجھنے کے بعد بھی عائشہ یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ آخر اسفر کو اتنا غصہ کس بات پر تھا؟ عافیہ بھی دروازے پر کھڑی عائشہ کی

نظروں کے تعاقب میں دیکھ رہی تھی۔

''بھائی!'' اس کی آواز کافی بلند تھی۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھی اور اسفر کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے اپنے بھائی پر بے تحاشہ پیار آیا۔ عائزہ کے لیے جس قدر دیوانگی کا مظاہرہ آج کل اسفر کی طرف سے تھا وہ سب ہی کے لیے دیدنی تھا۔

''آپ اپنے آپ کو یوں کیوں تکلیف دے رہے ہیں؟'' عافیہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اسفر لب بھینچے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے خیالات سے فی الوقت سب کو آگاہ کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن وہ خواب ہی کیا جو حقیقت ہو جائے۔

عائزہ دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیے آ کھڑی ہوئی۔ اسکی ویران آنکھوں میں غصہ تھا یا نفرت، اسفر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جب انسان کا اللہ پر سے بھروسا اٹھا جائے تو وہ ایسے ہی ذہنی انتشار کا شکا ہو جاتا ہے۔''

عائزہ کے دھیمے لیکن اجنبیت سے لبریز اس جملے نے کمرے میں موجود ہر شخص کو ہی چونکا دیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' عائشہ نے بھنویں سکیڑیں اور عائزہ کی نظروں کا تعاقب کیا۔

وہ غصے اور ناراضی سے اسفر ہی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسفر عائزہ کی آنکھوں میں سب کچھ دیکھ سکتا تھا لیکن یہ بات اس کے لیے باعثِ تقویت تھی کہ وہاں نفرت کا شائبہ نہ تھا۔

''عائزہ! اس بات کو یہیں رہنے دو۔'' اسفر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

عائشہ حیرانی کے عالم میں کبھی اسفر تو کبھی عائزہ کو دیکھتیں۔ جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو پیغام ارسال کر رہے تھے۔ آخر کار اسفر نے ایک گہرا سانس لیا اور گویا ہوا

''امی! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

عائشہ اسفر کی طرف متوجہ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا رہی تھیں لیکن جو کچھ وہ سننے والی تھیں وہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور عائزہ اسفر کی اس بے باکی پر حیران و پریشان کھڑی تھی۔

''میں دینِ اسلام چھوڑ چکا ہوں۔'' ایسے لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیل دیا تھا۔

عائشہ کی آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں۔

''کیا!!!''

عافیہ اپنی جگہ پر سُن بیٹھی تھی۔اپنے حواس بحال کر کے عائشہ بولیں تو وہ نہایت غصے میں تھیں۔

''اسفر! اس قسم کا بیہودہ مذاق میں آئندہ نہ سنوں، سمجھے!''انہیں اپنے بچوں کی مذاق کی عادت کا علم تھا ۔لیکن مذاق میں یوں حد سے گزر جانا انہیں ناگوار گزرا تھا۔

''یہ مذاق نہیں کر رہا امی جان! سچ بول رہا ہے۔یہ ملحد ہو گیا ہے۔''عائزہ کے الفاظ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔

اب کی بار عائشہ اس دھچکے سے سنبھل نہ پائیں اور ان کی ٹانگیں ان کا ساتھ چھوڑ گئیں۔وہ دھڑام سے پاس رکھی کرسی پر گری تھیں۔ایسا لگا تھا جیسے کمرے سے اچانک آکسیجن ختم ہو گئی ہو۔ہر فرد سانس لینے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔کچھ لمحے اسی موت جیسے سناٹے میں گزر گئے۔

''اسفر!''ایک ہلکی سی سرگوشی عائشہ کے ہونٹوں سے نکلی

''تم تو میرے سب سے پیارے بیٹے تھے ناں۔مگر یہ کیا کیا تم نے؟''

عائشہ، جن کے آنسو عائزہ کے کینسر کی خبر سن کر بھی باہر نہ آئے تھے،آج بنا رکے ہی آنکھوں سے جاری تھے۔وہ بے یقینی کی کیفیت میں کرسی پر نڈھال پڑی تھیں۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے اسفر!'' آواز بمشکل اسفر کو سنائی دی۔تم نے جس ایمان پر پرورش پائی ہے تم اس کو کیسے چھوڑ سکتے ہو؟ وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولیں۔

اسفر نے بے بسی سے عائشہ کو دیکھا،دو سالوں کے عرصے میں کہیں جا کر وہ اپنی شناخت کھوج پایا تھا اور آج اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر اسے وہی اذیت دوبارہ یاد آئی۔

''ایسا ہو جاتا ہے بیٹا!''عائشہ یک دم ہی سنبھل گئی۔''یہ بس ایک دورانیہ ہوتا ہے کہ انسان شک میں پڑ جاتا ہے۔لیکن پھر وہ واپس اپنے رب کی طرف لوٹ آتا ہے۔''وہ کپکپاتی ٹانگوں سے چلتی اسفر کے قریب بستر پر جا بیٹھیں۔''مجھے یقین ہے تمھارا شک جلد دور ہو جائے گا،کیوں کہ تم دل سے

اللہ پر یقین رکھتے ہو، انھوں نے محبت سے اسفر کو چمکارا۔ ایسا ہی ہے ناں اسفر!''

اسفر کی خاموشی اور جھکا ہوا سر کمرے میں موجود مزید تین نفوس کو سب کچھ سمجھا رہا تھا۔ عافیہ آہستگی سے کھڑی ہوگئی۔

''بھائی آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟'' وہ آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ سب سچ مچ میں ہو رہا ہے۔ آپ کیسے ہمارے پیارے دین کو اس طرح چھوڑ سکتے ہیں، ہمارا مذہب، ہماری روایات، ہمارے رواج یہی تو ہمیں زندہ رکھتا ہے۔'' عافیہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگی۔

اسفر نے گہری سانس لی مگر کچھ نہ کہا۔ سبھی کو سانپ سونگھا ہوا تھا، عائزہ دروازے کے پاس رکھی کرسی پر تھک کر بیٹھ چکی تھی۔ آخر کو اسفر ہی نے ہمت جمع کی اور مستحکم لہجے میں کہنا شروع کیا:

''مجھے معلوم ہے کہ یہ قبول کرنا آپ سب کے لیے مشکل ہوگا، لیکن میرے عقائد تبدیل ہو چکے ہیں، میں نے بہت وقت لگایا ہے اپنی حقیقت کی تلاش میں! بہت جدوجہد، سوالات اور ان کے جوابات تلاش کرنے کے بعد ہی میں ذات کو کھوج پایا ہوں اور اب اس دنیا کو اس کائنات کو ایک نئے نظریے سے دیکھتا ہوں۔'' اسفر نے نگاہ اُٹھا کر تینوں کو دیکھا جو گنگ بیٹھیں تھیں۔ صرف آنکھوں سے گرتے آنسو ہی ان کے درد کا پتا دے رہے تھے۔

اسفر نے ایک بار پھر سر اُٹھا کر کہنا شروع کیا

''میں حقائق سے نتائج اخذ کرتا ہوں۔ مجھے واقعی نہیں لگتا کہ خدا جیسی کوئی ہستی موجود ہے۔''

''تو پھر کون سی ہستی موجود ہے۔'' اسفر کے والد عباس کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے انھوں نے عافیہ کی بات لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے سن لی تھی۔

اب اسفر کا اقرار یا بیان سن کر اپنے غصے پر قابو رکھنا ان کے لیے ناممکن تھا۔

''بولو! کون سی ہستی ہے؟ جس نے تمھارے وجود کو ایک لوتھڑے سے انسان کی شکل دی۔ ایک ایسے انسان کو جو ناشکرا ہے۔ دھتکارا ہوا، اب منہ کیوں بند ہو گیا تمھارا؟ تم اب آزاد ہو، جو چاہو بول سکتے

ہو۔''عباس کی آواز کی گرج سے کمرے میں موجود ہر شخص سہم گیا تھا۔

''تمھاری بکواس میں دروازے پر ہی سن چکا تھا، ہمارا مذہب ہم پر حقیقت آشنا کرتا ہے اور تم اسے چھوڑنے چلے ہو؟''

''ابو میں نے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ میں ابھی بھی وہی ہوں جس کو آپ نے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ میں نے اپنے خاندان، اپنی روایات میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ بس یہ میرا انفرادی سفر ہے جس کے لیے میری کچھ آرا ہیں، کچھ اصطلاحات اور کچھ مشاہدات ہیں، میں فی الوقت انہی پر غور کرنا چاہتا ہوں۔''

اسفر عباس کے سامنے کھڑا اپنا موقف بیان کرنا چاہتا تھا، انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ کن اُلجھنوں سے نکل کر بھاگا ہے لیکن عباس کوئی بات سننے کو راضی ہی نہ تھے۔

''کل تک تو تمھیں کسی بات پر اعتراض نہیں تھا، راتوں رات ایسا کیا ہوا ہے جو تمھارے خیالات ہی بدل گئے؟''عباس دانت پیستے ہوئے بولے۔

''ابو! میں مانتا ہوں، لیکن ضروری تو نہیں کہ انسان آنکھیں بند کر کے اسی بات پر یقین کیے جائے، جو اسے سکھایا اور پڑھایا گیا ہو۔''

عباس کی برداشت اب جواب دے گئی تھی اور وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں چلا اٹھے

''ایسا کیا غلط پڑھایا لکھایا تمھیں کہ اب تم متنفر ہو رہے ہو؟''

اسفر کچھ وقت کے لیے جیسے گونگا ہو گیا۔

''بولو اسفر! ایسی کیا کمی ہے ہمارے عقیدے میں کہ اس کو اب تمھاری جدت کی ضرورت پڑ گئی؟''

عباس کا خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''ابو! اب میں خدا جیسی کسی ہستی پر یقین نہیں رکھتا۔''اسفر نے ہمت کر کے ایک بار پھر اپنا نیا نظریہ دہرا دیا تھا۔

عباس کو لگا کہ جیسے آسمان ان کے سر پر آن گرا ہو یا ان کا پورا وجود کسی گرم لاوے کی زد میں آ گیا

ہو: ''میرے سامنے پھر وہی بکواس؟'' عباس منہ سے کف اُڑا رہے تھے۔اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مار مار کر اسفر کو سیدھے راستے پر لے آئیں۔باقی لوگ بت بنے دونوں باپ بیٹے کی گفتگو سن رہے تھے۔ان کو لگا کہ یہ ایک بہت بڑا بھنور ہے جس میں اب وہ سبھی پھنس چکے ہیں اور یہ بھنور ہر چکر میں ان سب کو مزید گہرائی میں لیے جا رہا ہے۔

''اپنی بکواس بند کرو۔'' عباس اب سخت مشتعل تھے ایک ایک لفظ انھوں نے چبا چبا کر بولا تھا۔

اسفر نے آگے سے کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا۔وہ جان گیا تھا کہ مذہب کی تبدیلی اس کے گھر والوں کے لیے قبول کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔

جس خدا نے تمھیں پیدا کیا، ان گنت نعمتوں سے نوازا، عزت آسائش، رہائش، رزق اور سب کچھ بنا مانگے دیا آج تم اسی اللہ کے انکاری ہو رہے ہو، نامراد انسان؟''

عباس چنگھاڑ کر بولے ''ایسا کیا کرنا چاہتے ہو جو تمھیں مذہب اجازت نہیں دیتا اس کام کی؟''

''ایسا تو نہیں ہے ابو! میرے نظریات بہت زیادہ مطالعے اور تحقیق کے بعد تبدیل ہوئے ہیں۔آپ یقین جانیے مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔نہ ہی اس بات سے کہ آپ نے مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے پروان کیوں چڑھایا۔میں بس اب حقائق کو تسلیم کر چکا ہوں۔''

اسفر نے بے باکی سے کہا۔

''اور ہم سب کیا خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں؟ تم ہم سب کو پاگل سمجھتے ہو؟'' اسفر کے والد کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔وہ ایک دم اسفر پر جھپٹے، مگر تیزی سے درمیان میں آ کر عائشہ نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

''سنیے، ایسا مت کیجیے جوان اولاد ہے۔آپ کو ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے۔وہ نادان ہے، جلد سمجھ جائے گا ان شاءاللہ!'' عائشہ عباس کے آگے منت کرنے لگیں۔

''کوئی نادان نہیں ہے یہ، بیس اکیس برس کا پورا کا پورا آدمی ہے۔باز پرس ہوگی اس کی ہر بالغ کی طرح!'' عباس نے گھن گرج کر کہا، ابھی ماحول گرم ہی تھا کہ عائزہ ایک دم ہی کرسی پر بیٹھے بیٹھے فرش

پر ڈھے گئی۔

''عائزہ!'' عائشہ کے منہ سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔

''ابو پلیز! بھی اس بات کو یہیں چھوڑ دیں، میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ ہم اس موضوع پر بعد میں بات کر سکتے ہیں۔''

اسفر یہ کہہ کر پھرتی سے عائزہ کی طرف بڑھا اور عافیہ اور عائشہ کی مدد سے اس کو بستر پر لٹا دیا۔

''یہ تو ایک دم ٹھنڈی ہو رہی ہے'' عائشہ ہچکیوں سے رونے لگیں: ''یا اللہ میری بچی.....''

''امی'' عائزہ کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی۔

''مجھے لگتا ہے اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا ہے'' اسفر نے اس کی نبض دیکھتے ہوئے کہا ''میں گاڑی نکال رہا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا وہ باہر کی طرف بھاگا۔

عباس ابھی بھی مجسمہ بنے کھڑے تھے۔ شکست خوردہ .....اس گھرانے کو بری بلاؤں نے گھیر لیا تھا۔ وہ دھپ سے پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گئے اور ایک ٹک عائزہ کو دیکھے گئے۔ انہیں لگا ان کے ایک نہیں دو بچوں کو ایک ساتھ کینسر تشخیص ہوا تھا۔

...۞...

تین دن انتہائی تناؤ کی کیفیت میں گزرے۔ کوئی اسفر سے بات کرنا تو درکنار آنکھ ملانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''آپ ابھی اُسے کچھ نہ کہیں، وہ بہک گیا ہے۔ ہماری سختی اُسے متنفر کر سکتی ہے۔''

عائشہ نے رات ہسپتال سے واپس آنے کی بعد عباس سے کہا جو اضطرابی کیفیت میں اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

''عائشہ، مجھے سمجھ نہیں آتا مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے؟'' عباس اپنا سر پکڑے بستر کی پائنتی پر بیٹھے تھے۔

عائشہ نڈھال تھیں۔ ان تمام حالات و واقعات اور پے در پے آنے والی پریشانیوں نے اُنہیں توڑ کر

رکھ دیا تھا لیکن جب عباس کو کمزور پڑتا دیکھا تو مجبوراً خود کو دوبارہ مضبوط کرنا پڑا تھا۔ کیا ہی ہنر اللہ نے عورت کو دیا ہے! صنفِ نازک، جس کے قدم قدم پر مرد نگہبان ہوتا ہے، وہی اس قوام کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔

...۞...

رات کھانے کی میز پر اسفر کے لیے حلق سے نوالہ اتارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایات کی تھیں کہ عائزہ کو خوش رکھا جائے کیونکہ اس وقت وہ جس شدید جسمانی اور ذہنی تناؤ سے گزر رہی تھی اس کے لیے ذرا سی بداحتیاطی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی اور اب ایسی صورتحال میں اسفر سب کے سامنے مجرم بنا بیٹھا تھا۔

بمشکل چند لقمے کھانے کے بعد جیسے ہی اسفر اٹھنے لگا عباس بول اٹھے۔

''ابھی بیٹھو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

اسفر نے سوالیہ نظروں سے عائشہ کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے اسفر کو پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔

عائزہ کے کھانا ختم کرنے کے بعد عافیہ خاموشی سے اس کو اپنے کمرے کی طرف لے چلی۔ عائشہ کے لاکھ اسرار کے باوجود عائزہ کی ضد یہی ہوتی تھی کہ وہ کھانا سب کے ساتھ میز پر کھائے گی اپنے کمرے میں نہیں، وہ ہار ماننے کو قطعاً تیار نہ تھی۔

''چند کتابیں پڑھ کر تم سمجھنے لگے ہو تم سب حقیقت جان چکے ہو۔''

جب اختر بھی اٹھ کر چلا گیا تو عباس نے بات شروع کی۔ ان کو واضح ہدایات تھیں کہ نرمی سے بات کرنی ہے، لیکن ایسا کرنا ان کو ناممکن لگ رہا تھا۔

''تم نے ایک تاریک راستے کا انتخاب کیا ہے اسفر، لیکن ایک باپ ہونے کے ناطے میں اپنی اولاد کو دوزخ کے گڑھے میں گرتا نہیں دیکھ سکتا۔''

ان کی رندھی ہوئی آواز حلق میں آنسو کے گولے پھنسے ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ اسفر خاموشی سے سنتا

رہا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے عجیب نہیں تھا وہ جانتا تھا اس کے والد اس سے کس قدر پیار کرتے تھے لیکن اپنی ذات کی اس نئی پہچان کی نفی وہ کسی صورت نہیں کر سکتا تھا۔

''میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ مسجد کے مولوی صاحب کے پاس چلو، میرا علم تو محدود ہے، میں چاہتا ہوں تم ان کے ساتھ اپنے اختلافات پر بحث کرو۔ شاید اسی طرح تمہاری سوچوں کی گرہیں کھل جائیں۔

''ابو، میں.....'' اسفر نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن عباس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اگر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔ ابھی تم اپنی ضروریات کے لیے مکمل طور پر مجھ پر انحصار کرتے ہو، تمہارے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پہلے مولوی صاحب سے مل لو اس کے بعد تمہاری عقل ٹھکانے آ جائے تو ٹھیک ورنہ آگے طے کر لینا تمہیں کیا کرنا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ کھڑے ہو گئے اور اسفر کو بھی ساتھ چلنے کا عندیہ دیا۔

محلے کی مسجد دو گلی چھوڑ کر تھی۔ اسفر خاموشی سے عباس کے ساتھ چلتا رہا۔ عباس کہ نپے تلے قدم اور اکڑا جسم ان کے ذہنی تناؤ کے غماز تھے۔ عموماً نماز کے لیے جب عباس، اسفر اور اختر ساتھ جایا کرتے تھے گھر سے مسجد تک کا سفر انتہائی مختصر لیکن خوشگوار ہوتا تھا لیکن آج یہ سفر نہ ختم ہونے والا لگ رہا تھا۔

بھاری قدموں کے ساتھ جب وہ وہاں پہنچے تو عشاء کی جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔

عباس صاحب سُرعت سے جماعت میں شامل ہو گئے جبکہ عباس ایک شش و پنج کا شکار تھا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اسفر بھی جماعت میں شامل ہو گیا۔ نماز کے بعد جب دعا مانگی جا رہی تھی اسفر آنکھیں بند کئے اپنے کتھارسس میں مصروف تھا۔

خالی الذہن ہو کر بیٹھنا اور ہواؤں میں اُڑتے جانا اسے بے پناہ ذہنی سکون دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ مسجد خالی ہو گئی اور چند افراد کے علاوہ جب کوئی نہ رہ گیا تو امام صاحب مسکراتے ہوئے اسفر اور عباس کے پاس چلے آئے۔ عباس نے اُن سے پرتپاک مصافحہ کیا۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت ان کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی اور اسفر کو نماز میں شریک دیکھ کر اُن کو دلی طمانیت ہوئی تھی۔

''جی اسفر میاں، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

اسفر نے عاجزی سے سب ٹھیک ہونے کا عندیہ دیا تو وہ مزید گویا ہوئے'' آپ کے والد صاحب بتا رہے تھے آپ کو کچھ شبہات ہیں دین اسلام کے حوالے سے۔لیکن ماشاءاللہ آپ کو نماز کے بعد اللہ سے لو لگاتا دیکھ کر میں تو خاصہ مطمئن ہو گیا ہوں.....تو یقیناً آپ کے والد بھی مطمئن ہوئے ہوں گے۔''

عباس کا چہرہ خوشی سے کِھل رہا تھا۔تین دن انہوں نے اسفر پر کڑی نظر رکھی تھی اور ان دنوں میں انہوں نے اسفر کو ایک وقت بھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔آج اس کو مسجد میں نماز میں مشغول دیکھ کر ان کی فکریں ایک دم ہی بھاپ بن کر اڑ گئی تھیں اور انہوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

''جی مولوی صاحب! نماز ایک بہت اچھی ورزش ہے اور اخلاقاً بھی مجھے اچھا نہیں لگا کہ آپ سب لوگ ایک مشق میں مصروف ہوں اور میں کونے میں اکیلا بیٹھا رہوں۔''

عباس کی آنکھوں کے جلتے دیے ایک دم ہی بجھ گئے اور امام مسجد بھی اپنی جگہ سٹپٹا گئے۔

''تو گویا آپ نماز نہیں پڑھ رہے تھے؟'' امام صاحب نے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''چلئے تو یہ بتایئے کہ کچھ عرصے پہلے تک تو آپ کو پوری نماز آتی ہی تھی اور آپ پڑھتے ہی تھے تو آج بھی پڑھ لیتے۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟'' اسفر نے سادگی سے سوال کیا۔

''آپ کو ثواب ملتا، نماز پڑھنا فرض ہے تو آپ ایک فرض ادا کر لیتے۔'' امام صاحب نے جواب دیا۔

''لیکن جب مجھے نماز کا مطلب ہی نہیں سمجھ آتا تو صرف ثواب کے لیے پڑھنے کا کیا فائدہ؟'''' اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ نماز پڑھنا چھوڑ دیں، بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ سیکھیں کہ نماز میں ہم کیا پڑھتے ہیں۔اللہ سے کیا بات کرتے ہیں۔'' امام صاحب نے ناصحانہ انداز میں کہا

''امام صاحب، سجدہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟'' اسفر نے سوال کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر رہے ہیں کہ آپ اطاعت گزار رہوں گے۔''

''اور اگر کوئی شخص سجدہ کرنے کے بعد بھی اطاعت گزار نہ ہو تو کیا اس کو نماز کا ثواب ملے گا؟''

امام صاحب ایک لمحے کو گڑبڑا گئے۔ ''قبول کرنے والی ذات تو اللہ کی ہے۔ وہ چاہے گا تو اس کو قبول کرے گا ورنہ شاید نہ بھی کرے۔''

''اس سجدے سے دنیا کو کیا فائدہ ہوگا؟'' اسفر کے سوالات ناختم ہونے والے تھے۔

''جب انسان سجدہ کر لیتا ہے تو وہ اللہ کا اطاعت گزار ہو جاتا ہے اور اللہ نے انسان کو اس دنیا کا ذمہ دار بنایا ہے۔ وہ طے کردہ نظم وضبط سے اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی پاسداری کرتا ہے کیونکہ یہ دنیا اللہ کی بنائی ہوئی ہے، اس کی حفاظت اللہ نے ہمیں سونپی ہے۔'' امام صاحب نے تسلّی سے جواب دیا۔

"لیکن میں تو اس بات سے ہی انکاری ہوں کہ یہ دنیا اللہ نے بنائی ہے تو کیا مجھے اس نماز کا ثواب ملے گا۔" اسفر نے بہت ہی عام سے لہجے میں پھر نیا سوال داغا۔

''استغفراللہ! برخوردار آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ یہ دنیا اللہ نے نہیں بنائی ہے، اس کائنات کی ایک ایک شے اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ ایک عظیم رب کی صناعی ہے۔ اسلامی تعلیمات اور قرآن کو اگر آپ سمجھ کر پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انسان کی تخلیق ایک عظیم ہستی کی مرہونِ منت تھی۔ یہ دنیا اللہ نے بے مصرف پیدا نہیں کی ہے۔ انسان کی بناوٹ کی باریکیوں سے لے کر کائنات کی وسعت تک اس بات کی گواہ ہیں کہ ان کو بنانے والا ایک عظیم رب ہے۔''

''مولوی صاحب! میں ان سب باتوں سے انکار صرف اس بناء پر کر رہا ہوں کہ مجھے اللہ کے وجود کے ٹھوس شواہد نہیں ملے ہیں۔ مجھے ہر بات پہ یقین کرنے کے لیے وجہ درکار ہے اور دنیا اور کائنات کے ارتقاء کا ثبوت سائنس بہتر طور پر دیتی ہے، تو کیا برا ہے اگر میں اپنا مذہب سائنس ہی کو بنالوں؟''

''استغفراللہ، آپ کی باتوں سے تو مجھے لگتا ہے میرا اپنا ایمان خراب ہو جائے گا۔ برخودار ایک اچھا مسلمان اچھا اطاعت گزار ہوتا ہے، وہ سنتا ہے اور مان لیتا ہے۔ آپ کے دل میں یہ سارے خیالات شیطان ڈال رہا ہے۔ استغفار کیجیے اور اللہ سے لو لگا لیجیے یہی راہ نجات ہے۔''

''میرا فہم وتحقیق مجھے سائنس سے قریب کرتی ہے مولوی صاحب! کیونکہ وہ مجھے ہر بات کا جواب دیتی ہے، چلیں آپ مجھے ایک بات بتائیں، یہ دنیا کیسے وجود میں آئی تھی۔"

''اللہ نے بنایا ہے اس دنیا اور اس میں موجود ہر ایک چیز کو۔'' مولوی صاحب نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ثبوت دیجیے کہ اللہ نے بنایا ہے۔"

''قرآن میں اللہ نے بار ہا اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔''

اسفر نے بیچ ہی میں امام صاحب کی بات کاٹ دی

''جب میں اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس کی کتاب کو کیونکر مانوں۔ آپ مجھے کوئی اور دلیل دیں۔''

امام صاحب کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن وہ ضبط کر گئے۔''عباس صاحب! آپ جمعہ کو میرے پاس تشریف لائیے گا، میں آپ کو اپنے استادِ محترم سے ملواؤں گا۔ غالباً وہ ہی اس مرض کا صحیح علاج کریں گے۔"

انہوں نے ناپسندیدگی سے اسفر کی طرف دیکھا۔

''اور برخوردار ایک بات آپ کے لیے کہے دیتا ہوں، آپ کی سب سے بڑی غلطی ہے کہ آپ اپنے فہم پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کر رہے ہیں۔ اتباع کی عادت کو اپنائیے۔ کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے اگر ثبوت کم پڑ جائیں تو اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز موجود ہی نہیں۔ خدا کی ذات صرف سائنسی توجیہات اور کھلے صاف نظر آنے والے ثبوت کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ اللہ نے انسان کو اس کے انتخاب میں آزاد ضرور کیا ہے لیکن اس کو پورے ہوش وحواس بھی دیے ہیں کہ وہ اس پر غور وخوض کرے۔ اسلام نے ایک لازوال زندگی کا جو تعارف دیا ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو یہ دنیا میدانِ جنگ بن جائے۔''

اسفر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امام صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کروا دیا۔''اب آپ سے جو بات ہوگی وہ استادِ محترم کے سامنے ہوگی، معذرت لیکن میں آپ کے سوالات کو حل کرنے کی اہلیت مفقود پاتا ہوں۔ امید ہے آپ تھوڑا صبر سے کام لیں گے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔''

یہ کہتے ہیں ہوئے امام صاحب تو رخصت ہو گئے لیکن عباس کے چہرے کی سیاہی میں اضافہ کر گئے۔ وہ جھکے کاندھوں کے ساتھ گھر روانہ ہوئے۔

گھر پہنچ کر دروازہ بند کرتے ہی عباس اسفر کی طرف رخ کئے ساکت ہو گئے۔

''مجھے پتا ہوتا کہ بڑے ہو کر تم یہ گُل کھلاؤ گے تو میں تمہیں کہیں پھینک آتا، جتنی ذلّت مجھے آج محسوس

ہوئی ہے کبھی پہلے نہ ہوئی تھی۔''

اسفر نے چند لمحے انہیں دیکھا اور گویا ہوا ''ابو، میرا موقف عملی ہے، میں مانتا ہوں ایمان کی اہمیت آپ کے لیے بہت زیادہ ہے لیکن میرا مذہب اب صرف انسانیت ہے۔ میرے خیال میں ہم دونوں کو روشن خیالی سے کام لینا چاہیے۔''

''اب تم مجھے سکھاؤ گے مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔'' عباس اِک دم ہی اشتعال میں آ گئے۔ ''جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمہیں یونیورسٹی جاتے اور اپنے آپ کو علّامہ سمجھنے لگے ہو، دفع ہو جاؤ میرے گھر سے، میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

چیخ و پکار سن کر عائشہ بھی بھاگی بھاگی باہر آئیں، بوکھلاہٹ ان کے چہرے سے عیاں تھی اور تسبیح ابھی بھی ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔

''عباس اندر آئیں، کمرے میں بیٹھیں۔'' یہ کہہ کر وہ عباس صاحب کی طرف لپکیں اور عافیہ کو آوازیں دینے لگیں، اختر بھاگا بھاگا آیا اور عباس کو سہارا دیا۔

''بھائی کیا ہو گیا ہے تم کو۔ کیوں ایک نئی مشکل کھڑی کر دی ہے ہم سب کے لیے۔ پہلے ہی ہم کم پریشان تھے جو آپ ایک نیا قصہ لے کر آ گئے ہیں۔'' اختر جھلّایا ہوا تھا۔

اسفر کے صبر کا پیمانہ بھی اب لبریز ہو چکا تھا۔ محاذ پر اکیلے لڑتے لڑتے وہ اب تھک چکا تھا

''ایسا کیا کیا ہے میں نے؟ ہر شخص کی اپنی رائے ہوتی ہے میری بھی ہے میں آپ کو تو آپ کا دین چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا۔ کرتے رہیں جو کرنا ہے سب کو اگر ایسی ہی بڑی طاقت موجود ہے جس سے امی ہر وقت دعائیں مانگتی رہتی ہیں تو کیوں نہیں ٹھیک ہو جاتی عائزہ! کام تو اس کے وہی دوائیں اور علاج آئے گا نا جو سائنس کا مرہونِ منت ہے۔ کیوں نہیں آپ کے وظیفے کام آتے۔''

''اس سے کہو یہاں سے چلا جائے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں، اس گھر میں کسی ملحد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے!'' عباس آپے سے باہر تھے۔

اختر بھی خونخوار نظروں سے اسفر کو دیکھ رہا تھا۔ اتنی پریشانی پر ایک نئی پریشانی سب ہی کے لیے اذیت ناک تھی۔

''تم پاگل ہو گئے۔ ابھی جاؤ یہاں سے۔'' اختر غرّایا۔

''ہاں ہاں جا رہا ہوں، میں بھی ان بے بنیاد دلائل اور بے کار مذہبی عقیدوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ صرف فرسودہ قصہ کہانیاں اور جنتر منتر کچھ نہیں کرنے والے۔ یہ کچھ نہیں صرف ایک تنقیدی سوچ سے بچنے کا بہانہ ہے۔کوئی منطق نہیں اس کی۔''

اسفر اپنے کمرے میں آ چکا تھا اور انتہائی غصے کے عالم میں اپنی ضروری چیزیں اپنے بیگ میں ڈال رہا تھا۔''تھک گیا ہوں میں بھی اس دوغلے پن سے، علاج سائنس سے اور امید خدا سے واہ کیا بات ہے۔'' وہ مستقل بڑبڑائے جا رہا تھا۔

عباس کے چلّانے کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔''گمراہ ہو گیا ہے یہ، لادین ہو گیا ہے، پوری دنیا میں ہمیں بھی ذلیل کروائے گا آخرت میں بھی ذلت اس کا مقدر ہو گی۔''

''اسفر پلیز اب یہ فضول ضد چھوڑ دو۔'' عائزہ اسفر کے پاس کھڑی زار و قطار رو رہی تھی۔

''میں نے کبھی ابو کی ایسی حالت نہیں دیکھی، وہ پہلے ہی میری وجہ سے بہت پریشان ہیں، اب پلیز ان کو مزید پریشان نہ کرو۔'' عائزہ بار بار اسفر کا ہاتھ پکڑ رہی تھی لیکن اب اسفر اپنے آپے سے باہر تھا۔

''انسانیت کے ناطے میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میں ابو کا سہارا بنوں، سب گھر والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سود مند ثابت ہوں۔لیکن مجھے اچھوت سمجھنے لگے ہیں سب، انہیں لگتا ہے میں بہکاوے میں آ گیا ہوں، حالانکہ بہکاوے میں تو وہ خود ہیں مولویوں کے بہکاوے میں۔زندگی اتنی مشکل نہیں ہے جتنی اِن سب نے بنا دی ہے۔'' اسفر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا ٹوتھ برش، ٹی شرٹ، ضروری کاغذات، انتہائی تیزی سے بیگ بھرتا جا رہا تھا۔

''مجھے ہی بیوقوف سمجھتے ہیں، سب جانتے نہیں کہ اصل میں آنکھیں میری ہی کھلی ہیں، میں نے جس چیز کو غلط سمجھا اسے چھوڑ دیا، آپ نہیں چھوڑتے نہ سہی، مجھے تو جینے دیں۔'' اسفر کو تو جیسے موقع مل گیا سب کچھ کہنے کا۔

''کسی نے تمہارا برین واش کر دیا ہے تم تو سب سے زیادہ اچھے مسلمان تھے۔'' عائزہ کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، وہ کسی بے جان پتّے کی طرح کپکپا رہی تھی۔

''اچھا مسلمان تھا تب ہی تو سوچا اور پرکھا، ورنہ تم سب کی طرح کنویں کا مینڈک بنا رہتا۔'' عائزہ کا ہاتھ جھٹکتا ہوا اسفر باہر نکلا۔

عباس لاؤنج میں لکڑی کے صوفے پر ہلکان بیٹھے تھے۔ اسفر کو دیکھ کر انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اسفر نے ان کی بھینچی ہوئی مٹھیاں دیکھیں تو ایک لمبی سانس لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ پیچھے سے عائشہ منہ پر دوپٹا رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اسفر کے دل پر جیسے کسی نے بھاری سِل رکھ دی ہو۔ گھر کی چوکھٹ پار کرنا کس قدر مشکل ہے اسے یہ آج معلوم ہوا تھا۔

...۞...

''تم ایک دن بہت بڑی پوسٹ پر ہوگی، دیکھنا!'' رضیہ نے طوبیٰ کے بالوں میں تیل کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" طوبیٰ نے بڑے ہی عام سے لہجے میں کہا۔

آج اتوار کا دن تھا ورنا شتہ کے بعد رضیہ خود ہی تیل کی بوتل لیے بیٹھی تھیں کہ یہ موقع انہیں آج بڑے دنوں بعد ملا تھا۔ بچوں کے سر میں تیل کا مساج کرتے وہ ان سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتی جا رہی تھیں۔ رمشہ کے بعد اب وہ طوبیٰ کو لے کر بیٹھی تھیں۔

''ویسے ایسا کیوں لگتا ہے آپ کو؟'' طوبیٰ نے ایک وقفے کے بعد سوال کیا۔

''تمہاری آنکھوں کی چمک اور تمہارے ارادوں کی پختگی بتاتی ہے۔'' رضیہ نے نرمی سے اپنی انگلیوں کی پوروں کو اس کی بالوں کی جڑوں میں گھمایا۔ اب وہ اس کو مضمحل دیکھ کر اس کی ہمت بڑھا رہی تھیں یا واقعی ان کو ایسا لگتا تھا طوبیٰ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''میں خواب نہیں دیکھتی امی۔'' وہ یہ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ کسی کے خواب توڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

طوبیٰ کی خاموشی سے رضیہ کے مساج کرتے ہاتھ رُک گئے۔ اُنہوں نے بڑے پیار سے طوبیٰ کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟''

سیاہ حلقے اور زرد چہرہ دیکھ کر طوبیٰ کا دل اِک دم ہی جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

''نہیں امی۔'' اس نے رخ موڑ کر رضیہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''مجھے آپ کی ہر بات صحیح لگتی ہے۔''

رضیہ ہنسنے لگیں اور ساتھ میں طوبیٰ بھی۔

''میں جانتی ہوں بیٹا!'' رضیہ نے محبت سے طوبیٰ کو کاندھوں سے پکڑ کر دوبارہ سیدھا بٹھا دیا اور ایک بار پھر اس کے لمبے بالوں کی جڑوں کو ملائمت سے سہلانے لگیں۔

''اتنی ہلکان مت ہو ایک چھوٹی سی نوکری کے چکر میں، کسی شخص کو وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔''

''کاش کوئی ٹائم مشین ہوتی تاکہ میں براہ راست اس وقت میں چلی جاتی جو میرا ہوتا۔'' اس نے تأسف سے سوچا اور گزرے دن کے انٹرویو کا خیال آتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ گنجا موٹا شخص جس کو وہ انتہائی احترام سے سر کہہ کر مخاطب کر رہی تھی ایک بار پھر نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ جسم میں چبھتی ہوئی نظریں، آنکھوں سے شعلے اگلتی حقارت۔ ان سب کو یاد کرتے ہوئے اس نے نہ صرف اپنے جسم بلکہ اپنے ارادوں کو بھی ایک دم کمزور پڑتا محسوس کیا۔ رضیہ کے متحرک ہاتھ روک کر ایک طرف کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' رضیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

طوبیٰ کے چہرے پر چھائی ہوئی یژمردگی نے رضیہ کو ایک لمحے کے لیے پریشان کر دیا۔

''بس اب کچھ کام کروں گی۔ کچھ اور جگہ ای میل کرنی ہے۔'' یہ کہہ کر آنکھیں چراتی وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اس شخص کا تکبر جیسے ایک سانپ کی طرف اس کے وجود سے لپٹ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس قدر بے عزّتی کا احساس ہوا تھا۔ یہ سوچنا اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا کہ کوئی شخص اس کے حجاب کا سودا کر رہا تھا۔

''اُف!!'' اس نے اپنے دُکھتے سر کو کنپٹیوں سے پکڑ کر دبایا۔

''کیا اس ملک میں رہتے ہوئے دین پر قائم رہنا اتنا مشکل ہے؟'' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ نہ نیند مہربان تھی اور نہ ہی زندگی۔

...۞...

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ دروازے پر اس وقت اطلاعی گھنٹی کا بجنا صرف اس لیے عجیب تھا کیونکہ جو اکیلا شخص دیر سے آیا کرتا تھا وہ خود گھر کے اندر موجود تھا۔

گھنٹی کی آواز سن گھر کے سب سے بڑے فرد نے دروازہ کھولا۔ دراز قامت اور پرکشش شخصیت کے مالک جبران نے حیرانی سے سامنے کھڑے بیس اکیس سالہ پریشان حال نوجوان کو دیکھا۔

''جی بیٹا؟''

''مجھے وکی، میرا مطلب ہے وقار سے ملنا ہے۔ اس کا دوست ہوں، اسفر۔''

''آپ رُکیے میں وقار کو بلاتا ہوں۔''

وکی کے والد جبران کو دیکھ کر اسفر بالکل بھی حیران نہ ہوا تھا۔ یقیناً وقار نے اپنی جاذب نظر شخصیت اپنے والد ہی سے وراثت میں لی تھی۔ اس پر جبران صاحب کا نپا تلا انداز شخصیت میں نکھار، اسفر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کا چہرہ ڈاڑھی مونچھوں سے عاری تھا، اس کے باوجود ان کی رعب دار شخصیت متاثر کن تھی۔

وکی عجلت میں دروازے تک آیا، خوشی اور حیرانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''ارے اسفر لا.....'' وہ بات پوری کرتے ایک دم رک گیا۔

''السلام علیکم'' اس نے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اسفر کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ یونیورسٹی میں وقار سلام تو درکنار کسی کو سلام کا جواب تک دینے کا روادار نہ تھا۔ اس کا انداز ارے لالے اور زوردار جھپّیاں ڈالنے والا تھا۔

''وعل..... وعلیکم السلام'' اسفر کے منہ سے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ نکلے۔ پتا نہیں کتنے عرصے بعد اس نے کسی کو سلام کا جواب دیا تھا اسے خود یاد نہ تھا۔

''میں ڈرائنگ روم کھلواتا ہوں۔'' جبران صاحب تسلی کرنے کے بعد کہ آنے والا وقار کا دوست ہی ہے اب پلٹ چکے تھے۔

''خیریت، تم اس وقت یہاں؟'' وقار نے کھڑے کھڑے پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے اسفر کے کاندھوں سے لٹکتے بیگ کو دیکھا۔''وہ بھی پورے لاؤلشکر کے ساتھ۔''

''یار، میں بہت پریشانی میں ہوں۔''

وقار نے بھنویں سکوڑیں۔''خیریت؟''

اُسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملے کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے۔''اب یہ نہ کہنا تو نے اپنے گھر والوں کو.....'' وقار کہتے کہتے اِک دم رک گیا۔ اور پھر سرگوشی کرتے ہوئے عجلت سے بولا''ابے کہیں تو نے گھر والوں کو بتا تو نہیں دیا کہ تو نے مذہب چھوڑ دیا ہے؟''

اسفر کے لیے یہ حیرت کا دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔ وقار جس طرح کی بے باکی سے اپنے گروپ کے لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر تمام مذاہب کے خداؤں کا مذاق اڑایا کرتا تھا اس سے اسفر کو ہمیشہ سے یہی گمان ہوا تھا کہ اس کو گھر والوں کی سرپرستی حاصل ہے۔لیکن آج وقار کی گھگھیائی ہوئی حالت دیکھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''مجھے لگا تھا تم اور تمہارے گھر والے ہم خیال ہیں۔''اسفر نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''ابے پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میرے ابّا نے اگر مجھے گھر سے نکال دیا تو میں کہاں جاؤں گا؟ اور تم.....''اس نے قدرے زور سے اپنا ماتھا پیٹا۔''ابے بے وقوف آدمی، میں نے کتنی مرتبہ تجھے سمجھایا کہ یہ بات کسی کے آگے نہ کہنا اور تو نے سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو ہی یہ بات بتا دی!'' وقار سرگوشی میں بھی دانت پیس رہا تھا۔

''آپ دونوں ڈرائنگ روم میں آجایئے، بیٹا!'' جبران صاحب کی آواز سنتے ہی وقار ایک دم تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔

''جی ابو!'' وقار نے قدم داخلی دروازے کی طرف بڑھائے۔''آؤاسفر۔''

اسفر غیر یقینی سے وقار کی پیٹھ کو گھور رہا تھا۔ دو مختلف شخصیات کا یہ مجموعہ اسفر کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ مشینی انداز میں وقار کے پیچھے قدم اٹھاتا رہا۔

خوبصورت طرز پر بنا وہ ایک چھوٹا کمرہ تھا جس کو انتہائی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ دیوار پر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی ایک بڑی کیلگرافی آویزاں تھی۔ ہر قدم پر اس کے لیے ایک نیا سرپرائز موجود

تھا۔ جبران صاحب ان دونوں کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

''بیٹھئے بیٹے....'' ان کی بھاری آواز تمام تر نرمی کے باوجود ایسا تاثر لی ہوئی تھی کہ کسی کے لیے بھی انکار ناممکن ہو۔

''آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یونیورسٹی میں وقار کے ساتھ پڑھتے ہیں آپ؟''

''جی۔ اسفر نے مختصر جواب دیا۔

''میں امی کو چائے کا کہہ کر آتا ہوں۔'' وقار مؤدبانہ انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا اور اسفر حیرانی سے اس نئی شخصیت کو دیکھتا رہ گیا۔

''اچھا اچھا تو آپ بھی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔'' ایک اور سوال۔

''نہیں انکل! میں فزکس ڈیپارٹمنٹ میں ہوں، کیمسٹری میرا اختیاری مضمون ہے تو وقار سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔''

''اچھا اچھا..... صحیح'' جبران صاحب نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا''خیریت اتنی رات گئے آج آپ تشریف لائے؟ اصل میں وقار کے دوست گھر پر کم ہی آتے ہیں اور جو آتے ہیں ان سے ہم بخوبی واقف ہیں، آپ سے آج پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تو سوچا آپ سے بھی کچھ بات چیت کر لی جائے۔''

''جی.....'' اسفر جواب میں بس اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ وقار اندر داخل ہو گیا۔

''اور اسفر فزکس کے نوٹس تیار ہو گئے تمہارے؟''

''ہوں؟..... ہاں..... ہاں بالکل.....'' اسفر نے ہاتھ مسلتے ہوئے جواب دیا۔ جھوٹ بولنا اس کی سرشت میں قطعی شامل نہ تھا اسی لیے الفاظ اس کے گلے میں اٹک رہے تھے۔

''انسان یا تو جھوٹا ہوتا ہے یا مسلمان۔'' عباس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

''اب تمہیں اپنے دفاع کے لیے جھوٹ بول سکتا ہوں کیونکہ میں اب مسلمان نہیں ہوں۔ بس میرے جھوٹ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔'' دل ہی دل میں اسفر نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

بس آج ہی مکمل ہوئے ہیں۔ میں تمہارے پاس آ گیا تا کہ ایک دفعہ مل کر مطالعہ کر لیں۔'' اسفر کو اپنی روانی پر خود بھی یقین نہیں آیا۔

جبران صاحب مطمئن ہوتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔چلیں آپ لوگ بیٹھیے، میرے آرام کا وقت ہو گیا ہے۔ جبران صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی وقار اس کے برابر آ بیٹھا۔

''اب بتاؤ ساری بات۔'' دوبارہ سرگوشی۔

"ابو سخت صدمے میں ہیں۔اُن کو لگتا ہے میں بھٹک گیا ہوں۔انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔" وقار نے اپنا ماتھا پیٹا۔

''ابے تجھے کسی نے مشورہ دیا تھا ان کو بتانے کا۔ مجھے دیکھو، آج تک میں نے بھنک نہ لگنے دی کسی کو۔ابو کے ساتھ نماز پڑھنے جاتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، قرآن پڑھتا ہوں۔''

''لیکن یہ تو منافقت ہے۔'' اسفر نے بات کاٹی۔

وقار بے آواز ہنسے گیا .....'یہ مسلمانیت کے جراثیم تیرے اندر سے جاتے جاتے جائیں گے، دیکھ میرے بھائی، ہمارا مذہب انسانیت ہے، ہمیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ یہ دنیا یہ آسمان کسی خدا نے نہیں پیدا کیے ہیں، دنیا مادّے سے بنی ہے اور مادہ ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہتا ہے۔ یہ دنیا ایک زوردار دھماکے کی وجہ سے وجود میں آئی ہے، پھر ارتقا کے مراحل سے گزری اور سائنس نے ترقی کی۔لیکن ہمارے آس پاس کے لوگ اس بات کو نہیں مانتے، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ہم بھیڑیوں کے بیچ میں رہتے تھے۔ ایک دن اچانک ہمیں پتا چلا کہ ہم تو انسان ہیں جو بھیڑیے کی کھال میں رہتے ہیں اور انسان عقلمند ہوتا ہے۔اب تُو خود بتا، تو کھال اتار کر سب کو بتائے گا کہ مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں انسان ہوں یا اس وقت تک بھیڑیے کا ناٹک کرے گا جب تک ان کے غول سے دور نہ نکل جائے۔''

اسفر خاموش بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا۔اسے لگا تھا وقار اس کی مدد کرے گا کیونکہ وہ اس کا ہم خیال تھا لیکن یہاں تو بازی ہی پلٹ گئی تھی۔

''تو بس بھئی میں نہ ابھی کما سکتا، نہ کھا سکتا تو میں نے بھی یہ مذہب کی کھال پہن رکھی ہے۔تم بھی واپس یہ کھال اوڑھو اور جب خود مختار ہو جاؤ تو بہتر ہے پاکستان سے کہیں دور چلے جاؤ جہاں شخصی آزادی ہو اور پھر سکون سے بغیر کسی آقا کہ آزاد زندگی جیئو۔اپنا تو یہی پلان ہے بھائی۔''

اتنی دیر میں چائے آ چکی تھی۔ وقار نے چائے اسفر کے سامنے رکھ دی۔ چائے میں سے اُڑتی ہوئی

بھاپ اسفر کو اپنی زندگی جیسی ہی لگی، لمحہ لمحہ ہوا میں گھلتی ہوئی جس پر کسی کا اختیار نہ تھا۔

''میں تمہیں کافی دیر سے فون کر رہا تھا، پوچھنے کے لیے.....'' اسفر بات مکمل کرتے ہوئے ہچکچایا۔

''ارے یار! بس وہ ذرا کچھ دیکھ رہا تھا فون پر اور تیری کال بار بار ڈسٹرب کر رہی تھی تو کاٹ دی تھی۔'' وقار نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اسفر نے سوالیہ نظروں سے وقار کی طرف دیکھا ''نئی ویڈیو بھیجی تھی خرم نے، مست تھی یار بس ختم ہی ہونے والی تھی کہ تُو آ گیا۔''

وقار کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کس قسم کی ویڈیو کی بات کر رہا تھا تب ہی اسفر نے نظریں نیچے جھکا لیں۔

''لیکن یہ غلط بات ہے۔'' مدھم سی آواز نکلی۔

''ہاہاہا'' وقار کی ہنسی چھوٹ گئی۔" کیسے؟"

اسفر کچھ کہتے کہتے اِک دم خاموش ہو گیا۔

کیا میں نے کسی سے زبردستی کی ہے کہ وہ مجھے اپنا جسم دکھائے؟''

اسفر اب بھی خاموش تھا ''نہ ہی میں ان لڑکیوں کو برا سمجھتا ہوں جو پورنوگرافی کا حصہ ہیں۔ یہ ان کی نوکری ہے اور نوکر کی تے نخرہ کی، لالے؟'' وقار نے دانت نکو سے۔

"یہی ہے آزاد زندگی، بلا خوف وخطر۔ میں کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام کرتا ہوں۔ یہ دنیا ایک خوبصورت جگہ ہے اور یہاں ہر شخص کو کچھ عرصہ گزارنے کے لیے ملا ہے۔ جیو اور جینے دو، یہی میرا ایمان ہے۔''

''لیکن اخلاقیات اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ آپ کسی کو بے لباس دیکھیں۔'' اسفر نے مزاحمت کی۔

بالکل غلط، اخلاقیات اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کسی کا نقصان کریں، کسی کے جذبات مجروح کریں، کسی کی حق تلفی کریں اور اپنے گھر یعنی اس دنیا کو نقصان پہنچائیں.....اور میں اس میں سے کوئی کام نہیں کرتا۔ یہی میرا مذہب ہے۔''

اسفر خاموش بیٹھا رہا۔

''اپنے آس پاس دیکھو مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو، بدھ مت غرض جو بھی مذہب کا پرچار کرنے

والے ہیں، وہ سب یہ کام کرتے ہیں، اب تم ہی بتاؤ کون سا مذہب بہتر ہے؟ ہمارا یا ان کا، منافق کون ہے ہم یا وہ؟''

اسفر کے پاس وقار کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا، جواب تو اس کے پاس اس بات کا بھی نہ تھا کہ اب ا سے آگے کیا کرنا تھا۔

''کیا میں آج رات تمہارے گھر پر گزار سکتا ہوں؟'' اسفر نے کچھ توقّف کے بعد سوال کیا۔

وکی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ ''صرف ایک رات۔'' وکی نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ''اس کے بعد اس معاملے میں تمہاری مدد کرنا میرے لیے مشکل ہوگا، ہاں لیکن جتنا ہو سکا میں کوئی انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر وکی نے اپنا موبائل نکالا اور نمبر ملانے لگا۔

اسفر نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ چار گھنٹے سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد وہ بالآخر وقار کے پاس آیا تھا اور اس سے پوری امید تھی کہ وقار کے پاس سے اس سے بھرپور مدد مل جائے گی لیکن اس کے تمام اندازے اور گمان بھاپ کی طرح اُڑ گئے تھے۔

''ہیلو سنی! کیسے ہو؟'' وکی نے اپنے کسی دوست کو کال ملائی تھی

''یار! میرے ایک دوست کو مدد کی ضرورت ہے۔ اپنے ہی مذہب کا ہے وہ۔''

اسفر خاموشی سے گفتگو سن رہا تھا۔ وہ شدید وحشت کا شکار تھا اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اُدھر وقار کے پرجوش انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے کامیابی ملی ہے۔

''چل بھئی لالے، تیرا کام تو ہو گیا۔'' وقار نے موبائل فون صوفے پر لڑھکاتے ہوئے کہا۔

''واقعی؟'' اسفر کو یقین نہ آیا، اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس شہر میں اس کے ہم خیال اور بھی تھے لیکن ان سے اسفر کو مدد مل سکتی تھی اس کا اسفر کو رتّی بھر بھی اندازہ نہیں تھا۔

''صرف اس شہر میں ہی نہیں ملک بھر میں جگہ جگہ ہم جیسے لوگ موجود ہیں، زیادہ تر یہ لوگ سوشل میڈیا پر ایک دوسرے سے رابطے میں ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو مذہب کے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ مدد وقتی ہوتی ہے یعنی آپ کو کچھ دنوں کے لیے رہائش فراہم کر دیں گے، فنڈ اکٹھے ہوں اگر، خوش قسمتی سے آپ کو باہر بھی بھجوا سکتے ہیں کیونکہ اب ان کا رابطہ بیرون ملک لوگوں سے بھی ہے اور وہ ایسے لوگوں کی دل و جان سے مدد کرتے ہیں۔ اس دوران میں مطلوبہ شخص اپنے

پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔'' وقار نے تفصیل سے بتایا۔

اسفر کو وقار کے اوپر رشک آیا۔ نہ صرف وہ بلا کا ذہین تھا بلکہ حالاتِ حاضرہ اور ممکنہ ذرائع سے مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ واحد چیز جس سے اُسے دلی صدمہ پہنچا تھا وہ مسلمانیت کا وہ ڈھونگ تھا جو وقار نے رچا رکھا تھا۔ لیکن جن حالات سے اسفر اس وقت دو چار تھا وہ ایسی پوزیشن میں نہ تھا کہ اس بارے میں کوئی بات کر سکتا۔ حالات کتنے گھمبیر ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ اُسے بخوبی ہو گیا تھا۔

''ڈاکومینٹس ہیں تمہارے پاس؟'' وقار نے ٹٹولتی نظروں سے اسفر کو دیکھا۔

''ہاں سب ہی کچھ ہے۔'' اسفر نے بیگ پر ہاتھ رکھا۔

''یہ ہوئی نا بات!'' وقار نے اسفر کی ران پر ہاتھ مارا اور پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔

...۞...

''بہت مبارک ہو!'' طوبیٰ نے ثناء کو خوش دلی سے مبارکباد دی۔

''تھینک یو یار!'' ثناء خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ ''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری سلیکشن ہو گئی ہے۔ کتنے سارے امیدوار تھے انٹرویو کے لیے اور صرف چند لوگوں کی سلیکشن ہوئی۔ تمہارا تو مجھے یقین تھا کہ تم انٹرویو میں کامیاب ہو جاؤ گی لیکن اپنا نہیں پتا تھا۔''

آخر کار وہ سانس لینے کو رُکی۔

''میری سلیکشن نہیں ہوئی۔'' طوبیٰ نے انتہائی اطمینان سے جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اس وقت طوبیٰ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔

''کیا!!'' ثناء جس نے پانی کے گلاس سے پہلا ہی گھونٹ لیا تھا، اُسے زور کا اچھو لگا۔

طوبیٰ نے لپک کر پانی کا گلاس تھاما اور ثناء کی پیٹھ سہلانے لگی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' ثناء نے گلا کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے کہا ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہارا تو تعلیمی ریکارڈ بھی اتنا شاندار ہے اور تم مجھ سے کہیں زیادہ پر اعتماد ہو۔'' ثناء کے لیے طوبیٰ کی بات ناقابلِ یقین تھی۔

''تم اپنے آپ کو ہمیشہ اندر اسٹیمیٹ کرتی ہو۔'' طوبیٰ نے بات بنائی۔ ''انہیں قابلیت کی پہچان تھی تب ہی تو تمہیں چنا ہے۔'' جس غصہ اور نفرت کو دبائے ہوئے طوبیٰ نے یہ بات کہی تھی یہ وہ ہی جانتی تھی

بالکل اسی طرح جیسے قبر کا حال مردہ جانتا ہے۔

''میں نہیں مان سکتی، اصل بات بتاؤ مجھے۔'' ثناء طوبیٰ کی بچپن کی دوست تھی اور طوبیٰ ایک بری اداکارہ۔ سچ تو سامنے آنا ہی تھا۔

''میرا خود بھی دل نہیں تھا یہاں کوئی جاب کرنے کا۔'' طوبیٰ نے جان چھڑائی۔

ثناء نے اسے ایک گھورا جیسے وہ کوئی چھوٹی بچی ہو اور طوبیٰ اسے بہلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

آخر کار طوبیٰ نے ہتھیار ڈال دیے ''ارے بھئی! میرا لباس ان کے معیار کے مطابق نہ تھا۔''

ثناء کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''تو اس میں کون سی بڑی بات تھی۔ بندہ ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے۔''

طوبیٰ کی خاموشی نے ثناء کو اشارہ دیا۔

''ایک منٹ..... اب یہ نہ کہنا کہ تم نے خود انہیں منع کر دیا کہ تم اپنے آپ میں کوئی بدلاؤ نہیں لا سکتیں۔''

وہ دونوں چند ساعتیں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتی رہیں۔

''اوہ میرے خدا!'' ثناء نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''تم جیسا بے وقوف میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ کتنا اچھا پیکج دے رہے تھے وہ فریش گریجویٹس کو بھی۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔''

ثناء کا افسوس ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''حد ہے طوبیٰ اکبر اور بے حد ہے۔ اتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔''

طوبیٰ کوفت زدہ بیٹھی اپنا پاؤں جھلا رہی تھی۔

''اب کچھ بولو بھی!'' ثناء نے کوئی جواب نہ پا کر چڑ کر کہا۔

''کیا بولوں؟ تمہیں پتا ہے میری ترجیحات۔ میں اپنے حجاب پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ جس نے مجھ سے کام لینا ہے ایسے ہی لینا ہوگا۔''

''پاگل! ۲۰۲۲ ہے یہ ۱۹۶۰ نہیں۔ اس دقیانوسیت سے باہر آجاؤ۔ میں بھی مسلمان ہوں اور تمہاری طرح پانچ وقت کی، یا چلو چار وقت کی نماز تو میں بھی پڑھتی ہوں۔ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔''

طوبیٰ نے تو آج جیسے نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی وجہ صرف وہ بے غرض دوستی تھی جو ثناء نے آج تک نبھائی تھی۔ ہر مشکل وقت میں وہ اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

وہ اس کی ہمراز بھی تھی اور غم گسار بھی۔ کچھ بھی کہہ کر وہ اس کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حسبِ عادت بک جھک کر ثناء خاموش ہو گئی۔

''چلو چھوڑو۔'' وہ خود ہی ہار مان چکی تھی'' اب پھر اخبار چاٹوں گی تمہاری خاطر کسی نئی آسامی کے لیے۔'' ثنا نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس دوبارہ اٹھا لیا۔

...۞...

گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ انتہائی سود مند اور آسان ثابت ہوا تھا۔ اگلے دن وہ یونیورسٹی کے بعد وکّی کے ساتھ ان لوگوں سے ملا جن سے انہیں مدد کی امید تھی۔ وہ سب انتہائی ماڈرن اور آزاد خیال تھے۔ اپنی دھن میں مگن لیکن اسفر کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھے۔ اسفر کافی مطمئن تھا لیکن عائزہ اور عائشہ کا خیال بار بار اسے ستا رہا تھا۔ عباس کی جو حالت اس نے کل دیکھی تھی وہ اسے زندگی بھر خود کچوکے لگانے کے لیے کافی تھی لیکن ''میں نے تو کوشش کی تھی'' کی گردان اس نے دل میں جاری رکھی ہوئی تھی جو غالباً اپنے ضمیر کو تھپکی دے کر سلا دینے کی کامیاب کوشش تھی۔

آنے والے دن انتہائی مصروف گزرے۔ اس کو رہائش فراہم کر دی گئی تھی۔ وہ ایک ساتھی کا گھر تھا جو بالکل خالی تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔

ایک گدّا اور چند کام کی چیزیں وقار اور اس کے دوستوں نے اسفر کے لیے مہیا کر دی تھیں۔ سنی جس سے وقار نے رابطہ کیا تھا اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور ایک اچھے ادارے میں نوکری کر رہا تھا۔ اس نے کینیڈا کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔

عائزہ کے علاج کے سلسلے میں اسفر کی پڑھائی کا بہت حرج ہوا تھا۔ یہ اس کا تیسرا سال تھا اور ماسٹر مکمل کرنے کے بعد وہ بآسانی ملک سے باہر یونیورسٹی میں اپلائی کر سکتا تھا۔

تین مہینے کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اس نے کئی دفعہ کوشش کی کہ عائشہ سے رابطہ کرے لیکن چاہ کر بھی وہ ایسا نہ کر سکا۔ زیادہ تکلیف اسے اس بات سے ہوئی تھی کہ دوسری طرف سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید اس کے دل میں تھی کہ شاید کسی دن اس کے خون کے

رشتے اسے یاد کر لیں لیکن یہ سب ایک امید ہی رہی حتیٰ کہ اس کا نتیجہ آ گیا۔ اس نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پارٹ ٹائم فری لانسنگ سے اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی۔ رہائش کا فی الوقت کوئی مسئلہ نہ تھا صرف فیس اور کھانا پینا، وہ کافی مطمئن تھا۔

''واہ لالے! تیری تو زندگی سیٹ ہو جائے گی۔'' وکی نے اس کی پیٹھ پر ایک زوردار تھپکی دی۔

وہ دونوں یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھے تھے اور خوشبودار چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اسفر خوش دلی سے مسکرا دیا۔''ہاں! اب سب کچھ بہت سادہ اور آسان لگتا ہے۔ تمہاری مدد نہ ہوتی تو بڑی مشکل ہو جاتی۔'' اسفر نے تشکر بھرے انداز سے کہا۔

''ارے ہم تو یاروں کے یار ہیں۔'' وکی نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں لیکن پہلے دن تو تم نے مجھے بھگا ہی دیا تھا۔'' اسفر نے ہنستے ہوئے چائے کی پیالی منہ سے لگائی۔

وکّی نے ایک جاندار قہقہہ لگایا۔''دیکھ بھائی، میرے باپ کا مذاق نہیں، اُن سے پنگا لینا فی الوقت میں افورڈ نہیں کر سکتا۔'' وکی یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر بیٹھ گیا اور کسی گانے کی دھن گنگناتا ہوا ایک پاؤں جھلانے لگا۔

اسفر نے اثبات میں سر ہلا یا دیا۔

''ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔ سنی سے رابطہ کروا کر کام بنوا دیا تم نے میرا۔'' اسفر بھی اب ٹانگیں آگے کی جانب پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے ایک سکون کو اپنے اندر اُترتا محسوس کیا۔ اس کا ذہن اب ہر طرح کی فکروں سے آزاد تھا۔ ذہنی آسودگی نے اس کی سوچ کے زاویے بدل دیے تھے۔ گھر والے اسے اب بھی یاد آتے تھے لیکن شکایتی انداز میں۔

''میں اس رویے کا مستحق نہیں تھا۔'' اسے جب بھی گھر والے یاد آتے اپنے ساتھ کی گئی بے عزتی کی فلم از سرِ نو ذہن میں چلنا شروع ہو جاتی۔

''کاش، میں اپنے گھر والوں کو بھی سچ دکھا سکتا۔'' اسفر نے تأسف سے سوچا۔

عائزہ کا خیال اسے جب بھی آتا وہ یہی سوچتا کہ علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو گئی ہو گی۔ ایک طرح سے وہ عائزہ کا شکر گزار بھی تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا راز فاش ہوا اور جو ہوا تھا اچھا ہی ہوا تھا۔ زندگی میں آسمان پر ایک آزاد پرندے کی طرح اڑنے کا ایک الگ ہی مزہ تھا۔

''آگے کا ارادہ کیا ہے؟'' وکی نے اسے ٹہوکا دیا۔

''جرمن سیکھ رہا ہوں، مختلف یونیورسٹیز میں اپلائی کروں گا جس سے کال آ جائے گی۔ میری اپنی کوئی خاص پسند نہیں۔ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک سال سے پہلے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''ہوں.....'' وقار نے کہا۔ پھر اِک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چل آج تجھے جنت کی سیر کرواؤں۔''

''جنت؟'' اسفر کو ایک دم جھٹکا لگا، وکی اس صورتحال سے خوب محظوظ ہوا۔

''کون سی جنت بھائی؟'' اسفر نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ جنت اور دوزخ کا ذکر تو زمانہ ہوا بھلا دیا تھا اب اچانک وکی کے منہ سے جنت کا نام سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''ارے اپنی جنت بھئی، اب دیکھو ہمارے لیے تو دنیا ہی میں سب کچھ ہے نا، اسی لیے ہم نے اس دنیا کو ہی جنت بنا لیا ہے، کچھ بے وقوف بیٹھے ہوں گے۔ ابھی بھی اس جنت کے انتظار میں جو مرنے کے بعد ملے گی۔'' وقار نے اپنی ہی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ایک جاندار قہقہہ لگایا۔ اسفر نے بھی اس کے ساتھ اس لطیفے کو بھرپور انجوائے کیا تھا۔ وکی نے آگے قدم بڑھائے تو اسفر نے بھی اس کی تقلید کی۔

یونیورسٹی سے آدھے گھنٹے کے مسافت کے بعد وہ ایک جانی پہچانی سڑک پر تھے۔ اس سڑک پر ایسا کچھ خاص نہیں تھا جو اسفر کو اچنبھے میں ڈالتا، حیرت کا اصل جھٹکا تو اسفر کو اس وقت لگا جب ایک پیڈسٹرین برج کے نیچے کھڑی ایک عبایا پہنی لڑکی کے پاس وکی نے بائیک روک دی۔ دبلی پتلی اور لمبی وہ لڑکی سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو کالے عبائے میں چھپائے ہوئے تھی۔ عبایہ میں لڑکی کی آنکھیں کچھ خاص پرکشش نہ تھیں۔ وکی کی اس لڑکی سے چند لمحوں کی گفتگو نے اسفر کو اِک دم چوکنا کر دیا۔

''وکی! آگے بڑھو، یہاں کیوں رک گئے ہو؟'' اس نے پریشانی سے وکی کے کندھے کو اپنے ہاتھ سے دبایا۔

وکی اسفر کی بات پر سر ہلاتے ہوئے دوبارہ اس لڑکی سے سودے بازی میں مصروف ہو گیا۔

اسفر کی کان کی لوئیں سرخ ہو گئی تھیں، اب وہ لڑکی بڑی دلچسپی سے اسفر کو دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بچہ اپنے کھلونے کو دیکھتا ہے۔

''ٹھیک ہے پھر، آدھی ادائیگی ابھی اور آدھی بعد میں .....ایک لڑکا اور ایک لڑکی.....'' اسفر کے سر پر گویا کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ جھٹ سے بائیک سے اتر کھڑا ہو گیا ہے جیسے اس نے وکی کے کندھے پر نہیں بلکہ کسی نجس جانور کے اوپر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

وکی کی شرارتی مسکراہٹ اب اسے ایک شیطانی مسکراہٹ لگ رہی تھی۔

''آجا لالے! آج ہم صرف Calebrate کریں گے۔''

''تم.....تم.....'' اسفر کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے زیادہ غصہ سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ کر آیا تھا یا وکی کی بے حیائی پر۔

وکی اسفر کی حالت دیکھ کر جواباً ہنسنے لگا۔

''مجھے اس سب میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' اسفر نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

وکی نے جھک کر اسفر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سر کی جنبش سے بائیک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسفر ہچکچاتا ہوا واپس بائیک پر بیٹھ گیا لیکن اس بار اس نے خاص کوشش کی کہ وہ وکی سے ذرہ برابر بھی مس نہ ہو۔ وکی فحش ویڈیوز دیکھتا تھا، لیکن کسی لڑکی سے افیئر نہیں چلاتا تھا، اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ وکی مختلف لڑکیوں سے تعلق میں تھا اور جو شخص افیئر نہ چلاتا ہو لیکن اس کی ساری جسمانی ضرورتیں پوری ہو رہی ہوں تو کسی کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی کہاں سے حاصل کرتا تھا۔

جس جگہ وکی نے لڑکی سے ملاقات کی تھی وہ اسفر کے لیے بالکل نئی نہ تھی، لیکن اس لڑکی کی یہ نئی پہچان جس کو شاید کبھی اس نے نوٹس کیا بھی ہو تو احترام کی نگاہ ہی سے دیکھا ہوگا، اس کی خوش گمانی کے پرخچے اڑانے کے لیے کافی تھی۔

اب وکی گلیوں کے اندر جن راستوں پر جا رہا تھا اسفر ان سے ناواقف تھا۔ وہ گلیاں نہ بہت چوڑی تھیں اور نہ بہت پتلی۔ لیکن صفائی کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے اور کوئی خاص چہل پہل بھی نہ تھی۔

''عینی کے پاس تمہاری شکل دیکھ کر مجھے لگا ہی نہیں کہ تم وہ اسفر ہو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھے تو لگا تم وہ ہو جو دو سال پہلے تھے، مولوی ٹائپ۔'' وکی نے ہلکی سی گردن موڑ کر اسفر سے کہا تو مجبوراً اسفر کو بھی آگے جھک کر اس کی بات سننی پڑی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔

اسے اُبکائی سی محسوس ہوئی اور چلتی ہوئی بائیک پر ہی اس نے جو کچھ پیٹ میں تھا اگل دیا۔ وکی نے بھی گھبرا کر بائیک روک دی۔ اسفر سڑک کے کنارے نڈھال بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے اپنی ماں عائشہ بڑی شدت سے یاد آئیں۔

دل میں ایک زور کی ٹیس اٹھی۔ اسے لگا کہ وہ کسی سراب میں ہے۔ جی چاہا کہ چلا کر رونا شروع کر دے لیکن پھر اپنی کمزوری پر بے تحاشہ غصہ بھی آیا۔ جو بھی راستہ تھا اس کا اپنا چنا ہوا تھا۔ اب تک جو زندگی گزار چکا تھا اس سے فرار بالکل بھی آسان نہ تھا۔

وکی فکرمند سا اس کے پاس ضرور کھڑا تھا لیکن اسفر کی حالت سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کے لب بھنچے ہوئے تھے اور وہ غالباً کوئی بھی سخت بات کہنے سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد وکی نے دوبارہ بائیک اسٹارٹ کی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسفر اب اس کے ساتھ محوِ سفر تھا۔

.....۞.....

اگلے دن اسفر سو کر اٹھا تو خود کو کافی پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ وکی رات بغیر کچھ کہے اسے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ رات کی کثافت کچھ چھٹی تو ذہن بھی کچھ سوچنے سمجھنے کہ قابل ہوا۔

"تم دوسال پہلے والے اسفر لگ رہے ہو، مولوی ٹائپ۔" وکی کی آواز کی سرگزشت پر اس نے اپنا سر جھٹکا۔

''میں بھی کیا کرتا ہوں؟'' اس نے تأسف سے سوچا اس طرح وکی سے گھن کھانے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ ہر شخص آزاد ہے اپنی سوچ میں، اپنے اعمال میں۔'' اسفر کو شرمندگی نے آگھیرا۔ وہ سوچوں میں گم پریشانی سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے کھڑا ہو گیا۔

"وکی یقیناً مجھ سے ناراض ہوگا۔"

اسفر اب خاصہ فکرمند تھا۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ اس کا کل کا رویہ اب خود ہی اسے نامناسب معلوم ہو رہا تھا۔ جو بھی تھا وکی نے اس وقت اس کی مدد کی تھی جب اس کے اپنوں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اور نہ ہی وکی نے ایسا کوئی غلط کام کیا تھا کہ اسفر اس سے باز پرس کرتا، چائے بنانے کے دوران ہی اس نے وکی کو فون ملایا۔ ڈبل روٹی کے دو سلائس چائے سے کھانے کے بعد کافی دیر فون کی گھنٹی بجتی رہی اور بالآخر ایک خودکار آواز کی مخصوص بیپ کے ساتھ کال منقطع ہو گئی۔

وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھاپ اڑاتی چائے اب ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ دو گھونٹ میں چائے کو حلق سے نیچے انڈیل کر سامنے خالی ذہن کی کیفیت میں کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ سامنے کی سڑک پر کوئی خاص چہل پہل نہ تھی۔ اس کو ایک سناٹا سا محسوس ہوا۔ اپنی ذات کے اندر بھی اور باہر بھی۔

''میں صحیح سوچ رہا ہوں نا!'' اندر سے ایک سرگوشی اُبھری۔

''ہاں تو اور کیا'' جواب سرگوشی نہ تھا۔ معلوم نہیں وہ کس کو یقین دہانی کرا رہا تھا۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، سگریٹ سلگائی اور کھوئے کھوئے قدموں کے ساتھ بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ تھی لیکن اسے بری محسوس نہ ہوئی۔ جسم کے اندر جو گھٹن کا احساس تھا اس میں کھلی فضا فی الوقت ناگزیر تھی۔ موسم کی شدت سے بے پرواہ سڑک پر ٹہلنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت سے جیسے اس کے اندر توانائی دوبارہ ذخیرہ ہو رہی تھی۔

''سورج'' اس نے مسکرا کر سوچا''سائنس نے کیا ہی کرشمے آشکار کیئے ہیں جو مجھے سمجھ میں آیا کہ کائنات، یہ زمین، چاند سورج، ستارے ارتقاء کے طویل سفر کے بعد اس قابل ہوئے کہ انسانی وجود تشکیل پایا۔ ورنہ تو میں نرسری رائم کا ایک ہی راگ الاپ رہا ہوتا۔''کس نے بنایا سورج کو؟ ربّ نے بنایا سورج کو''

وہ اپنے ماضی پر مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گیا۔

''لیکن شروعات کہاں سے ہوئی ہوں گی؟'' پھر ایک سرگوشی اُبھری۔ اس بار اسفر کو اپنے اندر کی آواز کو نظر انداز کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ دو دہائیاں ایک عقیدے پر گزاری تھیں، اس تبدیلی میں وقت تو لگنا تھا۔ حالانکہ بعض اوقات اندر سے آنے والی آوازیں اتنی طاقتور ہوتیں کہ اس کو دلائل دینے پڑتے۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ اپنے جانے میں سچ کا انتخاب کر کے اُس نے روشن خیالی کا مظاہرہ کیا تھا۔

تشنگی تھی تو بس ایک.....وہ عام سی لڑکی جو اس کے لیے بہت خاص تھی۔

کسی کو کیا خبر ٹھکرائے جانے کا احساس کیا ہوتا ہے؟ انسان کہنے کو تو آگے بڑھ جاتا ہے لیکن دل کہیں پیچھے ہی چھوٹ جاتا ہے۔ نامراد رہنے کی خلش کبھی نہیں مٹتی۔

وقت آہستہ آہستہ سارے زخم مندمل کر رہا تھا بس ایک وہ تھی جو روگ کی طرح لگی تھی۔

آخرت کی اب فکر نہ تھی جو کچھ تھا بس دنیا ہی میں تھا لہٰذا چاہ تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اسفر نے ایک لمبی سانس بھری۔''نہ جانے کہاں کھوٹ تھا!'' اس نے خود کلامی کی۔

''میری محبت تو بالکل پاکیزہ تھی بالکل اس کے نام کی طرح۔''

کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد وہ مایوسی سے مڑا اور یونیورسٹی جانے کی تیاری شروع کر دی۔

.....۞.....

کُن فَیَکُنْ، فَیَکُنْ، فَیَکُنْ،
جب کہیں پہ کچھ نہیں تھا
وہی تھا وہی تھا وہی تھا
وہ جو مجھ میں سمایا
وہ جو تجھ میں سمایا
مولا وہی وہی مایا

رمشہ موبائل کان سے قریب کئے مسرور سی بیٹھی تھی نیز قوالی سنتے ہوئے اپنا سر بھی دھن رہی تھی۔ قوال کی آواز بھی لاجواب تھی اور سُر بھی۔ رمشہ نے ایک مرتبہ قوالی ختم ہونے کے بعد ری پلے کا بٹن دبایا اور ایک بار پھر جھومنے لگی۔

رنگریزا..... رنگریزا کی صدا کمرے میں گونج اٹھی۔

من کے میرے یہ بھرم
کچے میرے یہ کرم

طوبیٰ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ٹھٹک کر رُک گئی۔ دل ابھی تک بوجھل تھا اور قوالی کے بول گویا اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔

رمشہ بدستور ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے موسیقار کے فن سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مسہری کے ہیڈ ریسٹ پر سر ٹکائے سامنے پھیلے ایک کے اوپر ایک رکھے پاؤں کو ہلکا ہلکا تھرکاتے وہ پرسکون تھی۔

طوبیٰ نے اندر داخل ہونے کے بعد کمرہ کا دروازہ بند کیا اور آہستگی سے آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ آج کل اس پر پچھلے تمام ناکام دنوں کا بھوت پوری طاقت کے ساتھ حاوی تھا اور حوصلوں کے ٹوٹنے سے وجود بھی چٹخنے لگا تھا۔

''اللہ میاں جی! میرے کرم بھی کچے ہیں، کوئی لمبی چوڑی فہرست نہیں میرے نیک اعمال کی..... بس کوشش کر رہی ہوں کہ نیکی کہ جس سیڑھی پر کھڑی ہوں اس پر جمی رہوں..... نیچے نہ اتروں۔

میرے رب بس! اب مجھے اور نہ آزما۔ تیری یہ بندی بہت کمزور ہے۔ گرنے لگوں تو تھام لینا مجھے۔ میرے کچے کرموں کو پکا کر لے۔ کُن کہہ دے۔''

طوبیٰ الگ ہی اِک دوڑ سے بندھی ہوئی تھی جب رمشہ کی آواز اسے اِک دم حال میں کھینچ لائی۔

''کیا خوب گایا ہے بھئی! بس انسان سنے تو سر ہی دھنتا جائے۔'' رمشہ بالآخر موبائل کی لو بیٹری دیکھ کر اُسے سائیڈ پر رکھ چکی تھی اور بادلِ نخواستہ کتابیں اپنی طرف سرکا رہی تھی۔

''کسی دن امی نے تمہارا سر دھن دینا ہے اگر انہیں پتا چلا کہ کمرے میں تم سارا وقت موبائل سے چمٹی رہتی ہو۔''

طوبیٰ اپنی الماری کی طرف گئی اور کپڑوں کے نیچے احتیاط سے رکھی نوٹ بک نکال لی۔ طوبیٰ کا خیال تھا رمشہ منہ بسورتی اپنی کتابوں میں سر دے کر بیٹھ گئی ہوگی لیکن پلٹنے سے پہلے ہی اس کی شرارت

بھری آواز سن کر سخت کوفت زدہ ہوئی۔

''بڑی چھپا کر رکھی ہے بھئی۔''

طوبیٰ بغیر دیکھے بھی بتا سکتی تھی کہ رمشہ سب چھوڑ چھاڑ کر اب اسے ہی تک رہی ہوگی۔

''تمہاری ٹوہ لینے کی عادت نہیں جائے گی!'' طوبیٰ نے جل کر کہا اور بستر پر آ بیٹھی۔

''اب ایک ہی کمرے میں، ایک ہی الماری میں ہمارا سامان رکھا ہے اور جب تم عین سامنے کھڑے ہو کے خفیہ خانوں سے کچھ برآمد کرو گی کیا کسی کو پتا نہیں لگے گا؟''

رمشہ نے طوبیٰ کا مذاق اُڑانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور دلچسپی سے اُسے پیچ و تاب کھاتے دیکھتی رہی۔

پھولے منہ کے ساتھ طوبیٰ کچھ بدمزہ ہوئی۔ اپنے جذبات کو صفحات پر منتقل کرنا اس کے لیے راحت کا سبب ہوتا تھا۔ اس کی تحاریر اسے کسی کٹہرے میں کھڑا نہیں کرتی تھیں، بس خاموشی سے اس کی سنے جاتی تھیں۔ اپنے دل کا ہر حال وہ بلا جھجک بیان کر دیتی تھی۔ آج بھی جب مایوسی کی انتہاؤں پر اسے شدید چاہت تھی کہ وہ سکون سے اپنا کتھارسس کر سکے، آس پاس کی الجھنوں سے نکل کر سکون کی وادیوں میں اُتر جائے تو اُس نے اپنی پسندیدہ نوٹ بک تھامی تھی۔ اسے کسی بھی کام کے دوران مداخلت سے چڑ تھی اور ہمیشہ سے یہ کام رمشہ بخوبی انجام دیتی تھی۔

''بائی داوے، تمہیں یاد کروا دوں کہ یہ نوٹ بک میری ہی تھی۔'' رمشہ نے پھر چڑایا۔

''اور اس کی چار گنا قیمت دے کر میں نے یہ آپ سے خرید لی تھی سو اب یہ میری ہے۔''

طوبیٰ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ رمشہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہار ماننے کا اشارہ کیا۔

''اچھا بھئی! تم تو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہو۔ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ کم از کم میری پسند کی داد ہی دے دو۔'' رمشہ ابھی بھی شرارت کے موڈ میں تھی۔ ''ویسے ایسا کیا نظر آیا تمہیں اس نوٹ بک میں جو یہ عام سی پانچ سو روپے کی نوٹ بک تم نے مجھ سے دو ہزار میں لے لی۔ ویسے تو تم بڑی کنجوس ہو؟''

طوبیٰ نے کندھے اُچکائے ''بس مجھے اچھی لگی۔'' مختصر جواب کے بعد طوبیٰ نے یوں ظاہر کیا جیسے

رمشہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔کوئی جواب نہ پا کر بالآخر رمشہ بھی اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

طوبیٰ اس سفید نوٹ بک کو دیکھے گئی جس پر ایک جانی پہچانی واٹر کلر ڈرائنگ تھی۔ایسا ایک خاکہ کبھی کسی نے اُس کی اسکول نوٹ بک کے آخری صفحے پر بنایا تھا۔فرق صرف رنگوں کا تھا۔ایک نظر میں نظر آنے والا وہ خوبصورت قوس وقزح کے رنگوں کا پھول دراصل ایک نسوانی وجود تھا۔اپنے اطراف رنگ بکھیرتا۔دھنک رنگ ایک خاموش پیغام اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔گولائی میں ہاتھ گھماتا اور پیچھے رنگ چھوڑتا وہ وجود کس کی تخلیق تھا، یہ بھی وہ جانتی تھی جس نے اس واٹر کلر ڈرائنگ کو اور خاص بنا دیا تھا۔

طوبیٰ نے ایک گہرا سانس لیا اور نرمی سے سرورق پر ہاتھ پھیرا کہ شاید چھونے ہی سے کچھ رنگ اس کی زندگی میں آجائیں۔اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو آسمان پر یونہی کامیابیوں کے رنگ بکھیرتے دیکھا۔

''بہت جلد.....ان شاءاللہ!'' اُس کے لب غیر محسوس انداز میں ہلے۔

''آپی! مجھے میتھ کے کچھ سوال سمجھ نہیں آرہے، سمجھا دیں گی؟'' حسنہ کی آواز پر طوبیٰ نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔''میرا ٹیسٹ ہے کل۔''

''تمہیں آج یاد آیا ہے کہ کل تمہارا ٹیسٹ ہے؟'' بہت درشت لہجے میں طوبیٰ یہ بات حسنہ کو کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے معصوم چہرے پر اسے ترس آ گیا۔

ذرا سے الفاظ کسی شخص کو کتنا ذلیل کر سکتے ہیں اسے اس بات کی سمجھ بہت عمر گی سے آ گئی تھی۔

''لاؤ، کون سے سوالات ہیں؟'' بغیر ڈانٹے نرمی سے کہتے اس نے حسنہ کے لیے جگہ بنائی۔

حُسنہ کو اتنی جلدی طوبیٰ کے مان جانے کی توقع نہ تھی۔طوبیٰ کے مزاج سے سب ہی واقف تھے۔جب تک اشد ضرورت نہ پڑتی، دونوں بہنیں طوبیٰ سے دور رہنا ہی پسند کرتی تھیں لیکن رمشہ کبھی کبھی چھیڑ خانی سے باز نہ آتی تھی گو کہ طوبیٰ کی ذہانت کا ہر شخص ہی معترف تھا۔

طوبیٰ اب بہت انہماک سے حُسنہ کو سوالات سمجھا رہی تھی جو اسے بھی اب انتہائی آسان لگ رہے تھے۔وہ بلاوجہ ہی اپنی بڑی بہن کی گرویدہ نہ تھی۔

...۞...

وکی سے اُس کی دوبارہ ملاقات بالآخر ہوگئی۔ اسفر کو لگا تھا کہ شاید کچھ تناؤ کی کیفیت ہوگی لیکن وہی پُرتپاک استقبال پا کر اُس نے خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

''کیا حال ہے، لالے؟'' اسفر مسکرا دیا۔

وکی براہ راست اسفر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ''پچھلا پروگرام تو تو نے مِس کر دیا تھا تو میں نے سوچا تیری ہی پسند کا کوئی پروگرام بنا لیتے ہیں، آخر کو تو مہمان ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں کینٹین کے باہر رکھی کرسی پر لاپرواہ انداز میں ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے۔

''کہاں کا پروگرام ہے؟'' اسفر نے بالآخر پوچھ لیا کیونکہ وکی نے اپنی گفتگو پر خلاف توقع فل سٹاپ لگا دیا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اسفر کو انتظار کرنے کو کہا اور موبائل پر بجنے والی بیپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اتنی دیر میں خرم اور فراز بھی وہاں آن پہنچے۔ جب تک اسفر نے اُن سے حال احوال دریافت کیا وکی فون پر کسی پروگرام کی تصدیق کر رہا تھا۔

فون بند کرتے ساتھ وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ گویا ہوا۔

''چل بھئی لالے! کام ہوگیا تیرا۔ آج کی شام تیرے نام۔''

فراز اور خرم سے ہائی فائیو کے بعد وہ مطمئن سا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جانا کہاں ہے؟'' اسفر نے پھر سوال دہرایا۔

''آج تجھے ایک جادوئی جگہ لے جاؤں گا، جہاں جا کر تجھ پر سے سب بُری بلائیں ٹل جائیں گی اور تو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرے گا۔''

اسفر ایک دم ہی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس کا پرتذبذب چہرہ دیکھ کر وکی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''چل تو بھی کیا یاد کرے گا۔ بتا دیتا ہوں۔ آج تجھے سمندر کی سیر کو لے کر جاؤں گا۔''

اسفر نے سکون کا سانس لیا۔ کینٹین والا لڑکا چائے لے آیا اور وکی اور فراز پروگرام کی تفصیلات طے

کرنے لگے۔

شام کو وہ مقررہ وقت پر کیماڑی پہنچ گئے۔ دو بڑی ٹوکریوں میں کافی سامان عیسیٰ بھر لایا تھا۔ کولڈ رنک کے ساتھ کچھ اور طرح کے مشروب، چپس کے پیکٹ، کچھ پھل، مصالحے اور بند ڈبوں میں شاید کچھ محفوظ کردہ خوراک کیونکہ ڈبوں کی سطح پر پانی کی قطرے چمک رہے تھے۔

ایک پُرتپاک استقبال پر اسفر نے مڑ کر دیکھا تو خرم اور اُسکا ہی ایک ہم عمر چلے آرہے تھے۔

''یہ سنی ہے۔'' خرم نے اپنے ساتھ موجود خوبرو نوجوان کا تعارف کروایا۔

اسفر پہلے ہی سنی کا بے حد مشکور تھا۔ وہ آگے بڑھ کر گرمجوشی سے ملا اور ان سے سامان لے کر بقیہ سامان کے ساتھ رکھ دیا۔

نئی ٹوکریوں میں مچھلی پکڑنے کا سامان موجود تھا ۔ اسفر خوشی سے کھل اُٹھا ۔ اُسے ہمیشہ سے مچھلی پکڑنے کا شوق تھا لیکن زندگی نے کبھی ایسا موقع نہ دیا تھا اور ذہے نصیب اُس کے اعزاز میں جو پارٹی دی جارہی تھی وہ اُس کا دیرینہ خواب تھی۔

وہ وکی کا کچھ اور گرویدہ ہو گیا۔ عجیب تھا وہ شخص ۔ گھر پر یکسر مختلف اور دوستوں کے ساتھ یاروں کا یار۔ نہ جانے کب اسفر نے اُس سے یہ تذکرہ کیا ہوگا کہ وہ مچھلی کا شکار کرنا چاہتا ہے اور وکی نے تب سے یہ بات اپنی یادداشت میں محفوظ کر لی تھی۔

مزید سامان وہاں موجود مچھیروں سے خریدا اور ایک مخصوص لانچ پر وہ سب سوار ہو گئے۔ یہ کسی ماہی گیر کی لانچ تھی جو کرائے پر لی گئی تھی ۔ تمام لوگوں نے سرعت سے اپنا ساز و سامان لانچ میں منتقل کیا اور ایک ہی جست لگا کر لانچ میں سوار ہو گئے ۔ لانچ کافی بڑی اور اچھی حالت میں تھی ۔ سنی اور اُس کے تمام دوست ہی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے تو ایک اچھی لانچ پوری رات کے لئے میّسر کر لینا اُن کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔

ہوا میں خنکی تھی اور ایک عجیب سی بو بھی لیکن اسفر نے نمی سمیت ایک گہرا سانس لے کر اس خوشبو کو بھی اپنے اندر بسالیا ۔ پتا نہیں اُس نے دوبارہ کبھی یہاں قدم بھی رکھنا تھا کہ نہیں، یہ سوچ لانچ کے ساتھ ہچکولے لیتی دوسری مصروفیات میں گم ہو گئی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اور چاروں طرف نیلگوں سمندر کا فسوں غضب ڈھا

رہا تھا۔کسی نے سچ کہا ہے۔انسان کے اندر کا موسم اچھا ہوتو باہر بھی سب اچھا لگتا ہے اور اگر اندر کی فضا کثیف ہوتو باہر بھی ہر طرف دھندلکے ہی نظر آتے ہیں۔

لانچ پر سوار تمام افراد اپنی ڈوروں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ساتھ ہی سگریٹ کے کش تھے اور مختلف مشروبات۔اسفر نے ہوش کھو دینے والے کسی بھی مائع سے اپنے آپ کو حتی الامکان محفوظ رکھا۔وہ چاہ کر بھی اپنے آپ کو مسلمانیت کی چھاپ سے آزاد نہیں کر سکتا تھا۔

''دین میں جو منع ہے وہ دراصل مضر صحت بھی ہے۔ہمارا دین دین فطرت ہے۔'' عباس کی آواز اُس کے دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ تھی جو وقتاً فوقتاً گونجتی رہتی تھی۔تمام تر اختلافات کے باوجود اسفر اپنے والدین سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔

روزانہ صبح اُٹھ کر موبائل دیکھنا کے شاید ایک ہی کوشش کی گئی ہو رابطہ کرنے کی لیکن ہر مرتبہ اسے کڑی مایوسی ہوتی۔کتنی ہی دفعہ اُس نے خود نمبر ڈائل کرنے کے بعد فوراً کی لائن کاٹ دی کہ کہیں کسی نے بے رخی دکھا دی تو رہی سہی امید بھی چھوٹ جائے گی۔

''لگ گئی!!'' کے زوردار نعرے نے اسفر کو سوچوں کے دھارے میں سے کھینچ نکالا۔سنی کے کانٹے میں پہلی مچھلی پھنسی تھی۔لانچ کا مالک دور بیٹھا لڑکوں کے جوش خروش کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔اُس کے لئے یقیناً یہ عام سی بات ہوگی۔کتنے ہی منچلے آتے ہوں گے اور ان چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر جشن مناتے ہوں گے۔

کانٹے میں ایک خوبصورت مچھلی بُری طرح تڑپ رہی تھی۔مچھلی زیادہ بڑی نہ تھی لیکن زیادہ چھوٹی بھی نہ تھی۔بے انتہا پھرتیلی۔اتنے بڑے سمندر اور اُس کی وسعتوں میں اسے اپنی غذا صرف ایک کانٹے پر لگے چارے کی صورت میں ہی نظر آئی تھی۔اگر اُس نے غور کیا ہوتا تو اُسے چارے کے ساتھ خمدار کانٹا بھی نظر آجاتا۔کم عقل بڑی ہی آسانی سے چنگل میں آ گئی۔

عرشے پر اب باری باری سب ہی چھوٹی بڑی مچھلیاں وقفے وقفے سے ڈال رہے تھے۔چار سو اندھیرا پھیل چکا تھا۔اچانک ہی اسفر کو اپنی ڈور میں تناؤ محسوس ہوا اور دوسری طرف جاندار زور لگانے لگا۔اسفر کے کانٹے میں یہ پہلی مچھلی پھنسی تھی۔

اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، یہ تجربہ انتہائی دلچسپ تھا۔تیزی سے ہاتھ گردش میں آئے اور چرخی اُلٹی

گھومنے لگی تھوڑی ہی دیر میں ایک چمکدار درمیانے سائز سے کچھ بڑی مچھلی ان کے سامنے جھول رہی تھی اب تک پکڑی گئی مچھلیوں میں یہ سب سے بڑی مچھلی تھی ۔سب نے ہی زور دار نعرہ بلند کیا ا سفر کو لگا مچھلی جتنی جان مار رہی ہے ابھی ہاتھ سے چھوٹ کر واپس جا گرے گی ۔اسی اثناء میں وکی نے آ کر ڈور سنبھال لی ۔

''یہ مارا!، واہ میرے یار، اصل شکار تو تُو نے کیا ، لگتے تو اناڑی ہو لیکن نکلے کھلاڑی ۔'' اسفر خوشدلی سے مسکرا دیا ۔سنی نے انتہائی بے دردی سے مچھلی کے گلپھڑوں میں انگلیاں پھنسائیں اور حلق میں گڑا کانٹا کھینچ کر باہر نکال لیا ۔ اسفر کو جھرجھری سی آ گئی ۔مچھلی جاندار تھی جو فرش پر پڑی ابھی بھی تڑپ رہی تھی ۔ اسفر اکڑوں بیٹھ کر اُسے دیکھنے لگا ، اس کی آنکھوں کی چمک آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی اور جسم کی حرکت کا دورانیہ بھی بڑھتا جا رہا تھا ۔

اسفر کو افسوس ہوا ۔اُس نے مچھلی کے جسم ہاتھ پھیرا اور پھر بیٹھ کر دیکھے گیا ۔ نہ جانے کیوں اسفر کو لگا یہ مچھلی وہ خود تھا جس کو اُس کے مسکن سے کسی نے کھینچ نکالا ہو اور کچھ وہ اپنے آپ کو مطمئن پاتا ہو لیکن بار بار اُسے یہ احساس ہو کہ آکسیجن کم ہو رہی ہے ۔

اسفر نے ایک گہرا سانس لیا اور نظر اُٹھا کر ایک سمت دیکھا ۔ اُسے بہت دیر سے کسی کی نظروں کی گرماہٹ محسوس ہو رہی تھی ۔ وہ لانچ کا مالک تھا ، ادھیڑ عمر سے کچھ زیادہ ہی شاید ، ہلکی شیو بڑھی ہوئی تھی اور رنگ بھی کافی پختہ ۔مضبوط جسامت کا مالک وہ شخص بڑے سکون سے گویا یوں بیٹھا سب کو دیکھ رہا تھا جیسے بادشاہ اپنے تخت پر براجماں اپنی رعایا کو دیکھ رہا ہو ۔

نظریں ملنے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی ۔سر کو جنبش دے کر اُس نے اسفر کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا او قریب ہی لکڑی کی بینچ پر ہاتھ سے تھپکی دیتے ہوئے عندیہ بھی دے دیا کہ یہ جگہ تمھارے لئے ہے ۔ اسفر کسی مقناطیس کی طرح اُس کی طرف کھنچا چلا گیا ۔

''کہاں سے ہو؟'' اُس نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر سوال کیا ۔

یہیں کراچی سے ۔ اسفر نے بھی سادہ جواب دیا ۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟'' دوسرا سوال کچھ عجیب تھا ۔اسفر نے چونک کر اُسے دیکھا ۔

اُس نے پھر اپنا سوال دہرایا ۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو۔'' اس کی آنکھیں دور چمکیلے پانی پر کہیں مرکوز تھیں۔
اسفر نے جاننے کی کوشش کی کہ وہ بوڑھا شخص کیا دیکھ رہا تھا لیکن آدھے چاند تلے چمکتے پانی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اسفر نے ایک گہرا سانس لیا۔
''کچھ ڈھونڈ نہیں رہا، بلکہ پالیا ہے۔''
''پھر سے سوچ لو، کیا واقعی کچھ پایا ہے؟''
لہجہ ٹھہرا ہوا تھا لیکن بامعنی تھا۔
اسفر ایک بار پھر چونک گیا۔ بظاہر ایک معمولی نظر آنے والا شخص اس وقت اُسے ایک مقناطیس کی طرح اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ وہ خود بھی شاید ایک غمگسار چاہتا تھا۔ وہ جو اُسے سُن لے اور الجھی گتھیاں سلجھا دے۔ اسفر نے ایک گہری سانس لی۔
"حقیقت پالی ہے لیکن بہت بھاری قیمت چکائی ہے حقیقت پسندی کی۔" اسفر نے کچھ توقّف کے بعد کہا۔
''کتنا یقین ہے کہ جس کو حقیقت کہہ رہے ہو وہ سراب نہیں۔'' کشتی بان کے سوال نے اسفر کو حیران کیا۔
''پورا یقین ہے؟'' اسفر نے وثوق سے کہا۔
''یقین کسے کہتے ہو؟'' پھر اِک انہونا سوال۔
''سوچ سمجھ کر تسلی کرنا، شبہے کی غیر موجودگی کو میں یقین مانتا ہوں۔'' اس مرتبہ اسفر کو جواب دینے میں دیر نہ لگی۔
''اُس ناخدا نے بالآخر اپنی نظریں دور جمی شے سے ہٹالیں اور نظر بھر کر اسفر کو دیکھا۔
''تو گویا تمہیں کسی فلسفہ پر شبہات ہو گئے تھے؟''
''ہوں''
کشتی بان کی آنکھوں میں اب ایک تجسّس عود آیا تھا ''پھر کیسے دور کیے شبہات؟''
اسفر نے فخریہ سر اُٹھا کر جواب دیا ''عقل کا استعمال کیا۔''
''عقل پر کتنا بھروسا ہے؟''

اسفر ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ ابھی وہ جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ناخدا دوبارہ بول پڑا۔

''کسی چیز پر بھروسہ ہونے سے پہلے یہ پتا ہونا ضروری ہے کہ وہ ہے کیا؟ اور قابل یقین بھی ہے کہ نہیں۔''

اسفر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک مچھیرے کے پاس بیٹھا تھا۔ اُسے لگا وہ صرف ایک عام ناخدا نہیں بلکہ لوگوں کو منجدھار سے نکالنے والا وہ پہنچا ہوا باریش بزرگ ہے جو کبھی جنگل میں شہزادوں کے لئے نمودار ہوا کرتا تھا یا اس نوجوان کو رستہ دکھانے کے لئے جو کسی کمزور کی مدد کو نکلا ہو۔

اسفر کو خاموش دیکھ کر وہ پھر گویا ہوا۔

''جانتے بھی ہو عقل کیا ہے؟''

اسفر پہلے کچھ سٹپٹایا پھر گویا ہوا۔''عقل انسان کی اُس قابلیت کو کہتے ہیں جس سے وہ مختلف چیزوں میں تمیز اور تفریق کرتا ہے۔ نفع اور نقصان کا تعین کرتا ہے۔ کائنات کے رموز و اوقاف کو سمجھتا ہے اور چھپے ہوئے اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے۔''

اسفر اپنے جواب پر خود ہی سینہ چوڑا کر کے بیٹھ گیا۔ ناخدا کی ستائشی نظریں اُسے اپنے لئے کسی اعزاز سے کم نہ لگیں۔

''تم نے بالکل صحیح کہا'' اُس کا سندھی لہجہ عجب مٹھاس لئے ہوئے تھا۔''یہ تو ایک نور ہے۔ آگاہی کا نور۔ احاطہ کر رکھا ہے اس نے ہمارے حواس کا، تصورات کا اور فکر کا۔ لیکن جانتے ہو کچھ لوگ عقل رکھتے ہوئے بھی بے عقل ہوتے ہیں۔ وہ دنیا جہان کا علم حاصل کر کے اُس کو عمل پر پرکھتے ہیں، لیکن اپنے آپ سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں۔''

''عقل رکھتے ہوئے نفسانی خواہشات کے غلام کیسے ہوسکتا ہے کوئی؟'' اسفر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔''عقل کا تو مطلب ہی اختیار ہے۔''

''آہ کیا خوب کہا!'' ناخدا پھر اندھیروں میں کسی شے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ باقی افراد بھی اب کافی مچھلیاں پکڑ چکے تھے۔ وکی نے ناخدا کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ ناخدا نے بڑی سرعت سے اپنا کام انجام دیا اور لانچ کا انجن اسٹارٹ کر کے کچھ پہاڑیوں کی طرف رُخ موڑ دیا۔ انجن کے شور سے جب کان کچھ عادی ہوئے تو اُس نے اسفر کے قریب ہوتے ہوئے کیا

''پتر! ایک بات گرہ سے باندھ لے۔ پہلے خود کو پہچان پھر دنیا کو پرکھ۔ ہر وہ شے جو نظر آئے سچ نہیں اور ہر وہ شے جو نظر نہ آئے ناپید نہیں، چاہے یقین ہو یا قیاس، عقل کا وسیلہ ہیں خود عقل نہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ نا خدا پوری مستعدی سے تمام ساز و سامان سمیٹنے میں جُٹ گیا، لانچ روکی اور سبک روی سے سامان چٹان کی نسبتاً ہموار جگہ پر رکھنے لگا۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ کافی چست تھا۔ باقی سب لوگ بھی اس کی مدد کرنے لگے۔ سنی اور دو اور لڑکے آس پاس کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ وہاں وہ اکیلے تفریح کے لئے نہیں آئے تھے اُن کی طرح اور بھی ٹولے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ سلنڈروں کی روشنی، تیل میں ڈلنے والی تازہ مچھلی کی چھن چھن اور مصالحوں اور گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو کسی میلے کا منظر پیش کر رہی تھی۔

''آجا لالے، تو بھی یاد کرے گا آج کی رات وکی نے اپنے ہاتھوں سے تل کر تجھے مچھلی کھلائی تھی۔'' وکی نے ایک ہاتھ سے اسفر کا شانہ پکڑا تھا۔

''ہاں یار! بہت دنوں بعد کھل کر سانس لی ہے۔ فطرت بھی حسین ہے۔ دل جیت لیا تو نے۔'' اسفر نے ستائشی انداز میں کہا تو وکی بھی خوشدلی سے مسکرا دیا۔ اسفر ایک دری پر بیٹھ گیا۔ آدھا چاند، سیاہ رات اور ٹھنڈی نرم ہوا، کیا ہی پُرس سکون ماحول تھا۔ وہ اُس مچھیرے کو دیکھے گیا جو بڑی پھُرتی سے تیل کا کڑھاؤ چڑھا کر اب مچھی کو چھری سے رگڑ رہا تھا۔ کُھرچے جانے پر مچھلی کے چھلکے ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔

''کسی کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ علم کے سمندر میں کتنی گہرائی میں اُترا ہوا ہے۔'' اسفر نے سوچا۔ وہ مچھیرا بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا تھا اور اسفر کی آنکھیں دیکھ کر ہی اُس نے اُس کی حبس زدہ ذات کا پتا لگا لیا تھا۔

اسفر کی توجہ اپنے اوپر مرکوز پا کر اُس نے بھی اسفر کی طرف دیکھا۔ نظریں ملنے پر وہ بھی مسکرا دیا۔ اسفر کچھ قریب ہو کر سارے عمل کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

''ویسے تمہیں پتا ہے کہ عقل بھی کسی چیز کی محتاج ہوتی ہے!'' مچھیرا اب مسالہ لگا کر مچھلی پر چیرے لگا رہا تھا۔

اسفر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ مچھیرا خود ہی بول پڑا۔

''عقل تو بس نظر ہی کی محتاج ہے۔'' اسفر اس کی بات پر مسکرا دیا۔

''لیکن تمہیں بہت سے نظروں والے بے عقل اور عقل والے بے نظر ملیں گے۔''

''تو عقل نظر کی محتاج تو نہ ہوئی۔'' اسفر نے لقمہ دیا۔

مچھیرا ہنستے ہوئے سر ہلانے لگا ''لیکن یہ بات نظر والوں کو سمجھ نہیں آتی۔ نظر والوں کو تو بس ناز ہوتا ہے اپنی نگاہ پر حالانکہ چہرے پر لگی آنکھ کی حیثیت ہی کیا ہے۔ کبھی سراب بھی دِکھا دیتی ہے تو کبھی اس پار بھی نہیں دکھاتی۔ ذرا سی مٹی کا ریزہ چلا جائے تو بند، پانی کا قطرہ پڑ جائے تو دھندلی، آنکھ کا بال چلا جائے تو پٹپٹانے لگتی ہے۔ نظر والوں کو تو بس ناز ہی ہے حقیقت کچھ نہیں ہے۔''

وہ اب ایک ایک کر کے مچھلیاں کڑھاؤ میں ڈال رہا تھا۔ تیل کی چھن چھن کے دوران وہ خاموش ہو گیا۔ اسفر اب تک اُس کی باتوں پر ششدر تھا۔ تیل کی چھن چھن کچھ کم ہوئی تو اُس نے ایک آخری بات کہی۔

''دنیا جہان کا میل کچیل آنکھوں میں لئے اس دنیا کی حقیقت کو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ نظر والے۔ حالانکہ دیکھنے اور پرکھنے کے لئے تو بس دل کی آنکھ ہی کافی ہوتی ہے۔''

تازہ مچھلی کی خوشبو چار سو پھیلی تھی اور لڑکوں نے خوب رنگ جمایا ہوا تھا۔ اسفر کو بھی اُن سب نے ہنگامے میں کھینچ لیا۔ وہ ایک یادگار رات تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس پُرفضا مقام پر تفریح کے بعد خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے ایک انوکھا سبق سیکھا تھا:

''جو صرف نظر آئے وہ سچ نہیں، جو نظر نہ آئے وہ ناپید نہیں۔''

...۞...

ایک سال کیسے گزر گیا تھا پتا بھی نہ چلا تھا۔ رضیہ کی بیماری ،نوکری کے لئے بھاگ دوڑ اور بالآخر ایک چھوٹی سی کمپنی میں ملازمت کی مصروفیت میں طوبیٰ گھن چکر بن گئی تھی ۔ یونیورسٹی سے واپس آئی تو رضیہ اور اکبر لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔

''دیر ہوگئی بیٹا؟'' اکبر نے طوبیٰ کو دیکھتے ہی پوچھا۔

''جی بس کچھ اور مہلت کی درخواست جمع کرانی تھی آفس میں ۔اُسی میں دیر ہوگئی۔''

طوبیٰ جھجکتے ہوئے بولی۔

اکبر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''بس بیٹا تمھاری امی کا علاج بھی سمجھو اپنے اختتام کو پہنچا ہے۔صحت بھی بہتری کی طرف گامزن ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ ایک سال میں بھی تمھاری فیس کے پیسے اکٹھا نہ کر سکا۔لیکن تم فکر نہ کرو اب میں جلد ہی انتظام کر دوں گا۔''

اکبر کا شرمندہ لہجہ طوبیٰ کو بے انتہا شرمسار کر گیا۔

''ارے نہیں ابو، اس لئے تو نہیں بتایا میں نے آپ کو'' طوبیٰ آگے بڑھ کر اکبر کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گئی اور اکبر کے مضبوط ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر اپنی انگلیاں اکبر کی انگلیوں میں پرو دیں۔

اکبر نے اُس کی اُنگلیوں کو سمیٹ کر اپنے ہاتھوں میں سمو لیا اور سر کو چوم لیا۔

''میری ہونہار بیٹی! تم اس سے کہیں زیادہ کی حقدار ہو۔''

''آپ نے مجھے ہمیشہ حق سے زیادہ دیا ہے ابو!'' طوبیٰ نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اکبر کے کاندھے سے ٹکا دیا

''بس امی ٹھیک ہو جائیں جلدی سے، میں اُن کے ہاتھ کی بریانی بہت یاد کر رہی ہوں۔''

رضیہ جو پژمردہ سی بیٹھی تھیں مسکرانے لگیں۔''بس بیٹا! الحمد للہ اس بار رپورٹس اچھی آئی ہیں۔طبیعت بھی اب سنبھل رہی ہے۔سارے پسند کے کھانے پکا کر کھلاؤں گی، اب تم لوگوں کو۔''

طوبیٰ مُسکرا دی۔ دماغ پر ابھی بھی یونیورسٹی کا حال ہی چل رہا تھا۔ابھی تو فیس کے پیسے بھی پورے نہ

ہوئے تھے اور اوپر سے لیٹ فیس، طوبیٰ کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔
''کاش! آنکھیں بند کرنے سے دماغ بھی بند ہو جاتا۔'' اُس نے بے بسی سے سوچا۔

...۞...

''آپ ان کاغذات کو اچھی طرح دیکھ لیں۔''
ٹریولنگ ایجنٹ نے ہاتھ میں پکڑے ہو کاغذات میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے اسفر کی طرف بڑھائے۔
اسفر نے باریک بینی سے تمام کوائف کا جائزہ لیا اور مطمئن انداز میں سر ہلا کر کاغذات واپس سامنے بیٹھے ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا دیئے۔
''ویسے آپ خوش قسمت ہیں جو آپکا کام اسقدر سرعت سے ہو گیا۔ ورنہ لوگوں کو سالوں سال تک لگ جاتے ہیں یہ سب معاملات طے ہونے میں۔
اسفر نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کا آسٹریا کی یونیورسٹی ''ویانا'' میں ایڈمیشن ہو گیا تھا اور کافی خرچے اسکالرشپ سے پورے ہونے والے تھے۔ زندگی میں اتنی آسانی اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ جب سے خودمختار زندگی کی شروعات کی تھی، جیسے ہر طرح کی فکروں سے آزادی مل گئی تھی۔
''بیٹا! جب بہت زیادہ آسانیاں ملنے لگیں تو بھی انسان کو چوکس ہو جانا چاہیے کہ کہیں اللہ نے رسی دراز تو نہیں کی ہوئی اور ہم اپنی دھن میں چلے جا رہے ہوں۔''
اسفر کو ہنسی آ گئی۔
"دین کی دقیانوسیت کسی انسان کو خوش نہیں رہنے دیتی۔ آسانی ہو تو ناخوش، نہ ہو تو بھی ناخوش۔"
اسفر نے سر کو جھٹکا اور مطلوبہ چیزوں کی فہرست اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے لگا جو اُس کو آنے والی زندگی کے لئے فی الوقت درکار تھیں۔ زندگی کی کتنی ہی حقیقتیں اُس پر اِن دو سالوں کے اندر آشکار ہو گئیں تھیں۔ وجود ایک واحد حقیقت تھی اور اُس وجود سے ساری خوشیاں کشید کرنا اب اُس کی زندگی کا مقصد تھا۔ زندگی میں اب مزید کسی غلطی کی گنجائش نہیں تھی اس کا ادراک اُسے بخوبی ہو گیا تھا۔ مختصر سی زندگی کو بھرپور طریقے سے جی لینا ہی کامیابی تھی۔

''مجھے اب ہر رشتے ناطے اور اُن کو چھوڑنے کے پچھتاوے سے بھی جان چھڑانی ہے۔'' ایک دم سوچ عود کر آئی اور اپنی ہی سوچ پر وہ مکمل قائل ہو گیا۔

وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا اور وہ انٹرویو آفس میں جا پہنچا۔ ایک الگ ہی تناؤ فضا میں موجود تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ہر شخص کی قسمت کا فیصلہ یہیں ہونا تھا۔ اُس کی قسمت کا فیصلہ بھی تو یہیں ہونا تھا۔ بچپن سے جو میدانِ حشر کا سماں دماغ میں موجود تھا ایمبیسی کا منظر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اتنی تناؤ کی صورتحال میں بھی اُسے ایک دو لوگوں کو دیکھنے کے بعد اپنی مسکراہٹ پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ کچھ لوگوں کے چہرے تو باقاعدہ سُست اور زرد پڑے ہوئے تھے جیسے سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

ایک نوجوان جو باقاعدہ سوٹڈ بوٹڈ ہو کر آیا تھا بار بار پیشانی پر سے اپنا پسینہ پوچھ رہا تھا۔ اسفر نے ایک لمبا سانس کھینچا، سامنے ہی ایک ادھیڑ عمر جوڑا زور وشور سے ذکر اور ورد کرنے میں مشغول تھا۔ چونکا دینے والی چیز اُن کے چہروں پر موجود اطمینان تھا۔ جو اضطراب تھوڑی دیر پہلے باقی لوگوں کی طرح اُن کے چہروں پر بھی موجود تھا وہ نسبتاً معدوم ہو گیا تھا۔

''چلو خدا کو ماننے کا ایک فائدہ تو ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی لوگ اپنی ساری پریشانیاں اور فکریں خدا کے سامنے ڈھیر کر دیتے ہیں اور ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں کر سکتا۔''

اپنی سوچ پر اُسے خوب ہنسی آئی اور محظوظ ہوتے ہوئے وہ ایک بار پھر آنے والے وقت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں ایک لڑکی جو چال ڈھال سے کسی درمیانے گھرانے کی ہی لگتی تھی جوتوں سے ٹک ٹک کرتی کاؤنٹر تک آ پہنچی۔ تراش خراش سے لگتا تھا کہ پاکستان کی ثقافت اور طور طریقہ کیا اُس نے تو شاید پاکستان کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ باہر ملک جانے کی ایسی خواہش یا ضرورت کہ سب ہی اپنی تاریخ اپنا مذہب قربان کیے بیٹھے تھے۔

''کم از کم میں دوغلہ نہیں ہوں، جو ہوں وہ ہوں۔'' اُس نے اپنے آپ کو سراہا۔ لیکن ایک بات پر اُس کو شک ضرور ہوا کہ جتنا لوگ باہر جانے کے لئے مضطرب تھے اُس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ہر شخص کسی بہت بڑے مصیبتوں کے الاؤ میں گھرا ہے جس سے فرار چاہتا ہے۔

بیشتر مصیبتیں تو کھلم کھلا ڈھیٹوں کی طرح سب ہی جھیل رہے ہیں صبح شام، ملکی حالات کا رونا، نوکریوں

کی کمی، تنگ دستی، لوٹ مار اور اُس پر زبان کھولنے کا خوف، ''سچ ہے آزادی بھی بس ایک تصوّر ہی رہ گیا ہے ہم پاکستانیوں کے لئے۔'' اسفر نے سر جھٹکا۔

بہر حال جو بھی تھا اسفر کی نیّا پار لگ گئی تھی اور بڑی آسانی سے اُسے ویزا مل گیا تھا۔ انتہائی مطمئن وہ گھر لوٹ گیا۔ پتا نہیں اُس جگہ کو گھر کہنا زیادہ مناسب تھا یا سرائے۔ جو بھی تھا بس ایک آدھ ہفتہ کے بعد اسفر نے اس سرزمین کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دینا تھا۔

بستر پر لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اُسے ایک عجیب کھوکھلے پن نے گھیر لیا۔ کچھ وقت پہلے دنیا کتنی مختلف تھی۔ اگر مذہب کو خیر باد نہ کہا ہوتا تو آج اُس کے جانے پر کیا خوب گہما گہمی ہوتی۔ کچھ وقت پہلے کیے گئے وعدے کو اُس نے جانتے بوجھتے رد کر دیا اور تصور میں اپنے گھر والوں کے درمیان ہنستا مسکراتا رہا۔

اُس کے پیٹ میں ایک ہلچل سی ہوئی جو اُس وقت ہوا کرتی تھی جب اس کا بہترین نتیجہ آیا ہوتا تھا لیکن عائشہ کو سرپرائز دینے کے لئے وہ لٹکی ہوئی شکل کے ساتھ کم نمبروں کی نوید دیتا تھا۔ اُس کی مونچھوں تلے ایک مسکراہٹ تیر گئی اور آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ یادیں بھی سائے کی طرح ہوتی ہیں۔ انسان لاکھ جتن کرے یہ کسی طور پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

.....۞.....

وہ ایک جمائی لیتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھول کر پانی پینے کے لیے نکلی تھی۔ اسے صحن میں اکبر ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔ طوبیٰ نے بے اختیار دیوار پر لگی گھڑی دیکھی۔ رات کے تین بجنے والے تھے۔

''اب تک جاگ رہے ہیں؟'' طوبیٰ نے فکرمندی سے کہا۔

''ہاں! بس نیند نہیں آ رہی تھی اور پھر تہجد کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ تم سے تو فرصت سے بات ہی نہیں ہوئی چند دنوں سے۔'' وہ لاؤنج میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔

''ہاں میں کوشش میں ہوں کوئی بہتر جاب مل جائے'' طوبیٰ بھی پانی کا گلاس لے کر صوفے پر آ بیٹھی۔ ''بس ایسی ہی بھاگتی زندگی ہوگئی ہے۔ میں ہر موقع کے پیچھے بھاگ رہی ہوں لیکن ہاتھ کچھ نہیں آ رہا۔''

''ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔'' اکبر نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''ابھی میں زندہ ہوں تمہاری پریشانیوں کو اپنے سر لینے کے لیے۔ تم زیادہ فکرمند نہ ہو۔''

''امی کی رپورٹس ٹھیک آئی ہیں؟'' طوبیٰ نے موضوع بدلا۔

''ہاں! اللہ کا کرم ہے۔ تھوڑے عرصے میں وہ مکمل شفایاب ہو جائے گی۔''

''انشاءاللہ۔'' طوبیٰ نے بے اختیار کہا۔

''تمہیں جلد ہی بہتر جاب مل جائے گی۔ مجھے اندازہ ہے۔ لیکن ابھی جہاں ہو وہیں محنت کرو۔'' اکبر نے پھر رُخ اسی گفتگو کی طرف موڑا۔ ''اور تمہاری فیس کا بھی انتظام ہو جائے گا جلد ہی۔''

طوبیٰ کچھ بے آرام ہوی ''ابو آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔''

وہ مسکرا اُٹھے۔ محبت ہی محبت تھی صرف آنکھوں میں ''میری بیٹی بہت آگے جائے گی۔''

''آپ کو کیسے پتا؟'' طوبیٰ نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' اکبر نے مدھم آواز میں کہا۔

''آپ کو کیسے ہر بات کا اندازہ ہو جاتا ہے؟'' طوبیٰ بھی دھیمے سے ہنسی۔

''بیٹا ماں باپ کو اپنی ہر اولاد کے مستقبل کا پتا ہوتا ہے۔ بس ڈر ہوتا ہے تو زمانے سے۔'' اکبر نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''اور کیوں نہ ہو جس چیز کی قسم کھا کر اللہ نے بتایا ہے کہ انسان خسارے میں ہے اس سے کیوں نہ ڈرے انسان۔ یہ زمانہ ہی تو ہے جو بدل جاتا ہے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ لیکن یاد رکھنا'' اکبر ایک دم ہی سیدھے ہو کر بیٹھ رہے۔

''انسان خسارے سے بچ سکتا ہے بس چار چیزوں کا اہتمام کرنا۔''

طوبیٰ خاموشی سے اکبر کو سننے لگی۔

''عقیدہ درست رکھنا، یہ درست تو سب درست۔ نیک اعمال۔ اپنے ساتھ دوسروں کی فکر اور صبر۔ بس بیٹا یہی خسارے سے بچانے والے ہیں۔''

طوبیٰ نے سعادت سے سر ہلا دیا'' آپ بالکل مولوی صاحب والی باتیں کر رہے ہیں۔'' ایک شرارتی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔

اکبر بھی مسکرانے لگے ''عمر کے اس حصے میں جتنی سمجھ ان باتوں کی آتی ہے اتنی کبھی نہیں آتی۔ گزار کے جو آئے ہیں۔ زمانے کے پیچ وخم دیکھتے ہوئے۔'' اکبر نے اٹھتے ہوئے کہا ''بس زمانے کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دینا۔ کھری رہنا۔ کھوٹ نہ ملنے دینا۔''

طوبیٰ خاموش بیٹھی رہی۔

'' سو جاؤ اب۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔'' اکبر جا چکے تھے لیکن طوبیٰ وہیں بیٹھی تھی۔ بعض باتیں جیسے انسان کو ایک خلا میں لے جاتی ہیں جہاں صرف سناٹا ہوتا ہے اور اپنا آپ بالکل واضح دکھائی دیتا ہے۔ زمانے کے کس پیمانے پر اکبر نے اسے اپنی پرکھ دینے کو کہا تھا طوبیٰ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

...۞...

دروازے پر کھڑے مستعد واچ مین نے اس کے لیے شیشے کا دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اس شاندار عمارت کی آرائش، انتہائی قیمتی اور مہنگے ڈیزائنز کے کام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ باقی وہی صورتحال تھی جو ہر بار ہی ہوتی تھی۔ نوجوان اپنی باری کے انتظار میں ویٹنگ ایریا میں بیٹھے نظر آئے۔ وہ بھی خاموشی سے جا کر ایک کرسی پر ٹک گئی۔

''اگر یہ جاب مل جائے تو کتنے مسائل حل ہو جائیں گے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔'' میری فیس کا مسئلہ حل ہو جائے گا، امی کے علاج کی ابو کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

اُسے یہ سب سوچتے ہوئے اچانک ہی ہنسی آ گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ غریب لڑکے لڑکیوں کا نوکری کی تلاش میں جوتے چٹخانا انٹرویو کی گھسی پٹی کہانیاں، سب اصلی ہوتی ہیں۔ اور میں انہیں ہمیشہ کہانیاں ہی سمجھتی رہی۔ سچ ہے جو خود پر نہ بیتے وہ کہانی ہی لگتی ہے۔

وہ اتنے شاندار آفس دیکھ چکی تھی کہ یہ چیزیں اب اسے مرعوب نہ کرتی تھیں لیکن اب تک وہ جتنے آفسز میں جا چکی تھی بلاشبہ ان میں سے یہ ایک لاجواب عمارت تھی۔ وہ عمارت ڈیزائنر کی اعلیٰ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کانفرنس ہال کی صنّاعی بھی کچھ کم نہ تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دبیز قالین کے دوسری طرف ایک جہازی سائز کی میز اور اطراف میں آرام دہ لیکن خوبصورت کرسیاں اور عقب میں ایک شیشے کی دیوار جس میں چند ایک ہی لکڑی کے پینل تھے جہاں سے باسانی باہر رواں دواں زندگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔

اس خوبصورت آفس میں ایک اور نمایاں چیز قریب ہی رکھی دیو قامت نایاب لکڑی سے بنی ایک خوبصورت الماری تھی۔ جس میں متعدد ایوارڈز، ٹرافیاں، اسناد اور شیلڈز ترتیب وار سجی ہوی تھیں اور کچھ تصویریں جس میں ان تقاریب کا حال بیان تھا۔

کمرے کے دوسرے حصے میں سرمئی رنگ کا خوبصورت اور آرام دہ صوفہ سیٹ موجود تھا جس نے ایک نازک کانچ کی میز کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ کچھ میگزین، اخبارات اور رسائل اس میز کی زینت تھے۔

آفس کا یہ کمرہ از خود ایک شاہکار تھا۔ یہ ذوالقرنین انٹر پرائز کا ہیڈ آفس تھا جہاں طوبیٰ کو دو مہینے پہلے ہونے والے ایک انٹرویو میں کامیاب امیدواروں کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔

پہلے پہل تو طوبیٰ کو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کیونکہ انٹرویو لینے والے نے چند ایک ہی سوالات پوچھے تھے جن میں سے قابل ذکر سوال یہ تھا کہ اگر آپ سیارہ مریخ میں ہوتیں تو مسائل کا حل کیسے نکالتیں؟

سوال سن کر طوبیٰ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئی تھی۔ کتنے ہی سوالات کے جوابات کی مشق وہ کر کے آئی تھی اور ان گنت ممکنہ حالات کے لیے تیاری کر رکھی تھی لیکن یہ سوال غیر ممکنہ سوالوں میں سے ایک تھا۔

سنبھلتے ہوئے طوبیٰ نے بات کا آغاز کیا تھا ''اگر میں سیارہ مریخ پر ہوتی تو یقیناً وہاں کے مسائل ہمارے مسائل سے مختلف ہوتے تو اصولاً پہلے مجھے وہاں کے حالات و واقعات کی جانچ کرنی ہوگی اور اسباب تک پہنچنے کے بعد ہی میں اس کے حل کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کروں گی۔''

انٹرویور نے سر ہلاتے ہوئے کچھ مشاہدات اپنے سامنے موجود کاغذات پر رقم کیے اور اس کو جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ طوبیٰ کے نزدیک وہ تمام مایوس دنوں میں سے ایک دن تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کو شارٹ لسٹ کر لیا جائے گا اور ایک عالیشان آفس میں اس کا فائنل انٹرویو ہوگا۔

ذوالقرنین انٹر پرائز کاروباری دنیا میں ایک جانا مانا نام تھا جو نہ صرف ٹیکسٹائل اور پیپر پروڈکٹس بلکہ ڈیری، سیمنٹ میکنگ اور انشورنس کے مختلف سیکٹرز میں شہرت کا حامل تھا۔ حال ہی میں انہوں نے Business intelligence analyst کی تربیت کے لیے سینکڑوں درخواستیں وصول کی تھیں جس میں صرف پچیس امیدواروں کو چُنا گیا تھا۔ اب باقی کس نے رہنا تھا اور کس نے جانا تھا کچھ پتا نہ تھا۔

''انٹرویوز کب شروع ہوں گے؟'' ایک نو وارد لڑکی نے ریسپشن پر آ کر شستہ انگریزی میں پوچھا۔ جدید تراش خراش کے لباس، ہائی ہیلز اور اس پر شولڈر کٹ بال..... وہ کافی نظروں کے لیے کشش کا باعث تھی۔

ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ''بس دس منٹ میں۔ سر احسان

ہمیشہ وقت پر انٹرویو شروع کر دیتے ہیں۔''

وہ لڑکی اپنا پرس سنبھالتی طوبیٰ سے کچھ فاصلے پر موجود ایک آرام دہ کُرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسی اثناء میں ایک اور نوجوان طوبیٰ کے عین برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اس کی پرفیوم کی مہک نے ایک دم طوبیٰ کو چونکا دیا۔ وہ مردانہ خوشبو بے حد جانی پہچانی تھی۔

دو بند آنکھیں اس کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ ان بند آنکھوں کے پیچھے امید کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ سمندر تھم گیا تھا۔ ہوا تک خاموش ہو گئی تھی۔ صرف چند الفاظ کے عوض۔ طوبیٰ سنبھل کر بیٹھ گئی اور اپنے ذہن سے پرانی یادوں کو کھرچ کر پھینک دینے کی ایک اور بے سود کوشش کی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی طوبیٰ کی پوری توجہ برابر بیٹھے لڑکے کے جوتوں سے ہوتی ہوئی اس کی کلائی پر بندی گھڑی پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس کے وجیہہ ہاتھوں پر نیلے ڈائل والی سلور گھڑی خوب جچ رہی تھی۔

اُسے اچانک ہی وحشت ہونے لگی اور برابر بیٹھے وجود سے ایک ایسی قوت اسے دھکیلتی محسوس ہوئی جیسے مقناطیس کے دونوں نارتھ پول آمنے سامنے آ گئے ہوں۔ اس کا دل چاہا وہ ابھی کسی کھلی جگہ پر جائے اور گہرے سانس لے۔

"لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ" اس نے دل ہی دل میں اپنی وحشت پر قابو پانے کے لیے ورد کیا اور پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ پھر اپنے بیگ میں سے اپنی پسندیدہ کتاب نکالی اور ایک نشان زدہ ورق کھول کر پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ ''what I see in the mirror'' یہ کتاب وہ پہلے بھی دو بار پڑھ چکی تھی لیکن وہ جب بھی نروس یا پریشان ہوتی، اس کتاب نے منفی خیالات پر قابو پانے میں اس کی ہمیشہ مدد کی تھی۔

برابر بیٹھا لڑکا ہر تھوڑی دیر بعد پہلو بدل رہا تھا۔ کبھی وہ اپنا موبائل نکالتا، اسے دیکھتا، پھر پاؤں جھلانے لگتا۔ اس کی حالت اس کی گھبراہٹ کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی۔

''کیا لگتا ہے آپ لوگوں کو آج کیا پوچھیں گے انٹرویو میں؟'' اچانک ہی وہ بول پڑا تھا اور خطاب غالباً آس پاس بیٹھے سارے ہی لوگوں سے تھا۔ اس کی مقناطیسی آواز نے تمام ہی سامعین کو متوجہ کر لیا تھا۔

''پچھلے انٹرویو کو دیکھتے ہوئے کچھ کہا نہیں جا سکتا'' اسی سٹائلش لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''کافی غیر متوقع سوالات تھے، لیکن مجھے خوشی ہے کہ آج میں منتخب لوگوں کے درمیان بیٹھی ہوں۔''

اس نے اپنے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ کافی خوش مزاج تھی۔

''بائی داوے میرا نام سنعیہ ہے۔'' کچھ خاص بات تھی اس میں جو طوبیٰ کی نظر بار بار اس پر ٹھہر رہی تھی۔

''میں فرحان اور آپ؟'' برابر بیٹھے نوجوان نے اچانک ہی طوبیٰ سے دریافت کیا شاید اس وجہ سے کہ وہ اس کے عین برابر میں بیٹھی تھی اور باقی لوگوں کی باری بعد میں آنی تھی۔ طوبیٰ جو اپنی ہی سوچوں میں گم تھی ایک دم گڑبڑا گئی لیکن فوراً ہی ایک مختصر مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنے تعارف کروایا اور پھر باری باری سب ہی کا تعارف ہوا۔

طوبیٰ کو ہر شخص وہاں اپنا آپ سے بہتر لگا۔ پچھلے ایک سال سے وہ عموماً ہی اس خودترسی کا شکار ہونے لگی تھی۔ حالانکہ دیکھنے والوں کو طوبیٰ کے سراپے میں باقیوں کی نسبت کوئی کمی نظر نہ آتی لیکن جن باتوں سے طوبیٰ باخبر تھی ظاہر ہے وہ لوگ نہ تھے۔

فرحان بڑی خوش دلی سے قریباً تمام ہی لوگوں سے محوِ گفتگو تھا۔ وہ بلا کا خوش گفتار تھا۔ طوبیٰ اسے سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ طوبیٰ بھی اب گفتگو میں شامل ہو چکی تھی۔ وہ باری باری قریباً سب ہی لوگوں کی آراء کو جاننے کا خواہشمند نظر آ رہا تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے سنعیہ، آپ کا سلیکشن ہو جائے گا آج؟'' اس نے براہِ راست سنعیہ سے سوال کیا۔

''کیوں نہیں!'' سنعیہ نے کندھے اچکائے ''میں ایک پروفیشنل ہوں، میرا اکاڈمک ریکارڈ بھی شاندار ہے اور مجھے اس مارکیٹ کا اچھا ایکسپوژر بھی ہے۔ میرا سلیکشن تو لازمی ہے۔''

تمام مجمع ہی سنعیہ اور فرحان سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔

''اور طوبیٰ آپ؟'' دو مزید امیدواروں سے جاننے کے بعد اب وہ طوبیٰ سے مخاطب تھا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' طوبیٰ نے مختصر جواب دیا ''یعنی آپ پر اعتماد نہیں ہیں؟''

فرحان کی آنکھوں میں ایک تمسخرانہ سی چمک تھی۔

''میں نے ایسا کب کہا؟'' طوبیٰ نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے آپ کے جواب سے ایسا ہی لگا۔'' فرحان نے کندھے اچکائے۔

''جب تک میں یہ نہ جان لوں کہ کس معیار پر مجھے جانچا جا رہا ہے میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ میں منتخب ہو جاؤں گی یا نہیں۔ پچھلے انٹرویو کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کمپنی کا معیار کم از کم ایکسپوژر تو بالکل ہی نہیں ہے۔'' طوبیٰ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''پھر کیا لگتا ہے آپ کو کیا معیار ہے کمپنی کا؟'' فرحان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''creativity'' طوبیٰ نے ایک لفظی جواب دیا۔

'' بہت خوب!'' فرحان نے اس کو داد سے نوازا لیکن طوبیٰ خاموشی سے ایک بار پھر کتاب کے مطالعے میں گم ہو چکی تھی۔

سنعیہ خاموش تھی یا شاید تھوڑی نالاں۔ گو کہ طوبیٰ نے سنعیہ کو نشانہ نہیں بنایا تھا لیکن سنعیہ کے چہرے پر بدلتے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس نے طوبیٰ کی بات کا برا منایا تھا۔ فرحان اب باقی لوگوں سے گفت وشنید کر رہا تھا۔ اپنے سلیکشن کے بارے میں بھی وہ کافی پر اعتماد نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ''ایکسیوزمی'' کہنا کہتا ہوا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

''جن کے نام پکار رہی ہوں وہ اندر کمرے میں تشریف لے آیئے۔'' ایک فون کال ریسیو کرنے کے بعد ریپشنسٹ نے نہایت نرمی سے کہا۔ سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر رہ گئے۔

پہلے نمبر پر طوبیٰ اپنا نام سن کر کتاب بیگ میں ڈالتی، اپنا حجاب درست کرتی کھڑی ہو گئی۔ چوتھے نمبر پر سنعیہ کا نام پکارا گیا۔ لیکن پکارے گئے دس ناموں میں سے فرحان کا نام کہیں نہیں تھا۔

اگر تو یہ نام منتخب ہونے والوں کے تھے تو طوبیٰ کو فرحان کا نام نہ لئے جانے پر کچھ ملال ہوا۔ لیکن اس بات کی بھی امید تھی کہ جن لوگوں کو آفس میں بلایا ہے وہ منتخب نہ کیے گئے ہوں اور ابھی تو انٹرویو ہوا بھی نہ تھا تو دس لوگوں کو ایک ساتھ اندر بلانے کا جواز اس کو بالکل سمجھ نہ آیا تھا۔ الجھی کیفیت میں وہ باقی لوگوں کے ساتھ سب سے آگے اس عالیشان کمرے میں داخل ہو گئی۔ لیکن اندر کا منظر حیران کر دینے والا تھا۔

.....۞.....

اکتوبر کے مہینے میں بھی وہاں ایسا موسم تھا جیسے کراچی میں دسمبر کی شروعات۔ قسمت اُس پر کچھ مہربان تھی جو وہ اس موسم میں آسٹریا پہنچا تھا۔ ابتدائی ہفتے جو اسفر نے آسٹریا میں گزارے وہ بلاشبہ

اُس کی زندگی کے مشکل ترین لیکن نتیجہ خیز دن تھے۔

پردیس میں رہنے کا پہلا تجربہ اور وہ بھی ایسا کہ پیچھے رہ جانے والوں سے کوئی رابطہ نہیں۔ حالانکہ کم و بیش ایک سال سے وہ تنہا ہی پاکستان میں رہ رہا تھا لیکن آس پاس کے لوگ، رہن سہن، طور طریقہ، زبان سب مانوس تھا۔ گو کہ آنے سے پہلے اُس نے کچھ جرمن سیکھ لی تھی لیکن یہ بس اتنی ہی تھی کہ اُسے مطلوبہ سمت معلوم ہو جاتی، یا زبان سے زیادہ اشاروں کی مدد سے مطلوبہ معلومات فراہم کر دی جاتیں۔

ابتداء میں وہ انتہائی اضطراب کا شکار ہو گیا۔ صبح یونیورسٹی، شام کو نئی اور سستی رہائش اور نوکری کی تلاش۔ ایک سستے ہوٹل میں عارضی قیام بھی اُسے خاصہ مہنگا پڑ رہا تھا۔ گو کہ یونیورسٹی کی فیس میں حد سے زیادہ رعایت تھی لیکن دوسرے خرچوں کے لیے اُسے موجودہ رقم کو محفوظ رکھنا اور مزید پیسے کمانا اشد ضروری تھا، ہر جگہ شہر کا نقشہ ہاتھ میں لئے پھرتا، رستے اور سسٹم سمجھنے میں اُسے زیادہ وقت نہ لگا۔ ایک ٹرین سے دوسری ٹرین، ایک بس سے دوسری بس، ایک محلے سے دوسرے محلے، غرض ہر جگہ کی خاک چھاننا بھی کافی سُودمند ثابت ہوا تھا۔

کبھی کبھی تو کسی مخصوص راستے اور منزل کے بغیر بھی گھنٹوں سفر میں رہنا اسفر کو زندگی کا معمول لگا۔

یونیورسٹی میں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ گو کہ دن بدن اُس کی زبان میں بہتری آ رہی تھی لیکن کچھ باتیں اسفر کے سر سے گزر جاتیں۔

دوست بنانے کا بھی کوئی موقع ہاتھ نہ آیا تھا۔ تمام چہرے انجان، کچھ چہرے ایشیائی ضرور لگتے تھے لیکن کم گو فطرت اچھے روابط کی راہ میں کڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ کچھ کاغذی کاروائیاں ابھی بھی جاری و ساری تھیں جس کے لیے وہ تندہی سے مصروف تھا۔ پاکستان کی طرح یہاں قوانین سخت تھے اور ذرا سی بھی نااہلی کی صورت میں وہ ملک بدر ہو سکتا تھا۔

دو ہفتے بعد ایک مشترکہ رہائش گاہ بالآخر میسر آ گئی تھی۔

وہ اُس ایک کمرے کی رہائش گاہ میں اپنا بستر برابر کرنے کے بعد اب اپنے برائے نام سامان کا جائزہ لے رہا تھا جب کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز پر وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے روم میٹس سے اس کی اب تک ملاقات نہ ہو پائی تھی حالانکہ اُسے اِس کمرے میں آئے دو دن گزر چکے تھے۔

دروازے سے ایک لمبا اور خاصہ فربہ چوبیس پچیس سالہ نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی پیٹھ پر اس کا بیگ پیک لٹکا ہوا تھا جس کا وزن اور حجم دونوں ہی خاصے زیادہ تھے۔ ہاتھوں میں ایک کاغذ کا مضبوط لفافہ تھا جن میں سے کچھ کتابیں باہر جھانک رہی تھیں۔

اسفر نے جرمن میں اپنا تعارف کروایا۔ وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ نووارد جرمن میں جواب دے گا یا کسی اور زبان میں کہ جواب انگریزی میں موصول ہوا۔ اسفر نے سکون کا سانس لیا۔ جرمن زبان پر فی الوقت اُسے عبور حاصل نہیں تھا۔

''میں لکاس ہوں۔ آپ سے مل کر اچھا لگا۔'' آنے والا نوجوان رسمی الفاظ کہتے ہوئے اب ایک کونے میں اپنا سامان رکھ رہا تھا۔ کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ گویا کمرہ اُسے پسند آیا تھا تب ہی وہ مطمئن انداز میں دو میں سے ایک خالی بستر پر بیٹھ گیا۔ تیسرا بستر ابھی بھی خالی تھا لیکن بستر کے ساتھ کچھ سامان کی موجودگی یہ بتا رہی تھی کہ اس کا کوئی دعویدار موجود ہے، جس سے اسفر اب تک ناواقف تھا۔

لُکاس شاید کافی تھک چکا تھا اسی لیے جوتے پہنے پہنے ہی وہ بستر پر لمبا لیٹ گیا۔ اسفر کے لیے کسی اجنبی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا یہ پہلا تجربہ تھا۔

''تم کہاں سے ہو؟'' لکاس نے نیم دراز حالت میں آتے ہوئے سوال کیا۔

''پاکستان'' اسفر کا جواب یک لفظی تھا۔

''پاکستان!'' لکاس نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ''مجھے پاکستانی کپڑے بہت پسند ہیں۔ میں نے پاکستان کے بارے میں بہت سنا ہے۔''

اسفر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اسے ایک فیصد بھی اُمید نہ تھی کہ پاکستان کے حوالے سے کوئی خوشگوار لمحہ اس کی زندگی میں آ سکتا ہے۔

''موزلم'' لکاس نے اگلا سوال کیا۔

''ایتھیسٹ'' اسفر نے اٹکتے ہوئے کہا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی شخص سے اس نے اپنی اس نئی شناخت کے ساتھ تعارف کروایا تھا۔

لکاس کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا لیکن اس نے صرف ''اچھا'' کہنے پر اکتفا کیا۔ تھوڑی ہی

دیر بعد وہ اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد گویا ہو۔'' یہ کمرہ میری توقعات سے کافی بہتر ہے۔ میں ایک سال نیویارک میں رہا ہوں۔ وہاں اس سے چھوٹا کمرہ چار لوگ استعمال کرتے تھے۔ واش روم استعمال کرنے کے لیے بھی اوقات کار چسپاں تھے۔ صفائی کا کام بھی سب باری باری کرتے تھے۔ پھر بھی وہ کمرہ بدبودار ہی رہتا تھا۔'' لکاس اپنی ہی بات سے محظوظ ہوا۔

اسفر نے صرف اُسے سننے پر ہی اِکتفا کیا کیونکہ ہر دفعہ کچھ بولنے کی کوشش بے سود ثابت ہو رہی تھی۔

''خیر، جیسے تیسے میں نے وہاں وقت گزارا اور پھر ہم عادی ہو گئے تھے اس کے لیکن چلو اچھا ہے یہاں صرف تین لوگ ہیں اور واش روم بھی صاف ستھرا نظر آ رہا ہے۔'' وہ گھوم گھوم کر ایک ایک چیز پر تبصرہ کر رہا تھا۔

''ارے ہاں تم نے بتایا تم پاکستان سے ہو۔ میں نے سنا ہے تم پاکستانی بڑے مزیدار کھانے بناتے ہو۔ تم بھی بنا لیتے ہو؟ ایسا ہو تو مزہ آ جائے گا۔ تم پاکستان سے کیا سامان لائے ہو؟ یہاں تو کچھ خاص نظر نہیں آ رہا؟''

لکاس بغیر رکے بس بولتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی ہر بات کے جواب میں اسفر نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن لکاس اسے بغیر دیکھے ایک کے بعد ایک بات بولتا جاتا۔ وہ کون سا اسفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا کہ اس سے اندازہ ہوتا کہ اسفر بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اپنے آپ میں مگن وہ بولتے بولتے اب ہیڈ فونز نکال چکا تھا۔ دونوں کانوں پر سیٹ کرنے کے بعد ''پھر ملتے ہیں'' کہہ کر ہاتھ ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسفر کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا اور پھر جو کچھ ابھی ہوا تھا اُسے اس پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اچھا ہی تھا۔ اُسے ویسے بھی کہاں بہت باتیں کرنی آتی تھیں۔ وہ ایک اچھے سامع کا کردار بخوبی نبھا سکتا تھا۔

...۞...

ہلکی نیلی شرٹ پر اب نیلے رنگ کا کوٹ پہنے فرحان پہلے سے کمرے میں موجود تھا۔ سب ہی حیرانی سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

''لیڈیز اینڈ جینٹل مین، میرا نام فرحان علی ہے اور میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بزنس انٹیلی جینس اینالسٹ ہوں۔''

ایک سوبر اور پروفیشنل مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی لیکن آنکھوں میں شرارت کے دیے روشن تھے۔

''جیسا کہ آپ جان ہی چکے ہیں کہ لابی میں، میں آپ کا انٹرویو کر چکا ہوں اور آپ سب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ سب نے خوش دلی سے مجھے برداشت کیا اور اپنے خالص خیالات کا اظہار میرے سامنے کیا۔ امید ہیں ہم ایک اچھی ٹیم ثابت ہوں گے۔ باقی معلومات آپ کو مس ردا فراہم کر دیں گی۔''

انتہائی سشتہ لہجے میں اس نے دس ششدر چہروں کے سامنے اپنی چھوٹی سی تقریر مکمل کی اور بغیر کسی کو سنبھلنے کا موقع دیے تمام لوگوں کو باہر ریسپشن پر مس ردا کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

ایک ناقابلِ یقین خوشی کے ساتھ طوبیٰ سمیت تمام ہی نفوس ہنستے مسکراتے باہر نکل آئے جہاں رہ جانے والے امیدوار اب موجود نہ تھے۔ غالباً ان کو باہر ہی باہر واپس لوٹا دیا گیا تھا۔

...۞...

اسفر کتنے ہی دن ایک پارٹ ٹائم نوکری کے لیے بھاگ دوڑ کرتا رہا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ جرمن اب کافی سمجھ آنے لگی تھی۔ کچھ جملے جو عموماً اسامی نہ ہونے کے لیے بولے جاتے تھے اسفر کو اب ازبر ہو چکے تھے۔

یونیورسٹی میں بھی اس کو لیکچر سمجھنے میں اب آسانی ہوگئی تھی۔ اس نے انرجی سائنس ماسٹر پروگرام میں داخلہ لیا تھا۔ یہ اس کی کوئی خاص منتخب کردہ فیلڈ نہ تھی بس جو میسر سیٹیں تھیں اس میں سے ایک میں اسفر نے داخلہ لے لیا تھا۔

"علم تو علم ہے کچھ بھی سیکھ لو!" یہ بات وہ ہمیشہ اپنے اساتذہ سے سنتا آیا تھا اور یہ بات شاید اس کے لاشعور میں ایسی پختہ تھی کہ اس سے یقین تھا کہ وہ جس بھی فیلڈ کا انتخاب کرے گا، کوئی نہ کوئی قابل ذکر کام کر ہی لے گا۔

پڑھائی کی شروعات تو خاصی عمدہ تھی ہی لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا زیادہ سے زیادہ وقت اسائمنٹ اور ریسرچ کے لیے درکار ہوتا۔ جو فری لانسنگ کرنے کے سبب کچھ مشکل سے دستیاب ہوتا۔ جب تک نوکری نہیں مل جاتی تھی یہی اس کی کمائی کا واحد ذریعہ تھا۔

ویانا آئے ہوئے یہ اُسے پانچواں ہفتہ تھا اور اب اس کی جیب تقریباً خالی تھی۔ وہ کمرے میں بیٹھا اپنے ایک اسائمنٹ پر ہی کام کر رہا تھا جب دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔

''یہ لکاس تو نہیں ہوسکتا، اس کی سرشت میں دستک دینا کہاں شامل ہے۔''

اسفر نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوبصورت وضع قطع کا مالک لیکن پستہ قد نوجوان کھڑا تھا۔ سفید لیب کوٹ اس کے ڈاکٹر ہونے کا پتا دے رہا تھا۔ کاندھوں پر ایک بیگ اور ہاتھوں میں ایک بڑا کارٹن تھامے وہ بمشکل کھڑا تھا۔ غالباً دستک دینے کے لیے اس نے کسی کی مدد لی تھی۔

''میں موسیٰ ہوں۔ اس کمرے کا رہائشی ہوں۔ معذرت چابی بیگ کے اندر تھی مجھے آپ کو زحمت دینی پڑی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندر داخل ہوگیا۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اسفر نے خوش دلی سے خوش آمدید کہا اور مدد کی پیشکش کی، جسے اس

نے سشتہ جرمن میں انکار کر کے رد کر دیا۔ وہ مکمل جرمن لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اسفر اس سے کافی مرعوب ہوا۔

''میں یہاں قریبی ہسپتال میں ریذیڈنٹ ہوں اور ساتھ ہی اپنی مطلوبہ فیلڈ میں ماسٹرز بھی کر رہا ہوں۔ یونیورسٹی تو یہاں سے خاصی دور ہے لیکن چونکہ ہسپتال قریب ہے تو یہ لوکیشن میرے لیے کافی فائدہ بخش ہے۔'' وہ اب کارٹن میں سے اپنا سامان نکالتے ہوئے اسفر کو اپنے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔ ''اور آپ؟''

''میں اسفر، پاکستان سے ہوں، یونیورسٹی آف ویانا میں انرجی سائنس ماسٹر پروگرام میں انرول ہوں۔ آج کل جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔'' اسفر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ گو اسے ہر ایرے غیرے سے یہ کہنا عجیب لگ رہا تھا لیکن وہ جس قدر پریشان کن حالات سے دوچار تھا اگر کوئی اس سے سڑک پر جھاڑو لگانے کو بھی کہتا تو وہ راضی ہو جاتا۔

موسیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''بہت اچھے، ہسپتال میں غیر میڈیکل اسٹاف کی ضرورت ہے۔ تم مجھے اپنا cv دے دو میں ضرور آگے بڑھا سکتا ہوں۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اسفر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ دو دن بعد ہی اس کا بلاوا آ گیا لیکن جو آفر اس کے لیے وہاں موجود تھی وہ خاصی دھچکہ پہنچا دینے والی تھی۔

''اسسٹنٹ ایمبلر'' اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو کسی میت کو غسل دینے کی نوکری کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اب یہ حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ یہ نوکری اس کو اس کے مالی گرداب سے نکالنے میں اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔

رات کو موسیٰ سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو موسیٰ اسفر کو دیکھتے ہی نوکری کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔

''ہاں، اسسٹنٹ ایمبلر کی ضرورت ہے اُنہیں۔''

اسفر کے چہرے کی بدلی رنگت دیکھ کر موسیٰ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم تو مسلمان ہو، میں نے تو سنا تھا تم مسلمان موت سے نہیں ڈرتے جیسے ہم یہودی موت سے نہیں ڈرتے۔ موت تو ایک نئی زندگی میں داخل ہونے کا دروازہ ہے، ایک نئی شروعات اور کسی کو اس سفر کے لیے آخری غسل دینا، اس کو سجانا سنوارنا..... یہ تو بڑی نیکی ہے۔''

اسفر موسیٰ کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ جتنے اعتماد سے اس نے لکاس کے سامنے یہ اعتراف بلکہ فخریہ کہا تھا کہ وہ ایک ملحد ہے وہی بات وہ موسیٰ کے سامنے بولتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔

''ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو، مجھے اس جاب سے کوئی مسئلہ نہیں۔ ویسے بھی میں مسلمان نہیں ایک ایتھیسٹ ہوں۔'' بالآخر اسفر نے اپنا حوصلہ بحال کر کے جامع جواب دیا۔

''واقعی؟'' موسیٰ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تو تم خدا پر یقین نہیں رکھتے؟''

''ہاں بالکل۔'' اسفر نے دوٹوک جواب دیا ''میں صرف لاجک پر یقین رکھتا ہوں۔''

''ہوں....'' موسیٰ نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا لیکن وہ اپنے تعجب کا اظہار پہلے ہی کر چکا تھا۔

اگلے دن انٹرویو اور معمول کی جانچ کے بعد اس کو ملازمت مل گئی۔ یہاں دوسرے دن سے اس کی جوائننگ تھی۔ مختلف لوگوں سے ملاقات کے بعد وہ مطلوبہ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا۔ مردہ خانہ پاکستانی ہسپتالوں کے مردہ خانوں کی طرح بالکل نہ تھا۔ صاف شفاف شیشے کی دیواریں اور اس میں لگی قدآور الماریاں جس میں کشادہ درازیں مردہ اجسام کو حفاظت سے رکھنے کے لیے انتہائی مہارت سے ڈیزائن کی گئی تھیں۔

اسفر کو پہلی بار سردی کا شدت سے احساس ہوا۔ غالباً یہ وہ سردی تھی جو اس کی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اپنے سامنے موجود ایک بے جان جسم کو دیکھ کر دوڑ گئی تھی۔

ایک ادھیڑ عمر شخص وہاں پہلے سے موجود تھا۔ کارل نام کا بیج اس کے یونیفارم پر نمایاں تھا۔ وہ ایک فائل میں کچھ اندراج کر رہا تھا جب اسفر نے اپنا تعارف کروایا۔ کارل نے گہرے نیلے رنگ کے یونیفارم میں ملبوس ایک ہینڈسم ایشیائی لڑکے کو دیکھا۔ کلین شیو چمکتا ہوا ہلکا سا نولا رنگ اور اس پر چھ فٹ کا قد۔ کارل اس کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''آ جاؤ..... اسفر!'' اس نے آنکھیں سکوڑ کر ایک بار پھر اسفر کا نام اس کے یونیفارم سے پڑھا۔ یہ تمہارا پہلا دن ہے جو یقیناً کچھ خاص ہوگا۔ تو چلو اسے اور خاص بناتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شخص قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ساتھ رکھی میز پر سے اس نے ایک فائل اٹھائی اور اس کی روگردانی کرنے لگا۔

"اس کو صاف ستھرا کرو تاکہ میں آپ کا اپنا کام شروع کروں۔"

جب کافی دیر تک وہ کچھ نہ بولا تو اسفر بالآخر آگے بڑھا۔

''مجھے کیا کرنا ہے؟''

''کیا تم نے اپنی جاب ڈسکرپشن پڑھی ہے؟''

''جی''

''تم وہی کرو جو وہاں لکھا تھا۔'' میز کی دراز میں سے اس نے ایک پلاسٹک میں قید کاغذ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ جس پر بڑا بڑا جلی حروف میں MANUAL لکھا ہوا تھا۔ اسفر نے ہدایت نامہ ہاتھ میں اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ ایک گہرا سانس لینے کے بعد اس نے بے جان جسم کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ کارل اس کی کوئی مدد نہیں کرنے والا تھا۔

یہ اس کا پہلا دن تھا اور کارل نے اس کو ''یادگار'' بنانے کا پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔ وہ ایک مرد کا لاشہ تھا جو سفید چادر سے سینے تلک ڈھانکا ہوا تھا۔ موت کی ٹھنڈی آغوش کی حقیقت ایک چادر کی مانند اس شخص کو ڈھانپے ہوئے تھی جو نہ جانے اپنی زندگی سے کیا کچھ کشید کر چکا تھا۔ اسفر کو اسے غسل دینا تھا۔ اسفر نے آس پاس کا بغور جائزہ لیا۔ اس کو غسل دینے کی ہر سہولت میسر تھی۔ شاور متحرک ٹرالی، اسٹریچر، عطور اور ساتھ میں ایک خوبصورت لباس۔

اسفر نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے۔ پہلی دفعہ اس کو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور دماغ میں ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔

ایک وقت تھا جب وہ جانتا تھا کہ موت ایک دروازہ ہے اور اب یہ شخص نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہونے لگا تھا، لیکن موجودہ اعتقاد نے جنت کے وعدوں کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ سامنے پڑا وجود اب کوئی معنی نہیں رکھتا تھا پھر بھی وہ ایک بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔

''اسفر!'' کارل کی کرخت آواز پر وہ اچھل پڑا ''تم ٹھیک ہو؟''

اسفر نے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی دھڑکن کو قابو کیا اور اثبات میں سر ہلا دیا ''میں ٹھیک ہوں'' الفاظ کی کڑواہٹ اس کو اپنے معدے تک اترتی محسوس ہوئی۔

''کیا واقعی؟'' کارل نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ اسفر کا پیلا رنگ کسی اور ہی بات کا غماز تھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اب کی مرتبہ اسفر نے مزید سنبھل کر کہا ''اصل میں پہلی دفعہ ہے تو تھوڑا

کنفیوز ہوں۔''

کارل کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی ''فکر نہ کرو یہ اگلی دنیا میں روانہ ہو چکا ہے۔ یہاں اس کا دل نہیں لگے گا، اس لیے اب اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں، تم تسلی سے اپنا کام کرو۔ مجھے بھی اپنی پہلی بار یاد ہے۔''

کارل نے سر ہلا کر محظوظ ہوتے ہوئے کہا ''موت کو اتنے قریب سے دیکھنا آسان نہیں، لیکن آہستہ آہستہ تمہیں عادت ہو جائے گی۔ اپنا کام جاری رکھو۔''

اسفر نے سر تو ہلا دیا لیکن دل تھا کہ سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے دادا جان کی میت اور جنازہ یاد آ رہا تھا۔ اپنے ہوش میں وہ واحد موت تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ دادی بہت رو رہی تھیں لیکن پھر خود ہی اپنے آپ کو صبر کی تلقین کرتیں اور دوسروں کو بھی۔

''بہت کامیاب زندگی گزاری میرے صاحب نے۔ بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا۔ ہر ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی۔ اللہ بہترین مہمان نوازی کریں گے میرے صاحب کی۔ دیکھنا عباس تمہارے بابا خوش ہو جائیں گے۔ مجھے تو بس ان سے جدائی کا غم ہے اور کچھ نہیں۔''

وہ روتی جاتی تھیں اور دلاسہ دیے جاتی تھیں۔ پھر جلد ہی ان کو صبر آ گیا تھا یہ سوچ کر کے صاحب جنت میں گئے ہوں گے کیونکہ وہ نیک آدمی تھے۔ تب ہی اسفر کو اپنے بلّے کی موت کے بعد یہ لگتا تھا کہ وہ نیک تھا، وہ جنت میں جائے گا۔

''دادا جان کبھی کسی جنت میں نہیں گئے ہوں گے کیونکہ اس کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔'' اسفر نے گہرا سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور اپنے ہاتھوں کو مشینی انداز میں حرکت دینے لگا۔ ٹھنڈا جسم اس کے ہاتھوں کا مرہون منت تھا۔ ہدایت نامے کے مطابق اس نے انتہائی احترام کے ساتھ میت کو غسل دیا اور اپنا کام کر کے کارل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

کارل نے سر کی جنبش سے کام کے صحیح ہونے کا اشارہ دیا اور لاش کو محفوظ کرنے کے دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ باقی کسی کام کے لیے اس نے اسفر کی کوئی مدد طلب نہ کی۔

اسفر خاموشی سے کھڑا ایک ٹک اس بے جان اجنبی کے چہرے کو دیکھنے لگا، وہ اجنبی جس کی زندگی کی کہانی وہ نہیں جانتا تھا۔ اداسی کی ایک لہر اسفر کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی۔ کبھی اسے یقین تھا کہ

مُردوں کی روح جنت میں جاتی ہوگی لیکن آج اسے اپنے شک کی کھوکلی گونج نے پریشان کر دیا تھا''کیا بس یہی زندگی ہے؟''کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اسفر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دل و دماغ اِک بے یقینی کے سے انداز میں بوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے تدفین کے لیے ایک جسم کو تیار کیا تھا۔آخری منزل جس کے بعد کوئی سفر نہ تھا۔ اسفر نے آنکھیں بند کر لیں۔

''یہی حقیقت ہے۔ جو میں اب جانتا ہوں یہی حقیقت ہے۔موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ کیسے ہو سکتی ہے؟ ہر شخص ایک مخصوص وقت کے لیے دنیا میں آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔لیکن.... کہاں چلا جاتا ہے؟''

اسفر اپنے دماغ میں بننے والے بھنور میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔

''مطلب ختم ہو جاتا ہے decay ہو جاتا ہے۔''وہ خود کو یقین دلا رہا تھا۔

''اس شخص کا کردار بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کا decay کا عمل شروع ہوگا۔ جو انرجی دنیا میں تھی دنیا ہی میں رہے گی۔ بس شکل بدل جائے گی۔ بھلا جب انسان مٹی ہو جائے گا تو دوبارہ کیسے پیدا ہوگا؟''

اسفر کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنے دماغ میں گونجنے والی آوازوں کو کسی طرح خاموش کرا دینا چاہتا تھا لیکن وہ اس وقت بے بسی کی انتہاؤں پر تھا۔ سرد آنکھوں سے وہ کارل کو بقایا کاروائی کرتے دیکھتا رہا۔ سرد اور بے جان جسم کو طبعیاتی کاروائیوں کے بعد لباس پہنا کر اب آخری رسومات کے لیے رخصت کر دینا تھا۔

''مٹی کے سپرد کرنے کے بعد اس کو بھی سب بھول جائیں گے۔''

اسفر کا سانس رک رہا تھا

''ایسے ہی میں بھی بھلا دیا جاؤں گا۔ مجھے تو ویسے بھی یاد رکھنے کے لیے کوئی رشتے دار، دوست احباب نہیں ہیں۔''نہ جانے کیوں اسفر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

چند گھنٹے کی یہ ڈیوٹی اسے دنوں پر محیط لگی۔ اپنی رہائش پر پہنچ کر بھی وہ کافی دیر باہر ہی ٹہلتا رہا۔ ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار وہ عائشہ کو بے تحاشہ یاد کیے گیا۔ پھر عباس کی وارفتگی، عائزہ

سے لڑائیاں، عافیہ کے بیٹے کی شرارتیں، اس کے دماغ میں فلم کی طرح چل رہی تھیں۔ اس کا دل کیا وہ عائشہ اور عباس کو فون کرے اور ان سے شکوہ کر کے انہوں نے کیسے اسے یاد نہ رکھا؟ کیوں اس کو بھلا دیا۔ وہ اتنے سخت روّیہ کا حقدار تو نہ تھا۔

اگر اس کے خیالات مذہب کو لے کر مختلف تھے تو کیا یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کو سڑکوں پر مارا مارا پھرنے کے لیے یوں چھوڑ دیا جاتا۔ ان کی زندگی کے دائروں میں بس وہ ایک نقطے کی مانند تھا جس پر سے گزر کر وہ آگے بڑھ چکے تھے۔

''آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' وہ چڑ کر اپنی عمارت کے پاس بنی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا ''یہ سب میرا ہی انتخاب ہے۔ مجھے جب فرق نہیں پڑتا تو انہیں بھی کیوں فرق پڑے گا۔''

اسفر بار بار جملوں کی تکرار سے تنگ آ گیا تھا سو اپنا سر ہاتھوں میں گرا کر بیٹھ گیا۔

''شاید میں آج کے واقعے کی وجہ سے زیادہ حساس ہو رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھے عادت ہو جائے گی۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہی ہیں۔ ضروری بات یہ ہے کہ وہ کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی زندگی کو کامیاب بنانا ہے بس۔ یہی اصل کامیابی ہے۔ باقی کچھ نہیں۔''

.....۞.....

''مجھے معلوم تھا، تم ضرور منتخب ہو جاؤ گی۔'' کنول نے ایسے پرسکون انداز میں کہا جیسے اس نے کوئی دستاویز دیکھ رکھی تھی جس پر طوبیٰ کو یہ نوکری مل جانے کہ الفاظ رقم تھے۔

وہ تینوں آج پھر کئی مہینوں کے بعد کنول کے گھر کی چھت پر بیٹھی ہوئی تھیں اور چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''تمہیں کیسے پتا تھا؟'' طوبیٰ نے چہرے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا ''سب ہی کو میرے بارے میں سب پتہ تھا، سوائے میرے۔'' وہ آپ ہی ہنس دی۔

''لڑکی! اتنی تو تم لائق ہو، بس صبر کی ذرا سی کمی ہے۔'' ثناء نے کنول کی تائید کی۔

''اگر اتنی ہی میں لائق ہوں تو باقی جگہوں پر کیوں مجھے رد کر دیا گیا؟'' طوبیٰ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''صبر کے ساتھ ساتھ اس میں توکّل کی بھی کمی ہے۔'' کنول نے ثناء کو باور کرایا اور دونوں ہی ہنسنے لگیں۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ مجھے ایک اچھی جاب کی پچھلے ایک سال سے کتنی ضرورت تھی تم دونوں ہی جانتی ہو۔ یہ کوئی کم عرصہ نہیں۔ میرا ایم۔ بی۔ اے میں ایڈمیشن ابو کی بائیک بیچ کر ہوا ہے۔ وہ اب بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ ایسے میں انسان جلد باز نہ ہو تو کیا ہو؟'' طوبیٰ روانی میں اپنے صفائی دیتی گئی۔ یہ بات اُس کے لیے کتنی تکلیف دہ تھی وہ دونوں کبھی نہ جان سکتی تھیں۔

''ہم تو جیسے تمہارے کچھ لگتے ہی نہیں تھے جو اس مشکل وقت میں تمہارا ساتھ دیتے۔'' کنول نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے کسی پر بوجھ بننا بالکل گوارا نہیں ہے۔''

''ارے میری ملکہ خودداری، دوستوں کے دوستوں پر کوئی احسان نہیں ہوتے۔ یہ بات اگر آپ کو سمجھ آجاتی تو بات ہی کیا تھی!'' ثناء نے چائے کا کپ خالی کر کے سامنے پڑی پلاسٹک کی میز پر رکھتے ہوئے کہا ''اور آپ کا سال بھی ضائع ہونے سے بچ جاتا۔''

''بکواس نہ کرو۔'' طوبیٰ نے اُسے گھُرکا ''میں جانتی ہوں میری مدد کو تم لوگ دل و جان سے حاضر ہو لیکن میں اپنے بل بوتے پر سب کرنا چاہتی ہوں۔ یہ میرا خواب ہے۔ کم از کم تم لوگ تو مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ طوبیٰ نے عاجزی سے کہا تو وہ دونوں ہی ہنس پڑیں۔

''اچھا جناب ہم بالکل سمجھ گئے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ہم ایک ٹکے کی بھی مدد نہیں کریں گے آپ کی۔''

طوبیٰ ان دونوں کو غصے سے گھور کر رہ گئی اور دو وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستی چلی گئیں۔

''بنیادیں کمزور ہوں تو عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے جناب۔ اسی لیے میں اپنی کامیابی کی بنیاد خودداری سے سینچوں گی۔'' طوبیٰ نے بھی جواباً کہا اور مسکرا کر آسمان پر اڑتی چڑیاؤں کو دیکھنے لگی۔ جواب گھروں کی طرف سرشار لوٹ رہی تھی۔

.....۞.....

زندگی بہت مصروف ہوگئی تھی۔صبح یونیورسٹی اور پھر وہاں سے براہ راست ہسپتال۔ جہاں اس کی پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی تھی لیکن ہر گھنٹے پر تنخواہ اتنی آسودہ تھی کہ باقی تمام مشکلات آسان لگنے لگی تھیں۔

لکاس سے اس کی ملاقات بس چند منٹوں کی ہوتی۔ وہ کسی کیفے میں ملازمت کرتا تھا اور اس کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ زیادہ تر وقت باہر گزارتا تھا۔ رات نو بجے جب وہ واپس آتا تو اسفر اپنی پڑھائی میں مشغول ہوتا۔ لکاس حسب عادت بولتا رہتا اور اسفر چند منٹوں کے بعد واپس اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔

موسیٰ سے اسفر کی ملاقات اتوار کے اتوار ہوتی تھی کیونکہ اس کی نائٹ ڈیوٹی رات آٹھ بجے شروع ہو جاتی تھی۔لہٰذا تینوں کو اکٹھے بیٹھنے کا موقع ابھی تک نہ ملا تھا۔

بالآخر کئی ہفتوں کے بعد اتوار کو وہ تینوں ایک ہی وقت میں اپنے کمرے میں موجود تھے سو ایک دوسرے کو مزید جاننے کا یہ اچھا موقع تھا۔

''موسیٰ، آپ سے تو کم ہی ملاقات ہوتی ہے،لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ ایک ڈاکٹر ہیں،کم از کم اگر ہم میں سے کوئی بیمار ہو تو بے فکری رہے گی کہ کوئی معالج ساتھ ہی ہے۔ امید ہے فیس میں کچھ رعایت ملے گی ہمیں۔'' حسب عادت لکاس بلا ختمے کے شروع ہو چکا تھا۔

''رعایت کے امیدوار تو زیادہ تر ایشیائی افراد ہوتے ہیں۔ آپ کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔'' موسیٰ نے ایک دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسفر کی طرف دیکھا ''معافی چاہتا ہوں یہ بس ایک مذاق تھا۔''

اسفر بھی آج کافی ریلیکس موڈ میں تھا تو موسیٰ کی بات کا کوئی خاص برا نہ منایا لیکن جواب دیے بغیر نہ رہ سکا۔

''موسیٰ، ہم ایشین تو سب سے زیادہ خدمات میں پیش پیش رہتے ہیں اور دوسروں سے توقع بھی یہی رکھتے ہیں۔''

اسفر کی حاضر جوابی پر تینوں ہنس دیئے۔ لکاس نے بیئر کا کین اپنے بیگ سے نکالا اور اسفر کو پیش کیا۔

''نہیں میں یہ نہیں پیتا۔'' اسفر نے نرمی سے منع کر دیا۔

لکاس نے حیرت سے اسفر کو دیکھا ''لیکن تم اب مسلمان بھی نہیں ہو، نیو یارک میں میرا ایک روم میں میٹ مسلمان تھا۔ وہ شراب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا اور مجھے بھی پینے سے منع کرتا تھا۔'' لکاس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھے پسند تھا وہ سب کی صحت اور آخرت کی اس کو فکر رہتی تھی۔ اچھا آدمی تھا۔''

اب پتہ نہیں وہ مذاق اڑا رہا تھا یا واقعی تعریف کر رہا تھا اسفر سمجھ نہ پایا، موسیٰ نے بھی لکاس کی بیئر کی آفر کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ اُسے نہ ہی اس کا ذائقہ پسند ہے اور یہ صحت کے لیے بھی اچھی نہیں۔

''اگر بُرا نہ مانو تو ایک سوال پوچھوں اسفر؟'' موسیٰ اسفر سے مخاطب تھا۔

''ضرور!'' اسفر کو اُمید تھی کہ سوال اس کی ملازمت کے تجربے سے متعلق ہوگا لیکن ایسا نہ ہوا۔ سوال انتہائی غیر متوقع تھا۔

''مسلمان تو اپنے عقیدے میں بہت پختہ ہوتے ہیں۔ تم نے کیسے اپنا دین بدل لیا اور خدا کی ذات ہی سے انکاری ہو گئے؟''

اسفر اس بار سٹپٹایا نہیں۔

''میں ایک دیندار مسلم ہوا کرتا تھا لیکن بہت غور و فکر اور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سائنس اس کائنات کی پیدائش کو زیادہ بہتر طور پر ثابت کرتی ہے۔ ایک مافوق الفطرت ہستی کو اس ماسٹر پیس کا سہرا پہنانا مجھے صحیح نہیں لگتا اور شواہد بھی کسی خدا کے نہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ تو مجھے بہتر یہی لگا کہ جس تھیوری کی دلیل موجود ہے اسی کی حمایت اور تقلید کروں۔''

لکاس نے فوراً ہی لقمہ دیا ''میرا بھی یہی خیال ہے اسفر۔ مذہبی دعووں کے بارے میں مجھے بھی ہمیشہ کچھ شک و شبہات ہوتے ہیں۔ میں جب اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا تو ہر ہفتے ہم ساتھ چرچ

جایا کرتے تھے۔ مجھے وہاں سب بہت اچھا لگتا تھا۔تو میں نے سوچا کیوں نہ بائبل کا بغور مطالعہ کروں۔لیکن جیسے جیسے میں نے بائبل کا مطالعہ کیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ پوری کتاب نا قابل یقین قصے کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔تو میں نے سوچا جتنا عیسائی ہوں اتنا ہی ٹھیک ہوں۔''

لکاس کی بات پر تینوں ہی ہنس پڑے۔

''تو گویا تم بھی ایتھیسٹ ہو؟''اسفر نے پر جوش لہجے میں کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بالکل خدا کا منکر تو میں نہیں ہوں، بالکل لادین ہو جانا مجھے پسند نہیں۔ جیسے بھیڑیوں کا ایک غول ہوتا ہے نا اسی میں ان کی طاقت ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی اختلافات اپنی جگہ لیکن میں عیسائی تھا عیسائی ہوں اور عیسائی رہوں گا۔ مذہب میری طاقت ہے۔''

لکاس سے اسفر کو اتنے مضبوط یقین کی قطعاً توقع نہ تھی، اُسے لگا تھا کہ لکاس ایک کھلنڈرا نوجوان ہے اور مذہب کے بارے میں اس کی رائے یقیناً سطحی ہوگی لیکن لکاس کے مستحکم لہجے نے اُسے حیران کر دیا تھا۔

''اسفر! تم مجھے بتاؤ، کیا کائنات کی خوبصورتی اور پیچیدگی اس بات کی گواہی نہیں کہ اس کا ایک خالق موجود ہے؟ میں نے میڈیکل سائنس کے وہ وہ معجزے دیکھے ہیں جس کے بعد میرا اس کائنات کی پیدائش پر ہمیشہ یقین پختہ ہوا ہے۔''موسیٰ پھر اسفر سے مخاطب تھا۔

''ہاں بالکل! یہ کائنات بہت حسین ہے، اس کا نظام ہی پیچیدگی میں اپنے مثال آپ ہے لیکن اس بات کا اب یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کا خالق ہی موجود ہو۔''

اسفر نے مکمل اعتماد سے کہا، اپنے لہجے کی مضبوطی پر اسے خود بھی حیرت ہوئی اگر وکّی یہاں موجود ہوتا تو یہ ضرور کہتا کہ''لالے! آخر کو تو بھی اب پوری طرح مذہب کے چنگل سے نکل گیا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ چلیں مان لیں آپ کے خدا نے کسی وجوہات کی بناء کائنات کا آغاز کیا جس کو آپ سمجھ نہیں سکتے، دوسری طرف اگر یہ مان لیں کائنات کیوں اور کیسے وجود میں آئی۔ اس کا جواب سائنس دے سکتی ہے تو آپ کس پر یقین کریں گے؟''

لکاس نے سرعت سے جواباً کچھ کہنا چاہا لیکن موسیٰ نے اس کی بات کاٹ دی ''خدا نے صحیفوں میں بتایا ہے کہ اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے اُس نے دنیا بنائی اور اسی کے لیے ہم کوشاں ہیں۔''

''تو خدا نے سب کو اپنے دین پر ہی کیوں نہ پیدا کر دیا؟'' اسفر نے برجستہ جواب دیا۔

موسیٰ کے چہرے پر تغیر آ گیا لیکن اس نے آپ کو سنبھالا۔

''لوگ گمراہ ہو گئے، ورنہ وہ ایک ہی دین پر تھے۔''

اسفر کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن فی الوقت بھلائی اسی میں تھی کہ اس معاملہ کو یہیں ختم کر دیا جائے کیونکہ وہ نہ ہی اس کمرے سے ہاتھ دھونا چاہتا تھا اور نہ ہی اس ملازمت سے جو اسے موسیٰ کے توسط سے ملی تھی۔ البتہ لکاس کو اس گفتگو میں خاصی دلچسپی تھی۔

''مجھے مذہب سے خاص لگاؤ تو نہیں لیکن ایک بات تو طے ہے، مذاہب اخلاقی رہنما ضرور ہوتے ہیں، اگر انسان کے اوپر گناہ اور ثواب کی تلوار لٹکتی رہے تو وہ پھر بھی اپنی حدود میں رہتا ہے ورنہ تو سب ایک دوسرے کو مار کر نوچ کر کھا جائیں۔''

''ہاں لیکن مذہب ہی اختلافات کا احترام سکھانے کا واحد ذریعہ تو نہیں ہیں۔''

اسفر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیسے؟ اور انسان نے اخلاقیات کی تعلیمات کہاں سے حاصل کی ہیں؟'' موسیٰ نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''یہودیوں نے غزہ پر حملہ کر کے اس بات کا ثبوت نہیں دیا کیا کہ ان کا مذہب ان کو کوئی انسانیت نہیں سکھاتا؟'' اب کے اسفر کا لہجہ بھی کچھ اکھڑا ہوا تھا، یا ہٹلر نے یہودیوں کو مذہب کے نام پر قتل نہیں کیا؟''

اسفر کے منہ سے بات نکل چکی تھی جو کافی بات بگاڑ چکی تھی۔ موسیٰ کے چہرے کا رنگ بتا رہا تھا کہ اُسے یہ بات بہت ناگوار گزری تھی اور ساتھ ہی لکاس کو بھی لیکن شکر ہوا کہ وہ اسفر کو کاٹ کھانے یا مارنے کو نہ دوڑنے جس کا ڈر اس کو ہر وقت پاکستان میں لگا رہتا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ وہ سب ہی

یہاں ایمگرینٹس تھے اور قانون شکنی کی صورت میں خمیازہ بھگتنے کا تینوں کو اندازہ تھا۔

''اول تو یہ کہ میں یہودیوں کی اس جماعت سے تعلق نہیں رکھتا جو پورے فلسطین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور بے دریغ خون خرابہ کر رہے ہیں، میں مقصدیت پر یقین رکھتا ہوں اور ایک عظیم مقصد کو پانے کے لیے بہرحال قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔'' موسیٰ نے گول مول جواب دیا۔

اسفر اس بات کو یہیں ختم کر دینا چاہتا تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں میرا مقصد قطعاً کسی کے دل کی آزاری نہیں تھا۔ لیکن.....'' اسفر کی بات کو لکاس نے درمیان ہی میں قطع کر دیا۔

بہرحال یہ تو طے ہے کہ مذاہب ازل سے تھے اور الحاد کچھ عرصہ پہلے ہی وجود میں آیا ہے۔ گو کہ مجھے سائنس پر ایمان بھی کچھ غلط نہیں لگتا لیکن زندگی میں معنی اور مقصد تلاش کرنے کے اور بھی طریقہ ہیں صرف یہی نہیں کہ انسان اپنی پہچان ہی کھو دے۔''

اسفر ایک لمحے کو گنگ سا رہ گیا۔ اس وقت ان دو اشخاص کے درمیان بیٹھے اسے اپنا وجود واقعی بے وقعت لگا۔ خدا موجود ہے یا نہیں اس کو اس بات پر شک تھا لیکن بلا کسی تحقیق کے اس نے یہ مان لیا تھا کہ خدا کا وجود ہی نہیں اور اس کی دلیل اس نے ہمیشہ یہ دی کہ کوئی اسے یہ ثابت کر دے کہ وہ موجود ہے۔

''مجھے مزید مطالعہ کی ضرورت ہے۔ خدا یقیناً موجود نہیں۔ کیسے ہوسکتا ہے وہ دکھتا کیوں نہیں۔ اپنی موجودگی کا احساس کیوں نہیں دلاتا۔ نہیں خدا کہیں نہیں۔'' وہ ایک بار پھر اپنے متزلزل یقین کی پیوندکاری میں مصروف ہو گیا تھا۔

...۞...

فضا خنک تھی اور اندھیرے برآمدے کی ٹھنڈ اس کے جسم میں اتر رہی تھی۔ جگہ اس کے لیے بالکل انجان تھی۔ اس نے آس پاس موجود بند دروازوں کو دیکھا۔ دروازوں کے نیچے جھری سے روشنی جھانک رہی تھی۔

''اس میں سے میری قسمت کا دروازہ کون سا ہے؟'' ایک سوال سا اس کے ذہن میں کوندا۔

''یا شاید یہ بند دروازے ہی میری قسمت ہیں۔'' جواب بھی خود ساختہ تھا۔

اچانک ہی عقب میں دروازہ ہلکی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا اور تیز ہوا سے دھڑ دھڑانے لگا، ہوا تھی کہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ بمشکل اپنا آپ سنبھالتی وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کھلے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ دروازہ اپنے آپ ہی بند ہو گیا۔ ایک دفع پھر آنکھیں اندھیرے میں اندھی ہو گئیں۔ خوف کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔

''امی!..... ابو!'' اس نے زور زور سے آوازیں دیں لیکن پتا نہیں سب کہاں تھے اور وہ اکیلی اس انجان اور سنسان جگہ پر تھی جہاں اپنا آپ ہی سجھائی نہ دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد بالآخر آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ ملگجا ماحول۔ اور پھر اچانک ہی دروازے ایک ایک کر کے کھلنا شروع ہو گئے۔ دروازوں سے آنے والی روشنی میں اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ صرف ایک سایہ تھا اس روشنی میں۔ ایک مضبوط مرد کا سایہ۔ طوبیٰ کو تقویت ہوئی کہ وہ اس سنسان جگہ پر اکیلی نہ تھی۔ ''ابو؟'' اس نے تصدیق چاہی۔ لیکن وہ عباس نہ تھے۔

وہ تو کوئی دراز قامت قد شخص تھا۔ طوبیٰ کو لگا وہ کوئی جانا پہچانا ہے..... نہ جانے کیوں اسے اس خاکے سے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ آسمان بھی اب روشن ہونے لگا تھا جیسے صبح ہوئی چاہتی ہو اور پھر اچانک ایک چمکدار پھل کا خنجر اس کے اور اس خاکے کے عین درمیان زمین پر سیدھا آ گرا۔ طوبیٰ کے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکلی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

پسینے میں شرابور وہ کچھ دیر سمجھنے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ کہاں موجود ہے۔اس نے سائیڈ پر رکھی چھوٹی میز پر سے پانی کی بوتل اُٹھائی اور منہ سے لگالی۔غٹا غٹ پانی چڑھانے سے کچھ اوسان بحال ہوے تو وہ پرسکون ہوئی۔

خنجر، چھری اور اس جیسی نہ جانے کیا کیا چیزیں اُسے کبھی نہ کبھی یونہی خواب میں نظر آجایا کرتی تھیں لیکن بہت عرصے سے اس نے ایسا کوئی خواب نہ دیکھا تھا۔آج نہ جانے کیوں اچانک اس کی زندگی کی پرسکون جھیل میں پھر یہ پتھر کی طرح آن گرا تھا۔

وہ آج کل انتہائی مصروف رہتی تھی۔ایم۔بی۔اے کا آخری سال تھا اور جاب کے ساتھ تو اس سے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی پھر یوں اس طرح ایسے خواب کے آنے کا مطلب تھا اسے اب چند روز پھر ذہنی انتشار کا سامنا کرنا تھا۔

وہ نائٹ بلب کی روشنی میں احتیاط سے چلتی دیوار پر لگی کتابوں کی الماری تک پہنچی۔آہستگی سے موبائل کی ٹارچ کھولی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو رمشہ اور حسنہ بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ واپس مڑی اور کتابوں کی اسپائن پر ہاتھ پھیرتی ہوئی ایک نوٹ بک پر آکر رک گئی۔نوٹ بک پر چڑھا پلاسٹک کور اب پیلا ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے سخت اور پرانا ہونے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔

اس نے احتیاط سے وہ نوٹ بک باہر نکالی۔طوبیٰ اکبر کے نام کے ساتھ سرورق پر کچھ بیل بوٹے بھی نمایاں تھے۔وہ وہیں نوٹ بک ہاتھ میں لیے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ٹارچ کی روشنی میں اس نے اوراق پلٹے۔دسویں جماعت کے حساب کے سوالات بڑی صفائی اور عمدگی سے حل ہوئے تھے۔کچھ صفحے پلٹنے کے بعد بالآخر اس نے آخری صفحہ کھول لیا۔

بہت سے فارمولوں اور ضرب اور تقسیم کے کچھ حساب کتاب کے بیچ و بیچ نیلے بال پوائنٹ سے ایک ڈرائنگ بنی ہوئی تھی۔ وہ بالکل وہی اسکیچ تھا جو اس کی پسندیدہ نوٹ بک کا سرورق تھا۔فرق صرف رنگوں کا تھا۔ بنانے والے کے پاس شاید اس وقت ایک بال پن ہی میسر تھا۔طوبیٰ نے ڈرائنگ کے اوپر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ پوروں سے ہوتی ہوئی محبت دل میں سرائیت کر گئی۔اس اسکیچ کے بالکل

نیچے بنانے والے کا چھوٹا سا نام لکھا تھا.... اسفر۔

...۞...

ایک ہی چھت تلے مختلف خیالات، مزاج اور مذاہب لئے تین نفوس اپنے مخصوص اہداف کی تکمیل میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ دوبارہ مذہب کو لے کر کوئی خاص بحث تو نہ ہوتی تھی لیکن وقتاً فوقتاً لکاس اس کو یاد دلانا نہ بھولتا کہ اس کو کبھی کسی پودے کے اگنے میں خدا نظر آیا تو کبھی برگر کی خوشبو میں۔ یہ ہلکی پھلکی گفتگو چند ہفتوں تک جاری رہی اور پھر معدوم ہوتی چلی گئی۔

ویانا میں وقت کا پتا ہی نہ چلتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں شدید موسم کے باوجود زندگی مفلوج نہ ہوتی تھی۔ چاہے درجہ حرارت کتنا ہی منفی کیوں نہ چلا جائے زندگی کی رونقیں بحال رہتیں۔ اسفر کو ویانا آئے ایک سال ہو گیا تھا لیکن کل ہی کی بات لگتی تھی۔

ایسے ہی ایک مصروف ہفتے کے بعد ایک دن اتفاق سے وہ تینوں ہی اپنے کمرے میں موجود تھے۔ لکاس پانچ منٹ پہلے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا اور پاؤں پسار کر اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ پچھلے تین مہینوں سے وہ اپنی نئی گرل فرینڈ اسٹیسی کے ساتھ زیادہ ہی مصروف تھا تو کمرے میں اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔

موسیٰ بھی اسفر کی طرح اپنی کتابوں میں سر دیے بیٹھا تھا جب لکاس ان دونوں پڑھاکو روم میٹس کو اپنے خول سے باہر نکال لانے کے لیے بول پڑا ''ہم ایک سال سے ساتھ رہ رہے ہیں لیکن آج تک کہیں ساتھ گھومنے پھرنے نہیں گئے۔ کیا خیال ہے اگر آج کچھ آوارہ گردی ہو جائے؟''

موسیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے ہاں میں گردن ہلا دی ''اچھا آئیڈیا ہے۔ میں بھی روٹین سے تھک گیا ہوں، کچھ مختلف کرنا چاہتا ہوں۔''

اسفر بھی اپنی ملازمت سے کافی اُکتایا ہوا تھا اور کسی فرار کا راستہ ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے یہ موقع غنیمت لگا۔

پروگرام کے مطابق وہ ایک گھنٹے کے اندر ہی کمرے سے باہر نکل رہے تھے اسفر کا خیال تھا کہ یہ ہوا

خوری اس کو تر و تازہ کر دے گی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ آنے والا وقت اس کے سکون کو تہہ و بالا کرنے والا تھا۔

...۞...

"طوبیٰ بیٹا! آج جلدی گھر آجانا۔" رضیہ نے کچھ جھجکتے ہوئے فون پر کہا تھا۔

کھانے کے وقفے کے بعد وہ ابھی دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہی ہوئی تھی کہ رضیہ کا فون آ گیا تھا۔

"سب خیریت ہے، امّی؟" اُس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، سب خیریت ہے۔ بس تم چار بجے تک لازمی گھر پہنچ جانا۔" رضیہ عجلت میں رابطہ منقطع کرنا چاہتی تھیں لیکن طوبیٰ کی سرد آواز میں دی گئی دھمکی نے اُنہیں ایسا کرنے سے بعض رکھا۔

"اگر آپ وجہ نہیں بتائیں گی تو میرا وقت پر پہنچنا مشکل ہے۔"

افوہ! تم سے تو بات کرنا مشکل ہے۔ کوئی کام ہوگا تب ہی تو بلایا ہے۔" رضیہ بھی چڑ گئی تھیں۔

"آپ کے کام کی نوعیت کا اندازہ مجھے ہو رہا ہے اِسی لیے پوچھ رہی ہوں" طوبیٰ کا لہجہ درشت تھا۔

رضیہ کی خاموشی اُن کی ناراضی کا ثبوت تھی۔

"کچھ مہمانوں سے ملوانا ہے تمہیں۔" بالآخر رضیہ نے ناراض لہجے میں اصل بات بتا دی۔

طوبیٰ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

امّی آپ جانتی ہیں ابھی میں اِس سب کے لیے تیار نہیں ہوں۔" طوبیٰ کے لہجے میں زمانے بھر کی تھکن تھی۔

فون پر بھی رضیہ اُس کی آواز کا دُکھ محسوس کر سکتی تھیں لیکن اوپر تلے تین بیٹیوں کے والدین ہونا کبھی کبھی انسان کو بہت جلد باز بنا دیتا ہے۔

"طوبیٰ، وہ میرے دور کے رشتہ دار ہیں۔ بہت اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں لڑکا بھی پڑھا لکھا اور شریف ہے۔ ابھی کوئی اچھی تنخواہ نہیں ہے لیکن قابلیت کے بل بوتے پر آگے سب اچھا ہی ہوگا۔"

رضیہ نے طوبیٰ کو پیار سے چمکارا۔" کب تک شادی کے نام سے یوں بھاگتی رہو گی؟ رضیہ کے لہجے کی

بے چارگی طوبیٰ کو اِک عجیب احساسِ جرم میں مبتلا کر گئی۔

"تُم سن رہی ہو؟" رضیہ نے چند لمحوں کی خاموشی کو توڑتے ہوئے دریافت کیا۔

طوبیٰ سامنے میز پر رکھے قلم کو ہاتھ میں اُٹھا کر اُنگلیوں کے درمیان مسل رہی تھی۔

"ہیلو؟" رضیہ نے ایک بار پھر پکارا۔

"کیا آپ نے اُنہیں میرے بارے میں سب بتا دیا ہے؟" طوبیٰ نے دوٹوک بات کرنے ہی میں عافیت جانی۔

"ایسے پہلے ہی ملاقات میں ہی تو سب کچھ نہیں بتا سکتے۔" رضیہ کچھ برہم ہوئیں۔

"بات آگے بڑھے گی تو دیکھیں گے۔"

"معذرت امّی، میں نہیں آسکوں گی۔" طوبیٰ نے جواب دیا۔ رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

...۞...

ویانا کے وسط میں ہرے بھرے درختوں کی قطاروں کے درمیان خوبصورت شاہراہیں سیاحوں کے لیے خاص کشش کا باعث ہیں۔ وہ تینوں با آسانی چند ہی گھنٹوں کے ٹرین کے سفر بعد خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں موجود تھے۔ بلا شبہ وہ ایک خوبصورت دن تھا اور ان تینوں ہی نے ایک دوسرے کی کمپنی کو خوب انجوائے کیا تھا۔ دنیا کے سب سے پرانے چڑیا گھر گھومنے کے بعد شام ڈھلے وہ ایک نائٹ کلب میں موجود تھے۔

میکانکی میوزک اور بے ہنگم شور کلب کی رنگ برنگی قمقموں سے مزین دیواروں پر اپنا سر مار رہی تھی۔ نیم برہنہ اجسام اپنی ہی دھن میں مگن تھرک رہے تھے۔ ہوا دھوئیں کے مرغولوں سے کثیف ہو چلی تھی اور انتہائی دوستانہ ماحول میں اسفر بہت عرصے بعد اپنے اندر خوشی محسوس کر رہا تھا۔

اکیلے جیتے جیتے وہ تنگ آ گیا تھا اور آج کلب کے شور میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ برقی لیزر کی رنگین شعاعیں ادھر سے ادھر رقصاں تھیں۔ اپنے کزنز کی شادیوں کے علاوہ اسے کبھی موسیقی پر ناچنے کا تجربہ نہ تھا لیکن ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ پاؤں خود بخود تھرک رہے تھے۔

''اصل دنیا کی حقیقت تو یہی ہے۔ ہر شخص خوش ہے۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرتا ہے۔ جینا تو بس لمحوں کو جینا ہے۔ کل کس نے دیکھی ہے۔''

اسفر اور موسیٰ تھوڑی ہی دیر میں کونے میں موجود میز کے پاس کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے اور لڑکے لڑکیوں کو تھرکتا دیکھ رہے تھے۔ لکاس بھی موسیقی کی دھن پر تھرکتا، ٹھمکتا تین بوتلیں ہاتھوں میں سنبھالے ان کے پاس چلا آیا۔

موسیٰ نے لپک کر دو بوتلیں اس کے ہاتھ سے لیں اور ایک اسفر کی طرف بڑھا دی۔

اسفر نے ہچکچاتے ہوئے بوتل تھام لی۔ ان دونوں میں سے کسی نے یہ نہ پوچھا کہ کل تک تو تم شراب کو ہاتھ لگانے پر بھی تیار نہ تھے اور آج خوشی خوشی پوری بوتل چڑھانے پر رضامند ہو۔

ایک اطمینان کی کیفیت میں انہوں نے بوتلیں آپس میں ٹکرائیں اور منہ سے لگا لی۔ الکوحل کے کڑوے ذائقے نے اس کو بوتل کو ایک دم سے منہ سے دور کرنے پر مجبور کر دیا۔

اُسے کھانسی کا وہ شربت یاد آیا جو عائشہ اسے سردی کی راتوں میں پلایا کرتی تھیں۔

''اخ!.... کیا یہ بدذائقہ محلول پینے یہاں آیا ہوں؟'' اس نے بوتل میز پر رکھ دی۔ لکاس اور موسیٰ ابھی بھی گھونٹ بھر رہے تھے۔

دونوں کے اسرار پر اسفر نے ایک بار پھر بوتل ہاتھ میں لے لی۔ جیسے ہی ہونٹوں سے لگائی دماغ میں ایک بجلی سی کوندی ''حرام.....حرام۔'' اس نے جھٹ سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جس کو حلال حرام کی فکر ہوتی اور اسے بھی کیوں ہوتی۔ اس کے لیے اصل بات اب پسند اور ناپسند تھی۔ نہ کہ حلال حرام کا فنڈا۔

سر جھٹکتے ہوئے ایک بار پھر اس نے کڑوے گھونٹ کو اپنے اندر اتار لیا۔ یہ اس کی خوش فہمی تھی کہ دوسری بار میں وہ محلول خوش ذائقہ لگے گا۔ اس بار پھر وہ محلول اتنا ہی بدذائقہ تھا۔ لیکن ایک الگ سی سرشاری عود آئی تھی۔ وہ ایک سیڑھی مزید چڑھ گیا تھا۔ وہ خوش تھا۔ مسرور تھا۔ ایک ناقابلِ یقین سرور نے اسے گھیر لیا تھا۔

''یہی ہے اصل زندگی۔'' وہ بار بار اپنے آپ کو باور کروا رہا تھا۔ اس نے جیب سے ایک ٹافی نکالی اور منہ کا ذائقہ بدلنے لینے کے لیے منہ میں ڈال لی۔

اسٹرابیری اس کا پسندیدہ فلیور تھا۔ اس کا مزید اس بدذائقہ مشروب کو ہاتھ لگانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

موسیٰ اور لکاس ہجوم میں گم ہو چکے تھے۔ کپلز کی صورت میں اجسام ایک دوسرے سے خوشیاں کشید کر رہے تھے۔ وہ بھی آگے بڑھا اور ایک تھرکتی لڑکی کے کاندھے پر توجہ طلب انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔ سنہرے سلکی بال، سلیولیس ٹاپ اور تنگ جینز میں ملبوس وہ حسینہ باربی ڈول لگ رہی تھی۔

دو گھونٹوں نے ہی اسفر کو مدہوش کر دیا تھا۔ اسے وہ چھوٹی آنکھوں اور موٹے ہونٹوں والی حسینہ بھی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ایک لمبے چوڑے نوجوان کے ساتھ محوِ رقص تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسفر کی طرف دیکھا اور اس کے کان کے قریب آ کر سرگوشی کی ''آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ۔''

اسفر کو لگا آس پاس کا شور ایک دم معدوم ہو گیا ہے اور تمام روشنیاں زن سے منظر سے غائب ہو گئی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک بس سٹاپ پر کھڑا پایا۔ قریب ہی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے آس پاس دیکھا سڑکوں پر ٹریفک رواں تھا۔ رات کے اندھیروں کے بجائے روشنی ہی روشنی تھی۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ اتنی زور سے کہ اندھیرے بھی چندھیانے لگے۔ اسفر نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ شور لوٹ آیا۔ وہی مبہوت کر دینے والی رنگینیاں عود آئیں۔ یکا یک اسے وحشت ہونے لگی۔ لرزتے ہاتھ ایک بار پھر سامنے میز پر پڑی بوتل کی طرف ان دیکھی قوت کے سبب کھنچتے چلے گئے۔ الکحل نے ایک دفعہ پھر اس کا حلق چیر دیا۔ زبردستی گھونٹ بھرنا اس کی مجبوری بن گیا۔

''یہی حل ہے ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کا۔'' اس نے خشمگیں نگاہوں سے DJ کو دیکھا۔ مستی میں جھومتا، ہپی جیسی قمیض اور شارٹس پہنے، لمبے گھنگھریالے بال، سر پٹک کر لہراتا وہ DJ اسے خوب بھایا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی انگلیاں محوِ حرکت تھیں۔ سینکڑوں لوگوں کو اس نے اپنی انہی انگلیوں

پر نچایا ہوا تھا اور یہاں وہ خود اپنے آپ پر ہی قابو نہ رکھ پا رہا تھا۔

اس نے ایک ہی سانس میں بوتل خالی کر دی۔ یہ ہی راستہ تھا اپنے ماضی سے فی الووقت جان چھڑانے کا۔ جسم پرسکون ہونے لگا تو ٹانگیں بھی تھرکنے لگیں۔ سراب مزید ماند پڑنے لگے۔ موسیقی کے ہالے اسے اپنے ارد گرد محسوس ہوئے اور وہ اس بے ہنگم ہجوم کا حصہ بن گیا۔ سب کی حرکت معدوم ہو رہی تھی۔

''آزادی!'' اس نے نعرہ بلند کیا۔ بالوں میں سرور بھرتی انگلیوں کا لمس، مسحور کر دینے والا تھا۔ بس ایک ہیولہ تھا۔ جو اس کے سامنے تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ عائشہ نے بھی اسے مسکرا کر دیکھا۔ اس کا دل تمانیت سے بھر گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے ''امی، میں نے آپ کو بہت یاد کیا'' اس نے شکوہ کیا۔'' میں نے بھی'' آواز نا مانوس تھی لیکن کانوں میں رس گھول گئی۔ ایک تیز خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی اور گرم جسم کی بھینی بھینی مہک اس میں شامل ہو گئی۔

بازو کھولے وہ چھت سے لٹکتے چمکدار ستاروں کو دیکھ رہا تھا اور گداز جسم کو محسوس کر رہا تھا۔ مجھے پتا تھا تم ضرور میرے پاس آؤ گی۔ اس نے سامنے کھڑی صنف کے نرم بالوں کو چھوا۔ ایک گداز احساس نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا۔

''دنیا ہی جنت ہے اور یہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ بھرپور جینا ہی عقل مندی ہے۔'' مصنوعی تاروں سے بھرا آسمان مدھم ہوتا گیا۔

.....۞.....

کنول اور ثناء دونوں ہی اس کے انتظار میں چھت پر اپنی مخصوص جگہ بیٹھی تھیں ۔جیسے ہی طوبیٰ نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا وہ دونوں اس سے بھاگ کر لپٹ گئیں۔

''بہت بہت مبارک ہو۔''

طوبیٰ کی مسرت چہرے سے نور بن کر پھوٹ رہی تھی۔ ان دونوں کو دائیں بائیں لیے وہ چھت پر رکھی تین کرسیوں کے پاس جا پہنچی۔

''تو طوبیٰ اکبر! آخر کار تمہارا ایک اور خواب پورا ہو گیا۔ ایم۔ بی۔ اے کرنے کا خواب۔ کیا احساسات ہیں آپ کے؟''

ثناء نے کسی نیوز رپورٹر کی طرح طوبیٰ سے سوال کیا۔ وہ دونوں تو اپنی ڈگریاں پچھلے سال ہی لے چکی تھیں اور دونوں ہی اب اپنی آگے پیچھے ہونے والی شادیوں کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

طوبیٰ،تشکر سے مسکرا دی

"زندگی دن بدن خوبصورت ہوتی جا رہی ہے۔ میری ہمیشہ سے خواہش تھی اس ڈگری کی اور ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب کرنی تھی،اب دونوں میرے پاس ہیں۔"

''تو جناب! اس خوبصورتی کو چار چاند لگانے والا کب آ رہا ہے؟'' کنول نے بڑی ادا سے پوچھا۔

طوبیٰ کے چہرے کا نور ایک دم ہی ماند پڑ گیا،اس نے قطعیت سے کہا۔

''یہ کامیابیاں میں نے بڑی محنت سے حاصل کی ہیں اور اس کو چار چاند بھی میں ہی لگاؤں گی۔''

ثناء اور کنول ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔

'' میری شادی ہو جانے دو پھر دیکھو میں ہی ڈھونڈتی ہوں تمہارے جیسا کوئی سر پھرا'' ثناء نے ماحول کو ہلکا پھلکا بناتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میں تم دونوں کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے بہتر ہوگا اس موضوع پر ہم بات نہ

کریں۔ میری زندگی کی ترجیحات میں شادی کا لفظ کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ بات تم دونوں ہی بہت اچھی طرح جانتی ہو۔تم دونوں اپنی نئی زندگیاں شروع کرنے جا رہی ہو۔اس لیے میں کوئی سخت بات نہیں کروں گی لیکن میرے نزدیک شادی ایک سطحی سا رشتہ ہے۔ یہ حقیقی محبت جیسی کسی چیز پر میں یقین نہیں رکھتی۔ اگر یہ واقعی ہوتی تو ایسا کیونکر ہوتا کہ ایک دوسرے کے بغیر جینے کے تصور کو محال سمجھنے والوں کی زندگی شادی کے ایک سال بعد ہی بدمزہ ہو جائے؟''

طوبیٰ نے کہا تو بس بولتی ہی چلی گئی۔ثناء اور کنول چپ چاپ اسے دیکھے گئیں۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے یہ سب شاید ابھی نہیں کہنا چاہیے تھا۔ پلیز ان سب باتوں کو بھول جاؤ اور بس ایک بات یاد رکھو کہ میرے لیے اس طرح کے کوئی پلان نہ بناؤ۔''

''تم پاگل ہو۔'' کنول نے منہ پھلا کر بس اتنا ہی کہا اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

''محبت کوئی سطحی رشتہ نہیں ہے طوبیٰ!'' ثناء نے بالآخر صفائی دی۔

''یہ تو بس کرتے چلے جانے کا نام ہے۔ چاہے خدا سے ہو یا خدا کے کسی بندے سے بالکل ایسے ہی جیسے زمین کی سورج کے گرد کبھی نہ ختم ہونے والی گردش، گردش ختم تو بس قیامت بپا۔''

''قیامت ہی تو دیکھ چکی ہوں میں۔'' طوبیٰ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی

''قیامت ہی سے تو ڈرتی ہوں۔''

اچانک ہی طوبیٰ کی نظر کرسی کے کنارے رکھے ایک بڑے لفافے پر پڑی۔

''یہ کیا ہے؟'' موضوع بدلنے کے لیے اسے اس سے بہتر بات کوئی اور نہ لگی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیں: ''یہ تمہاری اَن گنت کامیابیوں میں سے ایک اہم کامیابی کا تحفہ ہے۔'' کنول نے محبت سے کہا۔

اسی اثناء میں ثناء نے وہ پیکٹ جھپٹ لیا۔''لیکن ایک شرط پر ملے گا۔''

''کیا؟'' طوبیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہمیں زبردست سی ٹریٹ دو گی۔''

طوبیٰ کھلکھلا کر ہنس دی ''ہاں بالکل کیوں نہیں!''

طوبیٰ نے لفافہ کھول لیا۔ ایک بے حد نفیس سبز رنگ کا سلک اسکارف تھا جس کے آنچل پر خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے اور ساتھ میں خوشبو کا بہترین انتخاب۔''

''بہت خوبصورت ہے۔'' طوبیٰ دل سے خوش تھی'' مجھے نہیں پتا میں اچھی دوست ہوں یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ جن کے ساتھ میری دوستی ہے وہ بہترین ہیں۔''

وہ دونوں بھی ساتھ ہی مسکرا دیں۔

''یہ سب تم دونوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ورنہ میں تو بس ہار ماننے والے تھی۔''

''اوہو.....! طوبیٰ اکبر اور ہار مان لیں۔ جیسے کڑکتی دھوپ میں برف باری ہو جائے۔''

وہ دونوں دوبارہ ہنس پڑیں۔ خوبصورت شام کا اختتام بھی خوبصورت تھا۔

.....۞.....

آنکھ کھلی تو دھندلے سائے اس کی آنکھوں کے سامنے منڈلا رہے تھے۔ اسفر نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کمرہ مکمل روشن تھا لیکن سر بھاری ہونے کے باعث اس کا دل کیا کہ وہ دوبارہ نیند کی وادیوں میں اتر جائے۔

اِکّا دُکّا گاڑیوں کے گزرنے کی آواز جن کا وہ عادی تھا آج نامانوس لگ رہی تھیں۔ اس نے ایک دفعہ پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس دفعہ پورے ہوش وحواس میں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھڑی کی تلاش میں تکیہ کے نیچے ہاتھ مارا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ گھبرا کر دیکھا تو گھڑی ابھی تک کلائی پر تھی۔ گزشتہ رات کا پہنا ہوا لباس کچھ بے ترتیب حالت میں اب تک جسم پر تھا۔

''اوہ!'' اسفر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ پیر کے دن اس کی صبح آٹھ بجے سے دو وقفوں کے ساتھ چار کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔

''تیسری کلاس بس اب شروع ہونے والی ہوگی۔'' اس نے حساب لگایا۔

''آخری کلاس ڈیڑھ گھنٹے بعد ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔''

وہ ایک ہی جست میں باتھ روم میں تھا۔ لکاس اور موسیٰ کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ بیس منٹ بعد وہ ٹرین میں تھا۔ یہ اتنے دونوں میں پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اس وقت ٹرین میں سفر کر رہا تھا ورنہ اوقات کار صبح اور شام ہی کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آج ٹرین میں کوئی شناسا چہرہ موجود نہ تھا۔

وہ خاموشی سے باہر تیزی سے گزرتی لائٹوں کو دیکھنے لگا اور ہاتھ کے ناخن سے اپنے بیگ کے اسٹریپ کو کھرچنے لگا۔

نگاہوں کی تمازت نے اسے سامنے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی جو بے فکری سے چیونگم چبا رہی تھی اور بے دھیانی میں اسفر پر نظریں ڈالے بیٹھی تھی۔ دودھیا رنگ پر چمکدار اور سبز آنکھیں اور اس پر گہرے بھورے بال، وہ ایک گڑیا لگ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکے بھورے نشان

تھے جو زیادہ ناک اور رخسار کی ہڈی پر موجود تھے۔

پستہ قد لیکن گٹھے ہوئے جسم کی مالک وہ پرکشش لڑکی سرعت سے چیونگم چباتے واک مین پر موسیقی سننے میں بے انتہا مگن تھی۔ اسفر یک ٹک اس کو دیکھے گیا۔ نظر ہٹا کر کبھی باہر دیکھتا تو پھر دل مچلنے لگتا کہ اس کو دوبارہ دیکھے۔ کل رات کا نشہ جیسے دوبارہ چڑھ رہا تھا۔

ہلکے نیلے رنگ کا ٹاپ اور اس پر گہرے نیلے رنگ کی چست جینز پہنے وہ لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دنیا کی باسی تھی۔ اسفر اس کے بالکل سامنے تو نہ بیٹھا تھا لہٰذا چور نظروں سے بار بار اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ بہت ہی شد و مد کے ساتھ اسفر اس کے چہرے پر موجود بھورے تل گننے میں محو تھا کہ اچانک ہی چمکدار سبز آنکھوں نے اسفر کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکا۔

وہ گڑبڑا گیا اور بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب اسفر نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوبارہ اس سمت دیکھا تو وہ لڑکی بدستور اسفر کو دیکھ رہی تھی۔ شرارتی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اسفر نے بھی جواباً ہلکی سی مسکراہٹ سے خاموش گفتگو کا آغاز کیا۔

جب تک دونوں مطلوبہ اسٹیشن پر نہ پہنچ گئے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسفر یوں اپنے بدلاؤ پر بہت خوش تھا اور مطمئن بھی۔ بلآخر وہ مذہب کے چنگل سے مکمل طور پر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک ہی رات میں اس نے سالوں کا سفر طے کر لیا تھا۔ ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ اٹھانے کی پابندی سے وہ آخر کار آزاد ہو گیا تھا۔

وہ دونوں ایک ہی اسٹیشن پر اترے تھے۔ گویا اس مختصر سفر کی منزل ایک ہی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے ہی ٹرین سے باہر نکلے دو قدم آگے بڑھنے کے بعد وہ یکدم مڑی اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''ہائے.... میرا نام زینیا ہے'' تکلم غیر مقامی انگریزی لہجے میں تھا۔ اسفر نے مسرت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اسفر۔''

''اچھا نام ہے۔'' اب کی دفعہ سشتہ جرمن میں جواب آیا

''میری انگریزی زیادہ اچھی نہیں۔'' اس نے دوبارہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کا سہارا لیا۔

''اور میری جرمن....'' اسفر نے برجستہ کہا۔ جس پر وہ دونوں کھل کر ہنس دیئے۔ اسفر کو یاد نہیں تھا وہ آخری بار کب اتنے دل سے ہنسا تھا۔

مذہب کی دیوار کو پھاندنے کی جو کشمکش ان گنت دنوں سے جاری وساری تھی وہ بالآخر ختم ہوگئی تھی۔ اسفر کو آج دنیا کسی اور ہی رنگ کی نظر آرہی تھی۔ جب تک وہ جنت کے خواب دیکھتا تھا دنیا پھیکی اور بے رنگ نظر آتی تھی، لیکن اب جب کہ دنیا ہی سب کچھ تھی اور موقع بھی ایک تو ہر چھوٹی چیز بھی بامعنی ہوگئی تھی۔

گفتگو ہلکی پھلکی جرمن میں جاری تھی۔ زینیا فراوانی سے جرمن بول رہی تھی اور اسفر کے بارے میں مزید جاننے کی خواہشمند تھی لیکن اسفر کی کمزوری کے پیش نظر وہ بعض اوقات انگریزی کا سہارا لے کر اپنی مسلسل چلتی زبان کی تشریح کرتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بالآخر ان دونوں کے جدا ہونے کا وقت آ گیا تھا کیونکہ اب دونوں کو مخالف سمتوں میں جانا تھا۔

اس چھوٹی سی ملاقات میں اسفر کو جو معلومات میسر آئی تھیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ زینیا جتنی کم عمر لگتی تھی وہ اتنی کم عمر بالکل نہ تھی۔ اس کی عمر چوبیس سال تھی۔ ہائی اسکول کے بعد وہ قریب ہی ایک کیفے میں ملازمت کرتی تھی۔ اُسے ڈانس کرنا بہت پسند تھا اور موسیقی اس کی روح کی غذا تھی۔ اُسے نئے دوست بنانا اور ان کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگتا تھا اور اب اس کا موبائل نمبر اسفر کے موبائل میں بھی محفوظ تھا۔

مسرت اور شادمانی کے احساس نے اسفر کو اور ہلکا پھلکا کر دیا اور وہ کب اپنی مطلوبہ کلاس لینے پہنچا اسے پتا ہی نہ چلا۔ آسٹریا آنے کے بعد یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ اس کی دو کلاسز چھوٹ گئی تھیں اور اُسے ان کا ذرہ برابر بھی ملال نہ تھا۔ آج اسفر کا خواہ مخواہ ہی گنگنانے کا دل کیا اور وہ اپنی دھن میں مگن اپنی ملازمت کی جگہ پر پہنچا۔ آج سرد خانے میں دو مردے اس کے منتظر تھے۔

اس میں سے ایک بوڑھی عیسائی عورت کا لاشہ تھا اور ایک بائیس سالہ نوجوان جو رات نشے میں دھت کسی گڑھے میں جا گرا تھا۔ حالانکہ یہاں آسٹریا میں ایسے گڑھے ناپید تھے جن سے بچ کر چلنا پاکستانیوں جیسے بازی گروں کی سرشت میں شامل تھا لیکن شاید دنیا میں اس کا وقت اتنا ہی تھا۔ شاید کوئی اس کی کمبختی ہی تھی جو وہ تعمیراتی جگہ کی طرف جا نکلا اور اپنی قیمتی جان گنوا بیٹھا تھا۔

اسفر کو اس لڑکے کی موت پر کچھ تاسف ہوا۔ کیا ہی خوبصورت نوجوان تھا۔ غالباً اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے بازو اور شکم پر تنے پٹھے اس بات کے غماز تھے کہ بہت مشقت اور کسرت کے ساتھ ان کی بناوٹ پر کام کیا گیا تھا۔ صرف چند گھنٹوں پہلے وہ ایک جوشیلا جوان ہوگا لیکن کچھ ہی وقت بعد وہ مٹی کی نظر ہونے کو تھا۔

''بیوقوف، کیا ہی اچھا ہوتا اس زندگی کا بھرپور استعمال کرتا، کتنا کارآمد ہوسکتا تھا، یہ شخص اس دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے۔'' اسفر نے تاسف سے سوچا، اب وہ اس جسم کو آخری ٹچ دے رہا تھا۔ سیاہ لباس کے اوپر سفید رومال لپیٹ کر جیب میں رکھنے میں اسے بس چند ہی منٹ لگے۔ جس تذبذب کا شکار وہ پہلے جسم کو غسل دینے میں ہوا تھا اب اس کا شائبہ تک نہ تھا لیکن ایک احساس ہر دفعہ مشترکہ تھا۔ اچھے وسائل کے دنیا سے چلے جانے پر وہ ہمیشہ ہی غمگین ہو جاتا۔

ہاں لیکن کسی عمر رسیدہ شخص کے جسم کو دیکھ کر کسی قسم کا کوئی احساس نہ جاگتا۔ بس اتنا ہی جتنا ایک تھکے ہارے آدمی کو نوکری سے واپس پلٹتے دیکھ کر ہوتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی سہل ہونے لگی تھی اور حلقہ احباب میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس اضافی حلقہ احباب میں سرفہرست زینیا تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی کافی پیش قدمی ہو چکی تھی لیکن اگلی ملاقات میں بھی کچھ وقت لگنا تھا کیونکہ ہفتے کے اختتام پر اُسے دو مضامین کے اسائمنٹس جمع کرانے تھے۔

اسفر نے مناسب سمجھا کہ زینیا سے فراغت کے بعد ہی رابطہ کیا جائے اور خلافِ توقع زینیا نے بھی اس سے کوئی رابطہ نہ کیا حالانکہ جتنی سرعت سے کانٹیکٹ نمبر کا تبادلہ ہوا تھا اسفر کو لگا تھا زینیا

اگلے دن ہی اسے کال نہ صحیح کوئی پیغام تو بھیج ہی دے گی۔

لیکن آہستہ آہستہ اسفر کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ آسٹریا میں موجود زیادہ تر لڑکیاں انتہائی خوش مزاج اور دوستانہ رویہ رکھتی ہیں۔ ایشیائی مردوں کے لیے بلا مبالغہ یہ بات اتنی آسانی سے ہضم ہونے والی نہ تھی اسی لیے شاید اسفر کو بھی ہر دوستانہ مسکراہٹ کو فریفتگی سمجھ لینے کے مرض پر قابو پا لینے میں تھوڑا وقت لگا۔

یونیورسٹی سے واپسی پر اس نے جب سے موبائل نکال کر ''ہیلو'' کا ایک میسج زینیا کو بھیج دیا۔ سُرعت سے جواب موصول ہوا اور تمام یاسیت بھک سے اُڑ گئی۔ اگلی ملاقات جلد طے ہونا قرار پائی اور وہ بھی صرف ایک دن کی دوری پہ۔ ایک دفعہ پھر جاندار مسکراہٹ چہرے پر سج گئی اور اسفر کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی رونقوں سے محظوظ ہونے لگا۔

اپنے کمرے میں اسفر جب گنگناتا ہوا داخل ہوا تو اسے بالکل توقع نہ تھی کہ وہاں موسیٰ سے اس کی ملاقات ہو جائے گی۔ رسمی گفتگو کے بعد اسفر کی زبان پر یہ الفاظ آتے آتے ٹھہر گئے۔ یہ کمرہ موسیٰ اور لکاس کا بھی اتنا ہی تھا جتنا اسفر کا بس حسن اتفاق کہ اس کی مصروفیت کے اوقات کار ان دونوں ہم کمرہ سے الگ تھے اور اسے ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے وہ اکیلے ہی وہاں رہتا تھا۔

گو کہ کبھی کبھی اسے اپنی سوچ پر شائبہ ہوتا لیکن اس کے دل و دماغ میں یہ بات بس گئی تھی کہ موسیٰ اسے ایک ملحد کی حیثیت سے پسند نہیں کرتا، بہت یاد کرنے پر بھی اس کی یادداشت میں ایسی کوئی بات نہ تھی جب موسیٰ نے اپنے لب و لہجے میں سے اس بات کا اظہار کیا ہو۔ لیکن بس ایک خلش تھی جس نے اسفر کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

''کافی دنوں بعد تمہیں دیکھ کر اچھا لگا۔'' موسیٰ ہی نے گفتگو کا آغاز کیا اور ان دونوں کے درمیان کثافت کی تہہ کچھ مبہم ہو گئی۔

''ہاں مجھے بھی، تم خاصے مصروف رہتے ہو۔'' اسفر نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔

''ہاں!'' موسیٰ نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''ہسپتال، یونیورسٹی اور پھر سوشل سروس کے کام۔''

اسفر نے تائید میں سر ہلایا ''ہاں تمہاری مصروفیات کافی زیادہ ہیں، کمال ہے اس میں سے بھی سوشل سروس کے لیے وقت نکال لیتے ہو۔''

موسیٰ شاید بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے سر دیوار سے ٹکا کر بیٹھے بیٹھے اپنے بستر پر ٹانگیں آگے کو پسار لیں۔

"وقت ہی ایسا ہے میری قوم پر اور وقت پڑنے پر بھی اگر میں لوگوں کے ساتھ نہ کھڑا ہوں تو یہ تو میرے وجود ہی کی نفی ہے۔''

اسفر اس کی گول مول باتوں میں الجھ گیا۔ ابھی وہ سوشل سروس کی بات کر رہا تھا اور اب وہ اپنے لوگوں کو درمیان میں لے آیا۔ اس نے ناسمجھی کی کیفیت میں موسیٰ کو دیکھا۔ موسیٰ ہلکی آواز سے ہنستے ہوئے تھوڑا اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم یقین کرو اس وقت مجھے جتنا اطمینان تمہارے ملحد ہونے کا ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔''

موسیٰ کی بات پر اسفر مزید گھن چکر بن گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اسفر نے وضاحت طلب کی۔

''اسفر! جب تم نے پہلی بار یہ بات کہی تھی کہ تم خدا پر یقین نہیں رکھتے تو مجھے بہت غصہ آیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا کم از کم ہم یہودیوں کے دشمنوں میں سے ایک خود ہی باہر نکل گیا۔''

حالانکہ اسفر کا برا ماننے کا کوئی حق نہیں بنتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اس کا خون یک دم ہی کھول اٹھا۔ واضح طور پر موسیٰ کا اشارہ غزہ میں چھڑی جنگ کی طرف تھا جہاں یہ جنگ زبردستی ایک ہنستے بستے خطّہ کو ہتھیانے کے لیے یہودیوں نے معصوم لوگوں پر مسلط کر رکھی تھی اور ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اسفر کے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔ مسلمانیت تو وہ کب کی چھوڑ چکا تھا لیکن آج موسیٰ کی بات نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اُسے اپنا آپ ایک بھگوڑے کی طرف محسوس ہوا۔ وہ بھگوڑا فوج سے صرف اس لیے بھاگ نکلتا ہے کیونکہ اس کے خیالات اس کے سرپرست کے خیالات سے میل نہیں کھاتے۔

بمشکل تمام اس نے خود پر قابو پایا۔ موسیٰ بھی اس کے بدلتی رنگت دیکھ کر سنبھل چکا تھا۔

''میرے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ بس میں اپنی کمیونٹی کو سپورٹ کرتا ہوں۔''

اب کی بار اسفر نے خاموشی توڑنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ تنگ آ چکا تھا ہر کسی کے آگے مصلحتاً خاموش ہوتے ہوئے، اس آزاد فضا میں سانس لینے اور اپنی آزادانہ رائے کے اظہار کا حق اس کو بھی اتنا ہی میسر تھا جتنا کسی بھی اور کو۔

''مذہب کے نام پر اس دنیا میں جتنی قتل و غارت گری ہوئی ہے شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔''

اسفر کی گھمبیر آواز سے موسیٰ بھی ایک دم ٹھٹک گیا۔

''سب انسان ہیں اگر ہر شخص یہ سمجھ لے تو دنیا سے حسین ترین جگہ کوئی نہ ہو۔ یہ دنیا ایک اٹل حقیقت ہے اور موت اس کا اختتام۔ تم لوگوں کو جو میسر ہے اس پر قانع ہونے کے بجائے جو دنیا صرف تمہارے خوابوں اور خیالوں میں ہے یا شاید صرف کہانیوں میں اس کے پیچھے اس طرح بھاگ رہے ہو کہ کسی کی جان و مال کی حیثیت ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں رہی تمہاری نظر میں۔ تم تو ڈاکٹر بن رہے ہو، مسیحا ہو، تم کیسے یہ سب برداشت کر سکتے ہو کہ نہتے لوگوں پر بم برسا کر اپنی جیت کا جشن مناؤ۔ ہسپتالوں پر بمباری کرتے ہو تاکہ سسکنے والے جو دو گھڑی سانس لے سکتے تھے وہ بھی نہ لے سکیں۔ یہ کیسا دین ہے تمہارا جو انسانیت کے منافی ہے۔ میں ہر اس دین پر لعنت بھیجتا ہوں جہاں زمین کا ٹکڑا کسی کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔''

اسفر کی گھن گرج کی موسیٰ کو ایک فیصد بھی اُمید نہ تھی۔ وہ ششدر بیٹھا اسفر کی چنگھاڑ سُنتا رہا۔ اسفر دھاڑ سے دروازہ بند کر کے باہر جا چکا تھا اور موسیٰ لاجواب بیٹھا تھا۔ اس نے بستر پر پڑے اپنے آئی ڈی کارڈ کو دیکھا۔ ڈاکٹر کا لفظ اُسے حقیقتاً گالی لگا تھا۔ جس کوڈ آف کنڈکٹ کا حلف اس نے لیا تھا اسے اندازہ ہوا وہ اس وقت اس کے لیے گالی بن گیا تھا۔

...۞...

''ہائے!'' زینیا زور و شور سے ہاتھ ہلاتی کافی شاپ میں داخل ہوئی۔ اس نے گلابی

اسکرٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ جو اس کے جسم کا ہر عضو نمایاں کر رہا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے، سنہرے بالوں میں جا بجا رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی تتلیاں اور ہاتھوں میں بریسلٹ پہنے وہ چلتی پھرتی زندگی کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی۔

ایک لمحے کو اسفر اپنے لیے اس گرم جوشی کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ ''کاش طوبیٰ یہ دیکھ سکتی کہ اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکی اس کے ساتھ کس التفات کا مظاہرہ کر رہی تھی۔'' ایک بے تکی سوچ پر اسے خود بھی کوفت ہوئی اور اس نے سر جھٹک کر بھٹکی سوچ پر قابو پایا۔

''ہائے۔'' اسفر نے جینز کی جیبوں میں ہاتھ اُڑس لیے اور حتی الامکان اپنے شانوں کو سمیٹ کر نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ ایک خوبصورت احساس اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔ کافی شاپ میں وہ دونوں بیٹھ کر تقریباً آدھا گھنٹہ ایک دوسرے سے بات کرتے رہے۔ زینیا بہت باتونی تھی اور اسفر سے کچھ پوچھنے کے بعد پورا جواب سنے بغیر ہی دوسری باتوں میں مگن ہو جاتی۔ اسفر کو لگا بہت دنوں کے بعد وہ کسی سرسبز گلشن میں کھڑا ہے جہاں ہر سو پھول اور بنفشی تتلیاں اُڑتی پھر رہی تھیں۔ جاتے وقت زینیا نے اسفر کے گال پر بوسہ دیا اور جلد ملنے کا کہہ کر ہاتھ لہراتی ہوا کے جھونکے کی طرح چلی گئی۔

اپنے ہوش و حواس میں اسفر نے پہلی مرتبہ کسی کے گلابی ہونٹوں کا لمس اپنے گال پر محسوس کیا تھا۔ زینیا کی اتنی بے باکی پر وہ فریفتہ ہوا جا رہا تھا۔ جذبات کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر نے اس کے پیٹ میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب کافی شاپ میں کام کرنے والے لڑکے نے اپنی شرارتی مسکراہٹ کو دبائے ہوئے ''ہیو آ گڈ ڈے سر!'' کا الوداعی پیغام دیا۔

اسفر موجودہ دنیا میں واپس آیا اور گڑبڑاتے ہوتے ہوئے سرعت سے باہر کی راہ لی۔ انتہائی خنک فضا اسے ایسی خوشگوار معلوم ہوئی گویا باد صبا نے اس کا استقبال کیا ہو۔ وہ دن اس کی زندگی کے خوبصورت ترین دنوں میں سے ایک تھا۔

تین مہینوں میں کئی مزید ملاقاتوں کے بعد زینیا نے اس کی رہائش گاہ دیکھنے کی فرمائش کی جو اسفر نے

کچھ تامل کے بعد منظور کر لی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کسی کی رہائش گاہ پر آنے کا کیا مطلب تھا۔ ہر طرح کی آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو کچھ اصولوں پر کاربند رکھنا چاہتا تھا تا کہ زندگی کا حسن اور توازن دونوں برقرار رہے۔

اسفر زینیا کے ساتھ کافی دیر مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ جب رات گئے وہ اپنے کمرے میں پہنچے گا تو لکاس وہاں موجود ہوگا۔ موئی کی رات کی ڈیوٹی کا اس کو بخوبی علم تھا لیکن لکاس ہفتے میں چار راتیں اپنے کمرے ہی میں گزارتا تھا اور بقایا وقت وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی تعلیم اور مستقبل لے کر کو بہت محتاط تھا اور ساتھ ہی رشتوں اور کام کے درمیان اچھا توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔

شومئی قسمت جب اسفر اور زینیا اسفر کی رہائش گاہ پر پہنچے تو لکاس وہاں موجود نہ تھا۔ غالباً کچھ اوقات میں تغیر ہوا تھا اور یقیناً اسفر کو اپنے اوقات کار کے بارے میں آگاہ کرنا لکاس کے لیے خاصہ غیر ضروری تھا۔

''چھوٹی جگہ ہے، لیکن کم از کم صاف ستھری ہے۔'' زینیا نے بغور کمرے کا جائزہ لیا۔

اسفر نے مسکرا کر اس کی تعریف کو قبول کیا۔

''میرا ایک روم میٹ ڈاکٹر ہے وہ چیزوں کی ترتیب اور صفائی ستھرائی کے بارے میں خاصا متفکر رہتا ہے۔''

''لیکن تم نے تو بتایا تھا وہ بہت کم کمرہ استعمال کرتا ہے۔''

زینیا کمرے کے وسط میں پہنچ کر یک دم پلٹی اور اپنی چمکدار سبز آنکھیں اسفر کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

''ہاں! کم ہی ہوتا ہے۔ میں اور لکاس بھی کمرہ صاف ہی رکھتے ہیں، ہم میں سے کوئی بھی ترتیبی کو پسند نہیں کرتا۔'' اسفر نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرے کی واحد کرسی زینیا کو پیش کی۔

''میری جان! اچھے کاموں کا کریڈٹ لینے میں کبھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' زینیا نے کچھ ادا سے کہا

اور اسفر کی ناک کو انگلی سے چھوتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

اسفر مسرت سے بستر پر براجمان ہو گیا۔ زینیا کی نظریں اب بھی اسفر پر جمی ہوئی تھیں جس سے اسفر اب کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک انجانا خوشی کا احساس بھی تھا۔ چاہے جانے کا احساس کس قدر خوبصورت تھا۔

''اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔'' زینیا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بتاؤں۔''

''یہی کہ تمہارے والدین، تمہارا گھر، بہن بھائی۔''

اسفر کو زینیا سے اس بات کی قطعی توقع نہ تھی۔ وہ ایک کھلنڈری لڑکی تھی۔ اس کی گفتگو کا مرکز زیادہ تر اس کی اپنی ذات، پسند ناپسند اور اس ریستوران میں ساتھ کام کرنے والے ہوتے تھے۔ کبھی وہ ان کا مذاق اڑاتی تو کبھی کسی کے فن کی تعریف کر دیا کرتی تھی۔ اُسے میک اپ اور جیولری کا شوق تھا اور ساتھ میں ونڈو شاپنگ کا بھی۔ ان کی بیشتر ملاقاتیں مال کے کسی کیفے ٹیریا میں ہوتی تھیں جہاں وہ پہلے جی بھر کر پورا مال گھومتے اور پھر کیفے ٹیریا میں کچھ پیٹ پوجا ہوتی۔

اسفر کو حیران دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی ''چلو پہلے میں بتاتی ہوں'' یہ کہتے ہوئے وہ کرسی کھینچ کر اسفر کے بستر کے مزید قریب ہو گئی۔ اتنی قریب کہ اسفر کو اس کے بدن کی مہک مسحور کرنے لگی۔

ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے اس نے کہا ''میرے دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں، ابو ہمیں بہت پہلے ہی چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے یعنی لا پتہ ہو گئے تھے۔ میری امی ایک اسٹور پر کیشئر کی جاب کرتی ہیں ایک بھائی امی کے ساتھ رہتا ہے اور ایک بھائی نے اپنی الگ دنیا بسائی ہے۔ میں بھی اپنے دوسرے بھائی اور ابو کی طرح ہی ہوں۔ مجھے لگا بندھا روٹین پسند نہیں۔ جو کرتی ہوں اپنی مرضی سے کرتی ہوں، میری امی اور بہن کافی مذہبی ہیں۔ ہم کیتھولک ہیں تو مذہب کی کافی پابندیاں تھیں اسی لیے میں نے الگ رہنا مناسب سمجھا۔ لیکن اب میں بھی اپنی زندگی میں سنجیدہ ہونا چاہتی ہوں۔'' اس کے معنی خیز انداز میں کہے گئے جملے پر اسفر چونک گیا۔

زینیا اسفر کے چوکنا ہونے پر کافی محظوظ ہوئی۔ ''میرے دو بوائے فرینڈ رہ چکے ہیں اور ماضی میں کبھی کبھی جب پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی تو میں کرائے کی گرل فرینڈ بھی بن جاتی تھی لیکن ایسا چند ایک بار ہی ہوا ہے۔''

اسفر زینیا کے اس قدر صاف گو ہونے پر کچھ متذبذب ہوا۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر زینیا خاموش ہوگئی۔ ایک عجیب سی خاموشی کمرے میں رینگ گئی۔ کچھ دیر بعد اسفر نے پہلو بدلا: ''تمہاری صاف گوئی پر میں حیران ہوں۔'' بالآخر اسفر نے گلا کھنگار کر ٹوٹی ہوئی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

زینیا اٹھ کر کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ آج قدرے مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ عام طور پر اس کا انداز بڑا شوخ و چنچل ہوا کرتا تھا لیکن اس لمحے وہ کافی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

وہ پلٹی اور پر اعتماد انداز میں چلتی ہوئی اسفر کے پاس آئی۔ بستر پر بیٹھنے کے بعد اس نے اسفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسفر نے ہاتھ چھڑانے کی قطعی کوشش نہ کی۔ برسوں سے وہ اس التفات کے لیے ترس رہا تھا اور جس شخص کی توجہ کی اسے حسرت تھی اُسے نہ جانے اسفر یاد بھی ہوگا کہ نہیں، اس کا بھی اسفر کو کوئی اندازہ نہ تھا۔

''تم مجھے اچھے لگے ہو اسفر!'' اس دفعہ زینیا کا لہجہ کافی غیر متوقع تھا۔ مجھے لگتا ہے ہمیں لونگ ریلیشن شپ کا تجربہ کرنا چاہیے۔ تمہارے ساتھ گزارا ہوا وقت مجھے خوشی اور تحفظ دیتا ہے۔'' وہ دھیمے دھیمے بولتی رہی۔

''میں نے ہمیشہ مسلمان مردوں کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنی عورتوں کو بہت عزت دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو سراسر الٹ تھے۔ لیکن تمہارا انداز اور موجودگی میرے لیے راحت کا سبب ہوتا ہے۔''

زینیا نے اسفر کے دہکتے ہاتھوں کو اپنے دل سے لگا لیا۔ اور اسفر کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''کیا تم اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

اسفر کے کافی لمحہ سُن بیٹھے رہنے کے بعد بالآخر زینیا نے اپنے ٹھوڑی کو اس کے شانے پر رکھ کر پوچھا۔
اس کی سبز آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اسفر کا دل کیا زینیا کو اپنی بانہوں میں بھر لے۔
بنفشی رنگ اس کے دل و دماغ میں پھوٹ رہے تھے۔ اس کا چہرہ مسرت اور فخر سے تمتما رہا تھا۔ گویا
وہ کسی کے لیے اہم تھا۔ بہت ہی اہم۔
اُس نے اپنا بازو زینیا کے گرد حمائل کیا۔ ایک نرم اور گداز احساس اس کے پورے سراپے میں
سرائیت کر گیا۔
زینیا اس کی بانہوں میں سکینت سے کسمسائی اور اور پھر استفسار کیا''اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔تمہارا
خاندان، کوئی گرل فرینڈ؟''
اسفر ہنس پڑا''نہیں گرل فرینڈ تو کوئی نہیں، ہاں لیکن میرے والدین اور ایک بھائی اور دو بہنیں سب
پاکستان میں رہتے ہیں۔''
زینیا کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ اسفر اپنی بات کو جاری رکھے گا۔ سوالیہ نگاہوں کے جواب میں بالآخر
اسفر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری"لیکن وہ لوگ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔ اسی لیے میں یہاں آ گیا
کہ اپنی پڑھائی مکمل کر کے اپنا کیریئر بناؤں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کروں۔
زینیا کی سبز آنکھوں کے سمندر میں حیرانی کا طوفان اُمڈ آیا۔
بھلا اسفر میں ایسا بھی کچھ تھا جو کسی کو ناپسند تھا۔
''کیوں!!''تم تو اتنے اچھے اور مکمل انسان ہو، کوئی بھی تمہیں کیسے ناپسند کر سکتا ہے؟"
اسفر نے ایک لمبی سانس لی''میں نے ان کا مذہب چھوڑ دیا تھا۔''
''کیا واقعی؟'' زینیا کو سچ مچ کا دھچکا لگا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اسفر کو
دلاسہ دینے کے لیے ایک بار پھر اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔
اسفر نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس محبت اور فکر کی بارش میں پوری طرح بھیگ جانا چاہتا تھا۔ وہ شخص
جسے بچپن سے محبت کی عادت ہو اور سب کچھ اس سے یک دم چھن جائے، وہ بن پانی کی مچھلی کی

طرح تڑپتا ہے اور اسفر تو یہ عذاب پچھلے دو سالوں سے بھگت رہا تھا۔

''میری زندگی میں آنے کا شکریہ۔'' اسفر نے نرمی سے زینیا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ زینیا خوش دلی سے مسکرا دی۔ پھر اچانک سیدھی ہو کر بولی

''ویسے تو میں کیتھولک ہوں اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ میں منتقل ہوتی جا رہی ہوں، لیکن تمہاری بات اور ہے۔ اگر تم کیتھولک نہیں بھی ہو تو چلے گا۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

اور پھر آگے سے دوسرا سوال داغا ''تم اب کون سے مذہب کی تقلید کرتے ہو؟''

اسفر نے مسکرا کر دیکھا ''کسی بھی مذہب کی نہیں''

اُسے پورا یقین تھا کہ جس طرح اسفر نے زینیا کے داغدار ماضی کو قبول کیا تھا زینیا اس کے خیالات کی بھی بھرپور پذیرائی کرے گی۔

''کیا مطلب؟'' زینیا نے ایک بار پھر چونکتے ہوئے کہا۔

''میں ایک ملحد ہوں۔'' اسفر نے مسکراتے ہوئے زینیا کی آنکھوں میں دیکھا لیکن وہاں نظارہ اس کے لیے قطعاً حوصلہ افزا نہ تھا۔ روشنی کے سبز جگنو یکدم ہی مدھم ہو گئے تھے۔ فضا میں ایک گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ اسفر کے دل کو سہلاتا ہاتھ یک دم ساکت ہو گیا تھا۔ زینیا جو اب تک اسفر سے جڑی بیٹھی تھی اس نے بڑی آہستگی سے اپنے آپ کو اسفر سے الگ کر لیا۔

اسفر وحشت زدہ ہو گیا۔ اسے لگا ایک بار پھر ریت اس کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گرنے لگی ہے۔ ساتھ ساتھ ایک لاوا بھی اس کے اندر ابھرنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ جذبات کی شدت سے اسے اپنی کنپٹیوں میں گرماہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس نے بستر کی چادر کو مٹھیوں میں جکڑ کر اپنے آپ پر قابو پانے کے بھرپور کوشش کی۔

زینیا الگ ہوتی ہوئی بالآخر کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اسفر سے گھِن آ رہی ہو۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کر دونوں ہاتھ لپیٹے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ چہرے کی ملاحت گھمبیرتا میں بدل چکی تھی۔ ایک لمحے میں وہ ہلکی آنچ پر سنکتے ہوئے جذبات سرد پڑ گئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' اسفر کو اپنے لہجے کی ناگواری پر خود بھی یقین نہ آیا۔ یہ اس کا انداز تخاطب بالکل نہ تھا۔ اس کی حالت ایک باؤلے انسان جیسی ہو رہی تھی جس کو اس کی من چاہی چیز مل جائے تو وہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کتنے سالوں بعد آخرکار وہ زندگی میں طوبیٰ کو بھول کر بالآخر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا لیکن اچانک اسے پتا چلا تھا کہ جس کشتی کی آس میں وہ سمندر میں اترا تھا اس کا ناخدا پرایا تھا اور اس سے اجتناب برت رہا تھا۔

زینیا نے اسفر کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹوں پر خاطر خواہ جنبش نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی سبز آنکھیں ایک بیزاری لیے ہوئے دکھائی دے رہی تھیں۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اسفر کو ایسا لگا جیسے زینیا کو سانس لینے میں دقّت ہو رہی ہو۔ اسفر کو زینیا کی حالت پر تشویش ہونے لگی۔ اس نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا کہ زینیا کو سانس لینا ہی محال ہونے لگے۔ داغدار ماضی تو خود زینیا کا تھا جسے اسفر نے کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی لیا تھا الٹا وہ کیوں اسفر کے سچ پر وحشت زدہ ہو رہی تھی۔ اسفر یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

زینیا نے اپنی جیکٹ آہستگی سے اٹھائی اور خاموشی سے پہننے لگی۔ اسفر اسے بغور دیکھتا رہا۔

اُسے اپنے اوپر بھی غصہ آنے لگا۔ خوامخواہ یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو گھرک رہا تھا۔

''میں حقیقت جانتا ہوں اور بوسیدہ عقائد کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔''

''اب مجھے چلنا چاہیے۔'' زینیا نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اسفر کو ایک دھچکا لگا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اتنے وقت بعد جب اس سے لگا تھا کہ آخرکار سکون کی پھوار اس پر برسنے ہی والی ہے۔ اسے لگا زینیا وہ تمام راحت اپنے ساتھ سمیٹ کر جانے لگی ہے۔

''کہاں؟'' اسفر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

زینیا کی آنکھوں میں حیرانی اُمڈ آئی۔ اسے اسفر سے اس بات کی توقع نہ تھی۔ اسفر کو اس کی نگاہوں سے شدید الجھن محسوس ہوئی۔

''تم نے مجھے اپنے بوائے فرینڈ اور اخلاق سے گرے ہوئے کام کے بارے میں بتایا لیکن میں نے سب باتوں کو نظر انداز کر کے صرف تمہارے ساتھ کی اہمیت کو مان لیا اور تم مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہی ہو جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو۔'' اسفر کے منہ سے بمشکل تمام الفاظ ادا ہوئے۔

زینیا کو لگا وہ ایک انجان شخص کے کمرے میں کھڑی ہے جو دیوانہ ہو چکا ہے۔ جنون اس کی آنکھوں سے آگ کی لپیٹوں کی طرح لپک رہا تھا۔ وہ جھجک کر ایک قدم پیچھے ہو گئی۔

''اسفر! اس بارے میں ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں۔ ابھی مجھے ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔''

اسفر کو اس کی بہانے بازی پر کچھ اور غصہ آیا۔ طیش کے عالم میں اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''میرا سچ کیوں نہیں ہضم ہوا تمہیں۔ ہاں؟ بڑی کیتھولک بنی پھرتی ہو۔ غیر مردوں کے ساتھ سونے پر تمھارے عقیدے پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ میں بھی تو ایک مرد ہی ہوں تمہارا من پسند مرد، پھر آخر کیا مسئلہ ہے کہ تمہاری دلچسپی مجھ میں اِک دم ختم ہو گئی ہے۔'' اسفر کا لہجہ تلخ سے تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے عرصے سے نفرتوں اور تنہائی کا جو زہر وہ اپنے اندر اتارتا رہا تھا وہ ابل کر پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔

''میرے مذہب کو بیچ میں مت لاؤ۔ میں جیسی ہوں، جتنی مرضی مذہبی ہوں صرف خدا کے لیے ہوں۔ سب کچھ ہو سکتی ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہو سکتی۔ تم ایک احسان فراموش ہو جس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

اسفر یک ٹک اُسے دیکھے گیا ''احسان فراموش اور میں؟'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''ہاں تم!'' جس خدا کی زمین پر عیاشی کر رہے ہو اسی خدا کے منکر ہو گئے ہو۔ جب تم اپنے بنانے والے کے نہ ہوئے تو میرے کیا ہو گے؟''

زینیا نے غصے سے اسفر کو جھڑکا ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ تم کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو، بس کسی بھی خدا پر یقین رکھتے ہو یہی میرے لیے کافی تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے قلاش ہو جس کا کوئی عقیدہ تک نہیں۔ جو دیکھتا ہے بس اس ہی پر یقین کر لیتا ہے۔ میں جو بھی ہوں مجھے فخر ہے ایک خدا کی تخلیق ہوں۔ میں جو کروں اس کے لیے یسوع پہلے ہی قربانی دے چکے

ہیں۔کوتاہ صحیح لیکن ظالم نہیں ہوں۔''

اسفر کے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔جس کو وہ اپنی حیات سونپنے چلا تھا وہ اسے بے عقل، احسان فراموش اور ایک قلاش کہہ رہی تھی۔

''بے عقل تو تم لوگ ہو جو احمقوں کی جنت میں رہتے ہو۔سائنس ہر بات کا جواب دیتی ہے۔مذہب صرف اندھیرے میں کھڑا رکھتا ہے۔محکوم بنا کر رکھتا ہے۔آنکھیں کھول کر دیکھو تو حقیقت تمہیں بھی نظر آ جائے گی۔''

اسفر نے زینیا کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر ہذیانی کیفیت میں جھنجھوڑ ڈالا۔

''چھوڑو مجھے۔'' زینیا نے اس کے ہاتھ جھٹک کر ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کیا۔اسفر کو اپنے گال پر چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔زینیا دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تب ہی اسفر نے اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔زینیا ایک جھٹکے سے دیوار سے جا کر ٹکرائی اور ایک گالی اس کے منہ سے اسفر کے لیے برآمد ہوئی۔

نہ جانے اسفر کو اپنے آپ کو کم عقل کا طعنہ ملنے پر کف تھا یا بے دردی سے عین پھولوں کی بیج پر ٹھکرائے جانے پر اُس نے ایک زوردار تھپڑ زینیا کو دے مارا۔

اشتعال بھرے مردانہ ہاتھ کی تاب نہ لائے ہوئے، زینیا منہ کے بل فرش پر گر گئی۔

''واٹ دا ہیل مین!!!'' لکاس کی غصے بھری آواز نے اسفر کو ایک جگہ جامد کر دیا۔

لمحوں میں لکاس پولیس کو فون ملا چکا تھا۔باوجود لاکھ صفائیاں دینے کے لکاس نے اس کی کسی بات پر یقین کیا اور نہ ہی پولیس کے آنے تک اسے کمرے سے باہر جانے دیا۔اِک سیاہ باب کا آغاز ہو گیا تھا۔

...۞...

آج ہماری اس اہم میٹنگ میں کافی نیا ٹیلنٹ ہمارے درمیان موجود ہے، جو اس آفس کی تاریخ میں پہلی بار ہو رہا ہے۔'' رستم نے جو کہ ذوالقرنین انٹر پرائز کے ایک بہت پرانے اور وفادر ایمپلائی

تھے، میٹنگ میں ابتدائی کلمات کہے۔فرحان نے ان کی تائید کی''تو دیکھتے ہیں یہ جونیئرز کیا لائحہ عمل پیش کرتے ہیں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ملک کے کافی حصوں میں مختلف وجوہات کی بنا پر ہماری اشیا کی فروخت بتدریج کم ہورہی ہے۔''

فرحان نے بڑی دلچسپی سے میز کے دائیں جانب بیٹھی اس ٹیم سے پوچھا جس کو کچھ عرصے پہلے اسی خاص مقصد کے لیے ہائیر کیا گیا تھا۔پچھلے کچھ عرصے میں اُن کی چھان پھٹک کی جا چکی تھی اور اُن کئی افراد میں سے بھی اب صرف پانچ افراد اس میٹنگ میں موجود تھے جن میں سنعیہ اور طوبیٰ سرفہرست تھیں۔

''سر! اپنی ٹارگٹ آڈینس سمجھنا پہلا اصول ہے۔'' سلمان جوان پانچوں میں سے ایک تھا فرحان کے اشارہ کرنے پر اس نے گفتگو کا آغاز کیا''اس کے لیے ہمیں پہلے سروے کرنا ہوگا تا کہ جان سکیں کہ صارفین کے درمیان ہماری پراڈکٹ کی گرتی ہوئی ساکھ کی کیا وجہ ہے۔''

فرحان نے اثبات میں سر ہلاتی ہوئی سلمان کے برابر بیٹھی سنعیہ کو بولنے کا عندیہ دیا۔

''سر! میں نے اس پر کچھ ہوم ورک کیا ہے۔'' حسب معمول پُر اعتماد انداز میں ایک خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ سنعیہ نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر کچھ تلاش کیا اور بڑی ہی روانی سے قریب ہی کیے گئے سروے کے اعداد وشمار اور ممکنہ وجوہات کی نشاندہی کرنے لگی۔

ہال میں موجود تمام ہی افراد سنعیہ کی مستعدی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔فرحان کی آنکھوں میں بھی سنعیہ کے لیے ستائش نظر آئی۔

''بہت خوب مِس سنعیہ! دیکھتے ہیں باقی لوگوں کی کیا رائے ہے اس بارے میں۔''

یکے بعد دیگرے فرحان سب کو موقع دیتا گیا اور اب تک جتنی معلومات تمام انٹرنیز کو بہم تھیں ان کے مطابق سب اپنے ممکنہ حل پیش کرتے گئے۔

''جی مِس طوبیٰ! میرے حساب سے تو سارے ہی ممکنہ آئیڈیاز شیئر کیا کیے جا چکے ہیں لیکن پھر بھی اگر آپ کچھ کہنا چاہیں۔'' فرحان نے شائستگی سے طوبیٰ کو مخاطب کیا۔

''سر! مجھے لگتا ہے ہمیں Sustaniable practices کی طرف توجہ دینی چاہیے۔''

طوبیٰ کی بات پر فرحان کے لیپ ٹاپ بند کرتے ہاتھ رک گئے۔ وہ کافی اہم نکات نوٹ کرتا جا رہا تھا اور اس ٹیم کی طرف سے جن نکات کی اُمید اُسے تھی وہ اسے مل چکے تھے۔

''اپنی بات کی وضاحت کیجئے۔'' رستم نے طوبیٰ کی بات میں دلچسپی ظاہر کی۔

''سر! ہمارا بہت بڑا کسٹمر یوتھ ہے اور یہ نوجوان نسل اس تباہ ہوتے ماحول اور بگڑتی قدروں کو لے کر بہرحال حساس ہے۔ ہر حلقے میں اس یوتھ کو ثانوی کردار گردانا جاتا ہے، ان کی باتوں کو کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ ہمیشہ پہلے زمانے کو صحیح اور نئے زمانے کو بگڑا ہوا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ہمیں اس جنریشن کی آواز ایسے بننا چاہیے کہ بزرگوں کی دل آزاری بھی نہ ہو اور ہم ماحولیاتی آلودگی کو روکنے کی مہم میں بھی حصہ دار نظر آئیں۔

ہم اپنی پیکنگ میں پلاسٹک کو ممنوع کر دیں اور گارمنٹس ڈیپارٹمنٹس کے waste کو پیکنگ کے لیے استعمال کریں۔ یوتھ پر اعتماد کو پروموٹ کریں اور ماحول دوست نعروں کے نئے انداز پر کام کریں۔''

فرحان نے طوبیٰ کی بات کو بغور سننے کے بعد مزید اہم نکات نوٹ کئے اور ستائشی نظروں سے طوبیٰ کو دیکھا۔

''آپ کے آئیڈیاز کافی تخلیقی ہیں۔ اس پر کام کیا جا سکتا ہے۔'' مسکراتے ہوئے اُس نے موٹے فریم کے چشمے اتارے اور میٹنگ کے برخاست ہونے کا عندیہ دیا۔

طوبیٰ کی ترقی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ جو کچھ اس نے خدا سے مانگا تھا اسے جلد ملنے والا تھا۔

.....۞.....

اسفر کے اس زوردار تھپڑ کی گونج اُسے خود ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ اُس کی یادداشت میں ایسی کوئی بات محفوظ نہ تھی جب اس نے حق پر ہونے کے باوجود کسی انسان تو کیا جانور

پر بھی ہاتھ اٹھایا ہو۔ ہتھکڑی کے یخ دھاتی لمس کے احساس کے ساتھ ہی ایک خوف اور بے یقینی نے اسے گھیر لیا تھا۔ ٹھنڈی دھات کی کڑی اس کے اشتعال کے بالکل برعکس تھی۔ جب ایک لحیم شحیم افسر نے اُس کے بازوؤں کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہوئے اسے آگے کی طرف دھکا دیا تو نہ صرف کندھے میں شدید درد اُٹھا بلکہ عزّتِ نفس پر بھی کاری ضرب پڑی۔

''تم کو ایک لڑکی پر حملے کے الزام میں حراست میں لیا گیا ہے۔'' آواز مستحکم اور جذبات سے عاری تھی۔ اسفر کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا'' اس دوران اسفر کی سوکھی زبان سے پہلی دفعہ الفاظ ادا ہوئے۔ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

''زینیا! زینیا ان کو بتاؤ وہ بس غصے میں میرا ہاتھ اُٹھ گیا، میں کچھ غلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

ایک اور کانسٹیبل اسے زینیا کے ساتھ اکڑوں بیٹھا نظر آیا۔ زینیا جرمن زبان میں رو رو کر غالباً ان تفصیلات سے بھی آگاہ کر رہی تھیں جو وقوع پذیر ہی نہ ہوئی تھیں۔

پولیس اسٹیشن پہنچے پر اسفر کو وہ پولیس اسٹیشن کم اور ایک شاندار آفس زیادہ لگا۔ گو کہ اس کڑے وقت میں پاکستان کے کسی پولیس اسٹیشن سے ویانا کے پولیس اسٹیشن کا موازنہ کرنا مضحکہ خیز تھا لیکن پھر بھی خالی الذہنی کی حالت میں دماغ کا ہر دریچہ کھل رہا تھا اور بے سروپا خیالات پاؤں پسار کر بیٹھتے جا رہے تھے۔ افسر کی پوچھ تاچھ اسے خاصی دھمکی آمیز محسوس ہوئی۔ اس وقت اسفر کو شدت سے احساس ہوا کہ اس کے پاؤں کے نیچے نہ زمین ہے نہ سر پر آسمان۔ زمین تو وہ اپنی مرضی سے چھوڑ آیا تھا اور آسمان اس کے سر سے چھننے ہی والا تھا۔

جب اس کی ذاتی چیزیں اکٹھی کی جانے لگیں تو اسے اپنا آپ بالکل ایک فلم کے کردار کی مانند لگا جو شاید اپنے لڑکپن میں اس نے دیکھی ہوں گی۔ انگلیوں کے نشانات سے لے کر اس کی تصویر اتارنے تک سب کچھ اعصاب شکن تھا۔ جو واحد آواز وہ اب سن سکتا تھا وہ قلم کی نوک کی کاغذ کو دینے والی رگڑ تھی۔ اعصاب شکن انتظار کے بعد جب آخر کار اس کو کچھ بولنے کی اجازت ملی تو بدحواسی میں بھی

روانی سے جرمن اپنی زبان سے اسے نا قابلِ یقین لگی۔ سچ ہے انسان اپنے آپ کو بہت ارزاں سمجھتا ہے۔

اسفر کا دماغ پوری طرح ٹھکانے پر آچکا تھا۔ آسٹریا کے قانون کی مستعدی پر اگر اسے کوئی شک تھا تو وہ کب کا رفع ہو چکا تھا۔ ایک تھپڑ کی سزا بھی اس کو بھگتنی تھی جبکہ اس کی گواہی زینیا کے سوجے ہوئے منہ کی صورت میں موجود تھی اور ایک عدد چشم دید گواہ بھی۔ اور حسن اتفاق زینیا کے خلاف اس کے پاس نہ کوئی دلیل تھی، نہ ثبوت اور نہ ہی گواہ۔ بے بسی کا صحیح مطلب تو اسے آج سمجھ آیا تھا۔ جب نہ ہی کوئی اُس کا موقف سننے کو تیار تھا اور نہ ہی اسے کسی شک کا فائدہ ملنے والا تھا۔

"ایسی صورتحال میں عموماً لوگ دعا کرتے ہیں لیکن میں کیا کروں؟" ایک زہر خند سوچ نے دماغ پر حملہ کیا تھا۔ اب پتہ نہیں یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی یا جذبات کا اُبال ذہن سوچنے سمجھنے سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔ بڑے ہی پروفیشنل انداز میں اس کو اس کے قانونی حق کے بارے میں بتایا گیا، سنگین صورتحال، ممکنہ مجرمانہ ریکارڈ، اس کی اُمیدوں پر ممکنہ سوالات اور پھر قانونی اثرات نے ذہن وجسم کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اسفر کو لگا اُس کے جسم پر ہزاروں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں اور وہ ایک بھی اُنگلی ہلانے سے قاصر ہے۔

اس کے پاس واپسی کی کشتی تو تھی لیکن بدبختی یہ تھی کہ کوئی کنارہ نہ تھا جہاں جا کے وہ پڑاؤ ڈال لیتا۔

کچھ وقت عارضی سیل میں بیٹھا تو گزرے ہوئے واقعات ایک کے بعد ایک پردہ یادداشت پر چمکنے لگے۔ زینیا کے الفاظ ہتھوڑے کی طرف اس کے دماغ پر برس رہے تھے۔

''تم تو اتنے قلّاش ہو کے تمہارے پاس اپنا خدا بھی نہیں۔''

الفاظ تھے کہ خنجر جس نے اس کے زخمی دل کے چیتھڑے اڑا دیے تھے۔ اسفر کو اپنے گالوں پر پانی بہنے کا احساس ہوا تو بے دردی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ درد سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

...۞...

حسبِ معمول ذوالقرنین انٹر پرائز کے ہیڈ آفس میں ہلچل تھی۔ نئے ریسرچ پراجیکٹ پر تیزی سے

کام ہو رہا تھا۔

"میں نے سُنا ہے باس کسی کو دوسرے شہروں میں سروے کے لئے بھیج رہے ہیں۔" علی جو کہ مارکیٹنگ ایگزیکٹو تھا، کافی کا مگ پکڑے کافی مشین کے پاس ہی کھڑا تھا۔

"ہاں، تین لوگوں کی ٹیم جا رہی ہے۔" راحیل جو کہ گرافک ڈیزائنر تھا۔ اپنے کپ میں چائے انڈیل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اِس نئی اسٹراٹجی پر گفتگو کا حصّہ بھی بن گیا تھا۔ "لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ لیڈ کون کر رہا ہے۔"

سلمان جو کہ میٹنگ میں موجود تھا، فوراً ہی بول پڑا۔ "یقیناً طوبیٰ ہوگی۔ سر فرحان کو اُس کے آئیڈیاز سب سے زیادہ پسند آئے ہیں۔"

پاس سے گزرتی سنعیہ طوبیٰ کا نام سُن کر ٹھٹک کر رُک گی۔

"مجھے نہیں لگتا یہ مناسب ہے۔" پاس کھڑے سب ہی لوگوں نے اُس کے لہجے کی ناگواری کو محسوس کیا اور وہ بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ "ضروری نہیں ہر مرتبہ طوبیٰ کو خاص ٹریٹمنٹ مِلے۔"

"کیا کہہ رہی ہو سنعیہ؟" علی نے موڈ کو ہلکا پھلکا کرنے کی نیت سے پوچھا۔ "تم کو نہیں لگتا واقعی طوبیٰ کو اِس ٹیم کو لیڈ کرنا چاہیے۔ وہ اپنے کام میں ماہر ہے اور پروفیشنل بھی۔"

سنعیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا، "اوہ پلیز، سب ہی اِس کمپنی میں اپنے اپنے کام میں ماہر ہیں۔ اور طوبیٰ، وہ تو ہمیشہ ہی سر فرحان کے سامنے اپنے خیالات اِس انداز میں پیش کرتی ہے جیسے وہ کوئی genious ہو۔" سنعیہ نے سر جھٹک کر اپنے کاندھوں تک آئے بالوں کو پیچھے کیا۔ "سب سیاست ہے، میرٹ کوئی نہیں ہے۔"

راحیل کے چہرے حیرانی کے باوجود مسکراہٹ رینگ گئی۔ جبکہ سلمان سنعیہ کی بات سے خائف ہوا۔

"ایسا نہیں ہے سنعیہ، ہم سب ہی یہاں میرٹ پر آئے ہیں، طوبیٰ ایک ذہین لڑکی ہے، اُس کے آئیڈیاز واقعی اچھوتے تھے۔ یقیناً سر فرحان کو بھی ٹیلنٹ کی پہچان ہوگی، وہ ایک زیرک نظر آدمی ہیں۔"

ثانیہ نے لمحے بھر کو سلمان کو دیکھا اور پھر آنکھیں گھماتے ہوئے وہ بھی اپنے لیے کافی بنانے لگی۔

"تم ایسی لڑکیوں کو نہیں جانتے سلمان جو یہ دکھاوا کرتی ہیں کہ وہ بہت باحیا اور شریف ہیں حقیقتاً اُن کو پتا ہوتا ہے کسکو کب اور کہاں کتنی جگہ دینی ہے تاکہ وہ اپنے اہداف مکمل کرسکیں۔ اور کوئی اُن پر شک بھی نہ کرے۔"

"چلو دیکھتے ہیں، باس ٹیم لِیڈ کے لیے کس کا انتخاب کرتے ہیں۔" سلمان نے کندھے اچکائے۔ "کم سے کم طوبیٰ اِس کی مستحق نہیں ہے۔" سنعیہ نے ایک بار پھر طوبیٰ کے لیے ناپسندیدگی کا برملا اظہار کیا۔

ہر جگہ سراہے جانے والی سنعیہ کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہیں تھی کہ ایک عام سی لڑکی اُس کے مقابلے پر تھی اور ہر شخص اُسے سنعیہ سے بہتر گردان رہا تھا۔ سنعیہ اب خاموشی سے اپنی کافی میں چمچ چلا رہی تھی اور دماغ کسی بھی طرح سے اپنے آپ کو طوبیٰ سے بہتر ثابت کرنے کی سوچوں میں غلطاں تھا، اِس بات سے قطعی بے خبر کہ دروازے کے قریب ہی کھڑی طوبیٰ کی آنکھیں طیش کے عالم میں پھیل گئی تھیں۔

طوبیٰ کی بدقسمتی ہی تھی جو وہ وہاں سے اُس وقت گزر رہی تھی اور سنعیہ کے منہ سے اپنا نام سُن کر اُس کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی تھی۔ سنعیہ اُس کے کردار کے بارے میں ایسی بات کہہ سکتی تھی اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ صدمے اور غصّہ میں وہ اپنی جگہ منجمد رہ گئی۔

"کیا واقعی سنعیہ مجھے اتنا حقیر سمجھتی ہے؟" یہ سوچ ہی سوانح روح تھی۔ بھنچی مٹھیوں کے ساتھ وہ ایک قدم آگے بڑی کہ سنعیہ سے ابھی ہی ساری باتوں کی وضاحت مانگ لے اور اُس سے پوچھے کہ کس بنا پر اتنا گھناؤنا الزام وہ طوبیٰ پر لگا رہی تھی لیکن کسی انجانی طاقت نے طوبیٰ کے قدم تک جکڑ لئے۔ اب نجانے وہ صدمہ تھا یا سنعیہ کے سامنے آنے سے حالات کے بگڑنے کا خوف، وہ جھٹکے سے مڑی اور باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ طیش کے عالم میں اُسے اپنا خون اُبلتا محسوس ہو رہا تھا اور آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے۔

واش بیسن پر جھک کر اُس نے کتنی ہی بار اپنے چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھویا لیکن ایسا لگتا تھا کہ سنعیہ نے اُس کے چہرے پر سیاہی مل دی ہے جو چھوٹنے کا نام نہیں لے رہی۔

"طوبیٰ اکبر، تمہیں کہیں چین نصیب نہیں ہوگا۔ مستقل جدوجہد ہی تمہاری قسمت ہے۔ کبھی پیسے کے لیے تو کبھی اپنے وقار کے لیے۔"

آئینے میں اُس کا عکس ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔

...۞...

ویانا کا عدالتی نظام انتہائی منظّم تھا۔ چھتیس گھنٹوں بعد ہی اُسے عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ کمرہ عدالت کا پرسکون ماحول ویانا شہر کی چہل پہل سے قطعی مختلف تھا۔ ادھیڑ عمر شخص جو جج کی کُرسی پر براجمان تھا، عینک کے اوپر سے ایک سرسری نگاہ اسفر پر ڈال کر معاملے کی کارروائی میں مشغول ہو چکا تھا۔

اسفر کی وہ واحد زندگی جسے وہ سب کچھ گردانتا تھا آج ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس سے اُس کو کوئی لگاؤ کوئی سروکار نہ تھا۔ یہاں تو شاید کوئی رحم کی اپیل بھی کام نہ آتی۔

"مجھے انصاف ہی ملے گا..... میں نے تو صرف جواباً تھپڑ مارا تھا۔" اسفر نے اپنے دل کو ایک کمزور سی آس دلائی۔

وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھا جب جج کی آواز اُس کو حال میں کھینچ لائی:

"پیش کردہ شواہد اور حملے کی سنگینی کی بنیاد پر میں آپ کو مقدمے کی سماعت تک پولیس کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ آپ کے خلاف سخت الزامات کے باعث آپ کی طرف سے دوبارہ جرم کرنے کا خطرہ لاحق ہے۔"

اسفر کو لگا وہ کوئی بُرا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ سب کچھ حقیقت ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اُس نے دانستہ کسی کے ساتھ بُرا نہیں کیا تھا تو اصولاً اُس کے ساتھ بھی انصاف ہی ہونا چاہیے تھا۔ اگر زینیا باہر آزاد تھی تو بھلا وہ کیوں سلاخوں کے پیچھے تھا؟

نقاہت تھی، تشویش یا پھر ندامت.... اسی گومگو میں اسفر میکانکی انداز میں افسر کے پیچھے چلتا ہوا اُس چھوٹے سے کمرے میں موجود تھا جہاں غیر یقینی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا کہ وہ جلد وہاں سے باہر نکل بھی پائے گا یا نہیں۔ فیصلے کی واحد غلطی نے اُس کو ایک ایسی سرزمین کے قانونی چکّر میں پھنسا دیا تھا جہاں وہ آیا تو اپنی زندگی کی تکمیل کے لیے تھا لیکن اب غیر یقینی کی تاریک راہ کا مسافر تھا۔

"اللہ بڑا رحم دل ہے۔ اگر ہم سچّے دل سے توبہ کریں تو وہ بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیتا ہے۔" عائشہ کے الفاظ یک دم ہی دماغ میں کُوندے۔

"اگر وہ ہوتا، تو!" اسفر غصّے سے پھنکارتے اپنے آپ ہی سے لڑ پڑا۔ اور پھر خود ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیوں رو رہا ہے، خدا کے نہ ہونے پر، اپنے بھلائے جانے پر یا اِس ناانصافی پر۔ بس دل ہلکا کرنے کا شاید یہی طریقہ رہ گیا تھا۔ تنہائی کے جس عذاب میں وہ مبتلا تھا وہ اب کبھی نہ ختم ہونے والا تھا۔

...۞...

رضیہ اس دن سے طوبیٰ سے شدید ناراض رہیں۔ حالانکہ طوبیٰ نے رضیہ کو منانے کے لیے کافی پیش رفت کی لیکن اب کی بار شاید رضیہ کا مان ٹوٹ گیا تھا جو ہر ماں کو اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔

اُس دن طوبیٰ رات آٹھ بجے گھر پہنچی تھی اور سب کے خاموش چہرے دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ حالات کافی سنگین ہو چکے تھے۔

رمشہ الگ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اُس دن تو طوبیٰ نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی تھی لیکن کئی دن گزرنے کے بعد بھی جب رضیہ کا چپ کا روزہ نہ ٹوٹا تو طوبیٰ کو ہول اُٹھنے لگے تھے۔ آفس میں سنعیہ کی طرف سے لگائے گئے الزامات سے وہ ویسے ہی پریشان تھی، سونے پہ سہاگہ گھر کا تنا ہوا ماحول۔

"امّی اب معاف بھی کر دیں، اور کتنے دن مجھے سزا دیں گی؟"

طوبیٰ رضیہ کے پاؤں سے لگی بیٹھی تھی لیکن رضیہ تھیں کہ رُخ موڑے بیٹھی تھیں۔

"ہم کون ہوتے ہیں تمہیں سزا دینے والے۔ تُم تو اتنی بڑی، اتنی سمجھ دار ہو کہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود

کرسکتی ہو۔" وہی نروٹھا لہجہ۔

طوبیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ رضیہ کی شکایت اِس بات کا اشارہ تھی کہ برف اب پگھلنے لگی تھی۔

طوبیٰ بستر کی چادر کو بے وجہ یہ کھر چنے لگی۔

"امّی آپ جانتی ہیں پھر بھی ایسی باتیں کرتی ہیں۔یقین جانیں اس دسترخوان کو نہ بچھانا بس ایک عیب ہے،لیکن بچھانے پر سارے زمانے کو اس میں سو عیب نظر آنے لگیں گے۔"

رضیہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ رُخ بدستور موڑے بیٹھی تھیں۔"تم نے کب سے لوگوں کی پروا کرنا شروع کردی طوبیٰ؟"

رضیہ کی بات پر طوبیٰ چونک گئی۔"واقعی میں نے ایسا کرنا کب سے شروع کردیا؟" وہ سوچ کر رہ گئی۔

"اپنی وجہ سے نہیں امّی، آپ لوگوں کی وجہ سے کرتی ہوں پروا۔ مجھے کوئی کچھ کہے گا تو زیادہ تکلیف آپ ہی کو ہوگی۔" طوبیٰ نے دھیمے سے جواب دیا۔اور کوئی جواب فی الوقت اُس سے نہ بن پڑا تھا۔ یہ اُس کی خام خیالی تھی کہ اُس کی ذات پر کوئی بھی اُنگلی اُٹھائے اُسے فرق نہیں پڑے گا۔سنعیہ نے جو کاری وار کیا تھا وہ اب تک اُس کی تکلیف میں جل رہی تھی۔

"پھر بھی طوبیٰ،تمہیں اپنی ماں کی بات کا مان رکھ لینا چاہیے تھا۔ مجھے دُکھ پہنچایا ہے تم نے۔" رضیہ کی خفگی بجا تھی۔"جتنی خفّت کا سامنا اُس دن ہم نے مہمانوں کے سامنے کیا تھا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ بالآخر مجھے معذرت کرنی پڑی تھی۔"

"امّی، میں بہت کٹھن سفر طے کرکے یہاں تک پہنچی ہوں۔اب جبکہ میرے صبر کا ثمر ملنے کا وقت ہوا ہے تو آپ اُس درخت ہی کو کاٹنے کے درپے ہیں۔ مجھے اُس امتحان میں نہ ڈالیں جس میں میں کامیاب نہ ہوسکوں۔" طوبیٰ کی رُندھی ہوی آواز نے رضیہ کی رہی سہی ناراضی بھی ختم کردی۔آگے صرف خاموشی تھی۔ایک دوسرے کے گلے لگی وہ ماں بیٹی خاموشی کی گفتگو سے بخوبی واقف تھیں۔

...۞...

اگلے ہی دن اسفر کے قانونی حق کے مطابق اٹارنی اُس کے پاس موجود تھا۔ اُس سے گفتگو اسفر کے لیے تپتی ریت پر پھوار کی مانند تھی، محفوظ مستقبل کی ایک امید جاگ اُٹھی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اِن امنگوں کی زندگی چند روزہ ہی تھی اسفر ایک بار پھر اپنے موقف پر ڈٹ گیا تھا۔

تین دنوں میں ہی اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس کی معصومیت کو ثابت کرنے کے لیے شواہد زینیا کے لگائے گئے الزامات کو رد کرنے کے لیے کافی ثابت نہ ہوئے تھے لیکن ایک طالب علم اور اچھے ماضی کے ضمن میں اسے صرف ۲۰ ہفتوں کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کاؤنسلنگ اور سوشل سروس اضافی تھے۔

جیل میں ایک نئی دنیا آباد تھی۔ ایک ہی جیسی سلاخوں کے بجنے کی آواز اور قدموں کی ملی جلی چاپیں اسفر کو اس کی نئی حقیقت بتانے کے لیے کافی تھیں۔ کہنے کو صرف پانچ مہینے تھے لیکن یہ وقت بھی ابدی لگ رہا تھا۔ پہلے ہفتے کے پانچویں ہی دن کے بعد سے اس نے معمول کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ جیل کے اندر کا معمول باہر کے شب و روز سے کچھ خاص مختلف نہ تھا۔

صبح ہی صبح اٹھ کر سب کو اپنے کاموں پر لگ جانا ہوتا تھا اور وقت پر کھانے، سونے اور کام کرنے کی پابندی ضروری تھی۔ اسفر کو اس معمول کو اپنانے میں کسی خاص دقّت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہاں جیل میں ایک عدد لائبریری موجود تھی جو اسفر کے لیے کسی خوشگوار ہوا کے جھونکے سے کم نہ تھی۔

اگلے ہی ہفتے معمول کی جانچ کے دوران چہروں کے سمندر میں ایک شخص نے اسفر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ دوسرے سخت مزاج قیدیوں کے برعکس وہ کافی مہذب معلوم ہوتا تھا۔ اسفر نے خاموشی سے اس کی سمت قدم بڑھا دیے۔

مضبوط جسم کا مالک وہ شخص مقامی ہی لگتا تھا۔ اُس کے بینچ پر بیٹھے کتاب پڑھنے کی محویت ہی نے شاید اسفر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ کتاب خاصی پُرانی اور بوسیدہ لگ رہی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جیل کی لائبریری سے ادھار نہیں لی گئی تھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' اسفر نے کچھ دیر انتظار کے بعد بالآخر مداخلت کی۔

آنکھوں میں حیرانی کا تاثر لئے اس شخص کی بھوری چمکدار آنکھیں اسفر کو اپنے اندر ایک مقناطیسیت لیے ہوئے محسوس ہوئیں۔

بھورے بال اور ساتھ ہی ہلکی بھوری بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ اس کو مجمع سے ممتاز کرنے کے لیے کافی تھا۔

ایک دوستانہ مسکراہٹ اور سر کی جنبش سے جواب موصول ہوتے ہی اسفر کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''میں اسفر ہوں۔ مجھے یہاں دو ہفتے ہی ہوئے ہیں۔''

جواباً ایک شرارتی سی مسکراہٹ اس شخص کے مدبّر چہرے پر پھیل گئی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو یہاں خوش آمدید نہیں کہہ سکتا۔''

اسفر کو مسکرانے میں کچھ اجنبیت کا احساس ہوا۔ شاید اتنے دنوں میں اس کے ہونٹ مسکرانا ہی بھول گئے تھے۔ اسفر جواباً کہنا چاہتا تھا کہ بس قسمت یہاں لے آئی لیکن وہ ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ قسمت پر یقین تو کب کا وہ چھوڑ چکا تھا۔

''آپ مجھے تھوڑے مختلف لگے باقی سب لوگوں سے۔''

وہ شخص بہت زیادہ مسکراتا تھا۔ ایک بار پھر ایک تمکین سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر رقصاں تھی۔

''اچھا، مختلف کیسے؟'' اس نے آہستگی سے کتاب بند کر دی اور اسفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا ''میرا نام ایمل ہے اور یہاں سب کی طرح میں نے بھی کچھ غلطیاں کی ہیں، حالانکہ میرا جرم زیادہ نہیں بس یہی ہے کہ میں نے ایک مختلف طرز زندگی کا انتخاب کر لیا تھا۔''

اسفر کو ایمل کی صورتحال کچھ ہم آہنگ لگی۔

''بس ایسے ہی۔ آپ باقی لوگوں کی بہ نسبت کچھ خاموش اور پرسکون لگے جو باقی لوگوں میں نظر نہیں آتا۔ میں بھی اپنا سکون تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس شور وغل میں سناٹا چاہتا ہوں جہاں کچھ پل سکون سے گزار لوں۔'' اسفر کی آواز میں تھکن نمایاں تھی۔

"سکون تو تب ہی میّسر آتا ہے جب آپ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتے ہیں اور میّسر حالات کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ اور ایسے حالات تو سمجھیں ایک سنہری موقع ہیں۔ سوچنے، سمجھنے اور سیکھنے کا ایک نادر موقع۔

ایمل نے اسفر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، جہاں اسے جھنجھلاہٹ اور مایوسی ہی نظر آئی۔

اسفر نے ایک گہرا سانس بھرا ''آسان تو نہیں، لیکن میں بھی اسی کوشش میں ہوں۔ حالانکہ میری فطرت میں غصہ کرنا نہیں لیکن بس ایک چوک نے مجھے یہاں لا کھڑا کیا ہے۔''

''غصہ اکثر درد کا ردعمل ہوتا ہے چاہے وہ ہمارا ہو یا کسی اور کا۔'' ایمل یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اسفر کو لگا کہ وہ انتظار میں ہے کہ اسفر اب مزید کچھ کہے گا لیکن اس کے پاس بھی جیسے الفاظ کا قحط پڑ گیا تھا۔

''کاؤنسلنگ سیشن لے رہے ہیں آپ؟'' ایمل نے خود ہی گفتگو کا تانا جوڑا۔

''ہوں۔'' اسفر نے یک حرفی جواب دیا۔

''اچھی بات ہے۔ یہ آپ کو سمجھنے میں مدد دے گا کہ آپ کے جذبات کو اس حد تک آخر کس چیز نے اتنا متحرک کر دیا تھا اور مستقبل میں آپ اس کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔"

اسفر نے استہزائیہ انداز میں سر کو جنبش دی ''ابھی تو سُرنگ کا دوسرا کنارہ بھی دیکھنا مشکل ہے۔''

''سرنگ کا اختتام ہمیشہ جگہ نہیں ہوتا اسفر۔ کبھی کبھی یہ ایک نیا نقطہ نظر بھی ہوتا ہے۔" ایمل نے انتہائی متانت سے بات آگے بڑھائی۔" اور اگر آپ سُرنگ کے دکھائے گئے رستے پر چلتے رہیں تو ایک نہ ایک دن منزل پر پہنچ ہی جائیں گے۔''

اسفر یکدم ہی چونک گیا۔ اسفر کو ایسا لگا جیسے ایمل اس کے بارے میں پہلے ہی سے سب جانتا ہو لیکن بھلا ایسا کیسے ممکن تھا۔

''آپ کو یہ سکون کیسے ملا؟'' اسفر نے بے ساختہ سوال کیا۔

ایک اور دھیمی سی مسکراہٹ نے ایمل کے چہرے کو مزید پرکشش بنا دیا۔ ایک جذب ایک اپنائیت، مقناطیسیت کیا تھا جو اسفر کو ایمل سے محسوس ہو رہا تھا اسفر سمجھنے سے قاصر تھا۔ شاید عباس کا عکس تھا جو

اسفر کو ایمل میں نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ دونوں کی شکل صورت سے لے کر جسامت تک سب کچھ مختلف تھا بس ایک ہی مماثلت تھی، شفیق گفتگو جو اسفر بہت پہلے گنوا چکا تھا۔

''وقت، سمجھوتا اور بہت زیادہ مشقت۔'' ایمل نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

''مشقت؟'' اسفر نے حیرانی سے دیکھا؟

"مشقّت کے بغیر کامیابی کا خواب دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے بنا فصل لگائے فصل کاٹنے کی توقع رکھنا۔" ایمل کی ہلکی ہنسی کے ساتھ اُس کے موتیوں جیسے دانت نمایاں ہو گئے۔

''یہاں دوسروں کی خدمت کر کے میں نے اپنی جان کی خدمت کرنا سیکھا ہے۔''

ہم ہر ہفتے صبح کو کچھ سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں، یہیں مرکزی میدان میں شامل ہونے، مدد کرنے یا صرف بات کرنے کے لیے بھی آپ کا استقبال ہے۔''

''ضرور،'' اسفر نے آسانی سے حامی بھر لی۔ انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

ایک نرم مسکراہٹ نے ایمل کے چہرے کو ایک بار پھر جاذب نظر بنا دیا۔

''کم از کم میں اپنے آپ کو یہ باور کروا پاؤں گا کہ میں اپنے آپ کو ضائع نہیں کر رہا۔'' اسفر نے یاسیت سے سوچا۔

''کتنے وقت کے لیے ہیں آپ یہاں؟'' اگلا سوال پھر ایمل کی طرف سے تھا۔

''پانچ مہینے، لیکن ابھی صرف دو ہی ہفتے گزرے ہیں۔'' اسفر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''باقی بھی گزر جائیں گے۔ اور کیا پتا یہ وقت آپ کے لیے کسی چیز کا بہترین آغاز ثابت ہو۔'' ایمل نے اسفر کے کاندھے کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

شام کے سائے لمبے ہونے کے ساتھ ساتھ اسفر کی امیدیں بھی گہری ہوتی نظر آئیں۔ اپنے اپنے چیمبرز میں جانے کا الارم بھی بج چکا تھا۔ ایک انتہائی غیر متوقع جگہ پر زندگی کی مختلف ہنگامہ آرائی کے درمیان اسفر کو ایک راہِ فرار نظر آئی تھی۔ ایمل میں نہ صرف اُسے ایک سرپرست بلکہ ایک ہمسفر بھی نظر آ رہا تھا۔

.....۞.....

طوبیٰ بہت یکسوئی سے ایک پریزنٹیشن بنانے میں مصروف تھی۔ یہ پریزنٹیشن اس کے کریئر کے لیے بہت اہم تھی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سامنے اپنے آپ کو ثابت کرنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا اور اس کو وہ کسی صورت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

اچانک ہی اسے کچھ بے آرامی کا احساس ہوا، بالکل وہ احساس جب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مستقل آپ کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

طوبیٰ نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سب ہی اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اپنا وہم سمجھ کر وہ ایک بار پھر اپنے کام پر یکسو ہو چکی تھی، لیکن بے چینی اس کو تھوڑی ہی دیر بعد ڈنگ مارنے لگی اور اس بار اس نے اپنی داہنی جانب دیکھا جہاں فرحان کا آفس تھا۔ ایک پل کو اس کی نظریں شیشے کے اس پار بیٹھے فرحان سے ملیں اور دوسرے ہی پل وہ ہڑبڑا کر اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا۔ طوبیٰ کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی اور نہ ہی دل میں کوئی گدگدی بلکہ ماتھے پر بس ایک بل پڑ گیا تھا۔ مخروطی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ آفس کا وقت ختم ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ ایک دو لوگ ہی اب مزید آفس میں موجود تھے جو اپنا سامان سمیٹ کر گھر جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔

طوبیٰ نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن کے پچھلے حصے کو دبانے لگی۔ یہ پراجیکٹ اس کے لیے اعصاب شکن ثابت ہوا تھا۔ کمپنی نے اس پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا تھا اور اسے ہر حال میں یہ اعتماد بحال رکھنا تھا۔ یہ اس کے روشن مستقبل کی ضمانت تھا۔

خیالوں میں گرما گرم چائے کا بھاپ اُڑاتا کپ آ گیا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اُف....'' کہتی ہوئی اپنے آپ کو ریلیکس کرتے جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں سامنے میز پر بھاپ اڑاتا چائے کا کپ دیکھ کر وہ تقریباً اچھل پڑی۔ چائے کا کپ لانے والا کوئی اور نہیں بلکہ

فرحان تھا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، اپنی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ فرحان بول اُٹھا۔

''مجھے لگا آپ کو اس وقت چائے کی طلب ہوگی، مستقل چار گھنٹے سے آپ کی تمام تر توجہ صرف اس لیپ ٹاپ پر مرکوز ہے۔''

طوبیٰ سنبھل کر بیٹھ چکی تھی۔

''آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں لے لیتی اگر مجھے چاہئے ہوتی۔'' طوبیٰ کا انداز نارمل سے کچھ تلخ تھا۔

فرحان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی اور آنکھوں میں تعجب کا عنصر نمایاں ہو گیا جس کو طوبیٰ نے واضح محسوس کیا۔

''میرا مطلب ہے، مجھے بس کام ختم کرنا ہے جلد از جلد....'' طوبیٰ نے اپنے لہجے کو حتیٰ الامکان جذبات سے عاری رکھنے کی کوشش کی۔

''میں کچھ مدد کروں؟'' فرحان کی فراخدلانہ پیش کش پر طوبیٰ کا خون ہی کھول گیا۔ جتنا وہ اس کو نظر انداز کر رہی تھی اُتنا ہی وہ اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں شکریہ! میرا کام بس ختم ہو گیا ہے۔'' طوبیٰ نے اپنی توجہ لیپ ٹاپ پہ مرکوز کرتے ہو کہا۔

''کاش میں بھی ایک لیپ ٹاپ ہی ہوتا۔'' فرحان نے دل میں سوچا اور اپنے خیال کو جھٹکتے، مسکراتے واپس اپنے آفس آ گیا۔

طوبیٰ کی طرف شیشے کے اس پار اُسے دیکھا تو وہ چائے پی رہی تھی۔ ایک سکون سا فرحان کے دل میں اُتر آیا۔

...۞...

اپنے مختصر سیل میں قریباً ڈھائی فٹ چوڑے بستر پر سیدھا لیٹے وہ چھت کو گھور رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ لائبریری سے اس نے میسر کتب میں سے چند کا انتخاب کیا تھا اور چند ہی صفحات پڑھ کر اسے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے سونے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن سارے رشتوں کی طرح نیند بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔ زینیا کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کا دل کیا دنیا جہان کی گالیاں اس کو دے ڈالے۔ صرف اس ہی کی وجہ سے آج وہ اس جگہ موجود تھا جہاں اپنے زندگی کے قیمتی بیس ہفتے اسے برباد کرنے تھے۔

''آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ....'' ایک کوڑا تھا جو پوری طاقت سے ایک بار پھر اسے جھنجھوڑ گیا تھا۔ مسترد ہونے کا احساس کس قدر تلخ ہوتا ہے اسے اندازہ بہت پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اس کی کسک ہر بار پوری قوت کے ساتھ وہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ سامنے سفید دیوار پر اپنی زندگی ایک فلم کی طرح چلتی نظر آنے لگی۔

ماں باپ بہن بھائی وہ کس قدر محبت کرتا تھا ان سے اور اِک ذرا سے خیالات کیا بدلے سب نے اسے ایسے چھوڑ دیا تھا جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے اپنے دل کی بڑھتی ہوئی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کی۔ رہ رہ کر اسے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے یہ اس وقت اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

آج اس گھٹن زدہ سیل میں اسے ایک منٹ بھی گزارنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ اسے لگا اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔ اسے خوف نے آ لیا۔ ''کیا بس یہی میری زندگی تھی؟ ابھی تو میں نے کوئی خوشی نہیں دیکھی، کوئی تفریح نہیں کی۔ میرا وجود اتنا بے معنی تو نہیں ہو سکتا۔''

اسفر کو احساس ہوا اسے اس وقت موت سے شدید خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا تیز قدموں سے

پنڈولم کی طرح دس فٹ کی لمبائی میں ادھر سے ادھر چلنے لگا۔ چلتے چلتے جب وہ تھک گیا تو ایک بار پھر بستر پر بیٹھ گیا۔ نڈھال سا ہو کر اس نے دیوار سے سر ٹکا لیا۔ اس کے سینے اور سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ زور زور سے چلّائے اور اس قید کو توڑ کر کہیں دور کسی کھلی فضا میں چلا جائے اور گہرے سانس لے۔

''میں نے کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا لیکن یہ سب آخر کیوں میرے ساتھ ہو رہا ہے؟'' اس نے شکایتی انداز سے سوچا۔ ''دنیا میں ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ کبھی کسی کی املاک کو نقصان نہیں پہنچایا، کسی کا دل نہیں توڑا الٹا لوگوں ہی نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور اب تک پہنچا رہے ہیں۔ جس جس کو میں اپنا مانتا ہوں وہی میرے سینے میں خنجر گھونپ دیتا ہے۔

کسی کو کیا خبر اپنوں کے ہاتھ یا جس کو دل ہی اپنا مان لے اس کے ہاتھوں ٹھکرا دیا جانا کیسا ہوتا ہے۔ کتنا کٹھور تجربہ ہوتا ہے۔ یہ ہر سانس کڑوی شراب زبردستی حلق میں انڈیل لینے کے مترادف ہے۔ کچی عمر ان زخموں کے نئے مرہم ڈھونڈنے میں گزر جاتی ہے۔ ابھی میرے زخم بھرنے بھی شروع نہیں ہوتے کہ کوئی نیا گھاؤ مل جاتا ہے۔''

اسے یاد آیا عائشہ سویٹر بنا کرتی تھیں اور وہ بڑی یکسوئی سے باریک تیلیوں کی حرکت دیکھا کرتا تھا۔ بڑی ہی سرعت سے انگلیوں کی پوروں پر بے مثال مہارت سے اون ادھر ادھر ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹکڑا خوبصورت ڈیزائن کے ساتھ تیار ہوتا۔ لیکن ایک بار عائشہ نے پورا سوئٹر ادھیڑ ڈالا تھا۔ دو گھنٹے کی محنت کو بس ایک تار کھینچنے کی دیر تھی اور مڑے تڑے اون کا ڈھیر ان کی گود میں پڑا تھا۔

''یہ کیا کیا امی؟'' اُس کا چہرہ فق ہو گیا تھا اسے اُدھڑے سویٹر کو دیکھ کر بے پناہ دکھ ہوا تھا۔

''بیٹا ایک گانٹھ غلط پڑ گئی تھی۔ بے عیب سوئٹر بنانے کے لیے پورا کھول کر دوبارہ بُننا پڑے گا۔''

آج وہ خود بھی اُدھڑے ہوئے، مڑے تُڑے اون کی طرح پڑا تھا۔ ہارا ہوا، مضمحل، خمدار۔

''تو کیا مجھ میں بھی کوئی عیب آ گیا ہے جو مجھے یوں پل پل ادھیڑا جا رہا ہے؟''

اسفر کو دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی اور سانس پھانس بن کر حلق میں اٹکنے لگا۔ اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور پوری قوت سے آکسیجن اندر کھینچنے کی کوشش کی۔

وہ سلاخی دروازے کی طرف دوڑا اور دونوں ہاتھ باہر نکال کر بے تحاشہ ہلانے لگا۔

''مدد کرو!'' گھٹی گھٹی آواز اس کے حلق سے نکلی اور پھر وہ اندھیرے کی وادیوں میں ڈوب گیا۔

بھاری قدموں کی آواز اُس کی سماعت کے پردوں پر آخری نشان تھے۔

...۞...

سنعیہ اپنی ڈیسک پر بیٹھی کام میں مصروف تھی جب اچانک ہی اس کی نظر بریک روم کے داخلی دروازے پر پڑی جہاں فرحان ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔

مسرت سے کافی کی خواہش نے سنعیہ کے دل میں انگڑائی لی اور اُس نے بھی بریک روم کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"ہیلو سر!" سنعیہ نے نرمی سے آواز دی۔

فرحان اُس کی طرف مُڑ کر مسکرایا۔ "آہ سنعیہ، گڈ مارننگ! کیا حال ہیں؟"

"بالکل ٹھیک سر....!" خوبصورت سی مسکراہٹ سجائے اُس نے اپنے سلکی بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔ "میں بنادوں کافی آپ کے لیے؟" سنعیہ نے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر پیشکش کی۔

"ارے نہیں،" فرحان نے حسبِ عادت اپنی جاندار مسکراہٹ کے ساتھ سنعیہ کے دل کو چُھو لیا۔

انتہائی انہماک سے فرحان اب اپنی کافی میں چمچ چلا رہا تھا اور اُتنے ہی انہماک سے سنعیہ کافی بنانے کے ساتھ ساتھ فرحان کی آنکھوں کے کناروں پر پڑنے والی باریک سلوٹوں کو دیکھ رہی تھی جو ہلکا سا مسکرانے پر پڑ رہی تھیں اور پھر نظر اُن بالوں پر جا کر ٹھہر گئی جو خوبصورت انداز میں سنوارے گئے تھے۔

فرحان اب ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھا اور سنعیہ ہر بات پر بھرپور اظہارِ خیال کر رہی تھی۔ کافی سے فارغ ہوتے ہی فرحان اپنے آفس کی طرف واپس چلا گیا۔ سنعیہ مسّرت سے اُس کی پیٹھ کو تکتی

رہی۔ وہ ابھی ہونے والی ہلکی پھلکی گفتگو سے ابھی تک لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اچانک فرحان جاتے جاتے پلٹ گیا اور سنعیہ جس کے چہرے سے مسکراہٹ اب تک نہ جدا ہوئی تھی ہڑبڑا گئی۔

"سنعیہ کیا آپ میری کچھ مدد کریں گی؟"

"جی سر بالکل" سنعیہ خوشی خوشی تیار تھی۔

"ابھی دس منٹ میں میری کچھ اہم کلائنٹس کے ساتھ میٹنگ ہے اور مجھے نوٹس لینے کے لیے کسی کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کے پاس کچھ وقت ہوگا؟"

سنعیہ کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ "جی سر بالکل۔"

جب سنعیہ اپنی میز پر واپس آئی تو اُس کا انگ انگ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اُس کے برابر والی سیٹ پر طوبیٰ موجود نہیں تھی۔ اُس نے شکر منایا کہ طوبیٰ وہاں نہیں تھی۔ اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اُس نے ایک بار پھر اپنے بالوں کو برابر کیا اور لپ اسٹک پر نظر ثانی کی۔ اپنے گلابی ہوتے گال دیکھ کر اُسے خود پر ہنسی آ گئی۔ وہ کسی اسکول کی لڑکی کی طرح اپنے کرش کے پیچھے دیوانی لگ رہی تھی۔

ابھی وہ فرحان کے کمرے کی طرف جا ہی رہی تھی کہ سامنے سے اُسے طوبیٰ آتی دکھائی دی۔ سنعیہ اِک دم بدمزہ ہوئی۔ پوری زندگی میں واحد طوبیٰ تھی جس سے اُسے حقیقت میں مقابلہ سے ڈر محسوس ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے خدشہ تھا کہ فرحان کا جھکاؤ طوبیٰ کی طرف ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی سنعیہ جیسی روشن خیال لڑکی طوبیٰ کو فرحان کی نظر میں نیچا دِکھانے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔

سنعیہ سے نظریں ملتے ہی طوبیٰ کے دل کی دھڑکن کچھ بے ترتیب ہوگئی اور غصّہ نے اُس کی جگہ لے لی۔ آج اُس کی حتمی پریزینٹیشن تھی اور وہ پوری تیاری کے ساتھ مثبت توانائی لے کر آفس میں داخل ہوئی تھی لیکن سنعیہ کے چند دن پہلے کہے گئے نفرت انگیز جملوں کی بازگشت اُسے اب بھی ویسی ہی سُنائی دے رہی تھی۔

"سنعیہ مجھے تُم سے کچھ بات کرنی ہے" طوبیٰ نے یکدم ہی دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔سنعیہ کے اُٹھتے قدم ایک لمحے کے لیے رُکے لیکن "ابھی میں سر فرحان کے ساتھ میٹنگ میں ہوں، ہم بعد میں بات کرتے ہیں" کہہ کر اُسی ادا سے اپنی ہیل ٹک ٹک کرتی فرحان کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔طوبیٰ نے ایک گہرا سانس لیا اور لیپ ٹاپ کھول کر اہم معلومات پر ایک بار پھر نظر ثانی کرنے لگی۔

...۞...

آج اسے بہت خوش ہونا چاہیے تھا، بلکہ خوشی سے ناچنا چاہیے تھا۔اس کی رپورٹ اور پریزنٹیشن کو نہ صرف پوری ٹیم نے سراہا تھا بلکہ بورڈ نے نئے پراجیکٹ میں تمام سینیئرز کے ساتھ اس کا نام بھی تجویز کر دیا تھا۔

سب اس کو مبارکباد دے رہے تھے اور وہ ایک متین سی مسکراہٹ لیے سب کی مبارکباد وصول کر رہی تھی۔

آخر کار جب سکون سے بیٹھنے کا موقع ملا تو وہ اپنے جذبات کا جائزہ لینے کے قابل ہوئی۔ایک گہرا سانس کھینچ کر وہ کچھ دیر یوں ہی ساکت بیٹھی رہی۔

''میں آج بہت خوش ہوں'' اس نے اپنے آپ کو باور کرایا۔دل کو ٹٹولا تو اس کو بھی جگمگا تا نہ پایا۔

طوبیٰ کو الجھن ہونے لگی۔"یہی تو مجھے چاہیے تھا، پھر یہ بے نام سی اُداسی کیوں ہے؟"

وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ نئے پراجیکٹ کے ساتھ جو مراعات اُس کو ملنے والی تھیں وہ اس کی اوّلین خواہشات میں سے چند تھیں۔اِس کے باوجود طبیعت کی یہ تشنگی طوبیٰ کو خوب کھل رہی تھی۔

''جن چیزوں کی میں نے ہمیشہ چاہ کی ہے میں ایک ایک کر کے سب پالوں گی۔''

امید ابھی بھی باقی تھی سو آنکھوں میں عزم خود ہی سمٹ آیا۔فاصلے سمٹ رہے تھے۔منزل قریب تھی۔ نامکمل صحیح لیکن قریب تھی۔دل تو صنم آشنا تھا اور اور اپنے محبت کے صنم پر تو اس نے قفل ڈال رکھے تھے۔جیتی ہوئی بازی اس نے خود پلٹی تھی۔تو اس کفرانِ نعمت کے بعد بڑی سے بڑی خوشی بھی کہاں اسے کامل لگتی۔کچھ تو بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔

''کامیابی مبارک'' خوبصورت لہجے کے ساتھ ایک خوبصورت پھولوں کا گلدستہ اس کی میز پر موجود تھا۔اس نے نظریں اٹھائیں تو توقع کے عین مطابق فرحان کو وہاں موجود پایا۔

طوبیٰ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''شکریہ،لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔'' طوبیٰ نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔وہ کسی بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے معلوم ہے آپ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی'' غالباً فرحان کا اشارہ کچھ دنوں پہلے پیش کی جانے والی چائے کی طرف تھا۔

طوبیٰ دھیمے سے مسکرادی۔

''کیا میں آپ کو اپنے ساتھ کافی پینے کے لیے مدعو کرسکتا ہوں۔'' فرحان کے لہجے میں بے انتہا ادب تھا۔

''مدعو کرنا آپ کا حق ہے اور منع کر دینا میرا، میرے خیال سے اس مساوی لائحہ عمل سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوگی۔'' فرحان کی چمکتی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

''چلیں جیسے آپ کی مرضی۔ مجھے خوشی ہوتی اگر آپ کی خوشی سیلیبریٹ کرتا۔''

طوبیٰ نے جواباً کچھ نہ کہا۔بس سر کی جنبش سے بات کا اختتام ضروری تھا۔بعض باتیں طول پکڑ جائیں تو ان کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔

''آئی ایم ناٹ انٹرسٹڈ....'' اس نے زیرلب اپنے آپ کو یاددلایا اور دوبارہ کام میں مشغول ہوگئی۔

.....۞.....

''اب کیا حال ہے۔''

''سب نارمل ہے، ڈپریشن کا اٹیک تھا۔ ایسا کبھی کبھی نئے لوگوں کے ساتھ ہوجاتا ہے۔''

دور سناٹے سے کچھ آوازیں گڈ مڈ ہوتی اُس تک پہنچ رہی تھیں اور پھر سناٹا، جیسے خلا میں ہوتا ہے، خالی پن، شدید غیر موجودگی۔

''چلیں میں تھوڑی دیر انتظار کرتا ہوں۔'' آواز کچھ بامعنی لگی۔ کوئی جانی پہچانی آواز، ٹھہرا اور دھیما دھیما لہجہ۔

''ابّو'' خاموشیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور دو اندھیرے غاروں کے کناروں پر دھند میں لپٹی روشنی نظر آنے لگی۔ اُس کی پلکوں پر ہلکی سی لرزش ہوئی۔ روشنی سلاخوں سے چھلک رہی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ آنکھیں آہستہ آہستہ کھل گئیں۔ سلاخیں روشنیوں کی چکا چوند میں باریک ہونے لگیں اور پھر وہ بالکل آزاد ہوگیا۔

روشنی نے اُس کو دوبارہ آنکھیں میچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک مضبوط اور پُرشفقت لمس اُس کو اپنی پیشانی پر محسوس ہوا۔ اُس کی روح تک پُرسکون ہوگئی۔ اب کی بار آنکھیں کھولنا دشوار بالکل نہ تھا۔ وہ بس گہری نیند سے جاگا تھا۔ بالکل تر و تازہ۔ وہ اس وقت جیل سے متصل ایک چھوٹے سے کلینک میں تھا۔ ایک میل نرس آگے بڑھا۔ آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر ان کی جانچ کی، نبض کی جانچ کی۔

''ٹھیک ہو؟'' جذبات سے عاری آواز میں اس نے سوال کیا جبکہ نگاہیں ہاتھ میں موجود ایک کاغذ پر جمی تھیں۔

''ہاں....'' اسفر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے آس پاس کے ماحول کو کھوجا۔ کل رات کی کوئی یادداشت اس کے دماغ میں موجود نہ تھی۔

ایمل اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اپنی مخصوص سادہ سی مسکراہٹ کے ساتھ۔

''دس منٹ میں واپس لے جا سکتے ہو۔'' نرس نے آگے کسی کو مطلع کیا اور اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

''بہتر محسوس کر رہے ہو؟'' ایمل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اسفر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسفر نے مسکرانے کی کوشش کی تھی اور شاید اس میں کچھ کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' اسفر نے تشویش سے پوچھا۔ وہ کافی وقت سے اپنی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگا تھا تو اس طرح تکلیف دہ حالت میں بے ہوش ہو جانا اس کے لیے باعث تشویش تھا۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور اس کا صحیح استعمال ہی عقلمندی تھا۔

''تمھیں پینک اٹیک ہوا تھا۔ شدید اینگزائٹی کے باعث۔''

ایمل نے مختصر جواب دیا اور چپ ہو رہا۔ اسفر بھی اس سے آگے کچھ مزید تفصیلات نہیں چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس اپنے سیل میں موجود تھا۔ کچھ دیر وہ بستر پر خالی الذہنی کی حالت میں بیٹھا رہا۔ قریباً دو گھنٹے وہ بے وجہ ٹہلتا رہا۔ کچھ وقت بعد اسفر ایک بار پھر کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

رات والی حالت اسے یاد آئی تو اُسے جھرجھری آ گئی۔ اُسے یک دم احساس ہوا کہ یہ سیل بھی کسی قبر کی مانند ہے۔ وہ ایک لمحے کو کھڑا رہ گیا۔ اسفر کو لگا سیل کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں اور چھت نیچے کی طرف سرک رہی ہے۔ اس کا دل ایک بار پھر خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے چاہا کہ وہ اٹھ کے بھاگ جائے لیکن اسے اندازہ ہوا اس کے پیر زمین میں میخوں کی طرح گڑے ہوئے تھے۔

''نہیں!'' اس کے دماغ نے سرگوشی کی۔ اُسے اسٹریچر پر لیٹا اس جواں سوالہ لاشے کا خیال آیا جو نشے میں ہونے کے باعث گر کر اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔

''میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔'' اسفر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پاؤں بدستور زمین سے جڑے تھے اور وہ اب بھی پوری طاقت لگانے کے باوجود اپنے جسم کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ جسمانی طور پر اسفر

ایک صحت مند انسان تھا لیکن اسے لگا اس کا کوئی عضو بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ پسینہ میں شرابور وہ چلانا چاہتا تھا۔ بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگانا چاہتا تھا لیکن اپنی زبان تک پر اس کا اختیار نہ تھا۔ اپنے جسم کو غیر مرئی طاقتوں سے چھڑانے کے لیے جو مشقت وہ اٹھا رہا تھا اس سے وہ پسینہ پسینہ ہو چکا تھا۔

اچانک ایک نا شناسا چہرے نے اُسے آواز دی اور جیسے سب کچھ پل بھر میں غائب ہو گیا۔ نہ ہی دیواریں سکڑ رہی تھیں اور نہ ہی اس کو کسی طاقت نے قابو میں کر رکھا تھا۔ کانوں میں عجیب سا جو شور تھا وہ بھی پل بھر میں غائب ہو چکا تھا۔ اسفر کو ہر طرف ایک دم اجالا اور سناٹا محسوس ہوا۔ ساری کیفیت زن سے غائب ہو گئی تھی۔

اسفر نے نو وارد کی طرف خالی نگاہوں سے دیکھا جو اپنا مدعا بیان کر کے جواب کے انتظار میں کھڑا تھا لیکن اسفر کو کچھ یاد نہ تھا۔ اُس کے سوالیہ چہرے کو بھانپتے ہوئے نو وارد نے پھر اپنا مدعا بیان کیا۔

''ایمل نے سب کو جمع کر لیا ہے۔ تم کو بلایا ہے اگر بہتر محسوس کر رہے ہو۔'' اسفر کے چہرے پر تشویش ناک آثار دیکھ کر آنے والے شخص نے فکر مندی سے کہا۔

اسفر سُرعت سے آگے بڑھا۔ خلاف توقع اس کے بازو اور ٹانگیں بالکل مستعد تھیں اور انتہائی زور لگا کر چلنے کی وجہ سے اسفر تقریباً لڑکھڑا گیا تھا۔

نو وارد نے حیرت زدہ آنکھوں سے اسفر کو دیکھا لیکن کچھ کہے بغیر سر کے اشارے سے اسفر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ایک لمحے کی دیر کیے بغیر اسفر اس کے پیچھے تھا۔ اس کا سیل حقیقتاً اس کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اُس کا ڈپریشن بڑھتا جا رہا تھا۔ پانچ مہینے پانچ سالوں جتنے طویل لگ رہے تھے اور ابھی تو پانچ ہفتوں کا اختتام بھی نہ ہوا تھا۔

...۞...

مختلف شہروں کا وزٹ شاندار رہا تھا اور کراچی پہنچتے ہی طوبیٰ کو تفصیلی رپورٹ جمع کروانی تھی۔ دن میں اٹھارہ گھنٹے کام کرنے سے اُس کی حالت اب خراب ہوچکی تھی۔ جسم کے ساتھ ساتھ اب دماغ بھی تھکنے لگا تھا۔

"بس یہ رپورٹ جمع کروادوں اُس کے بعد ایک دن کی چھٹی لے کر صرف آرام کروں گی۔"

رضیہ کی فکروں کے جواب میں اُس نے عجلت میں جواب دیا اور رضیہ کو گلے لگا کر دلاسہ دیتی آفس کے لیے نکل گئی۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے فرحان کا محتاط رویّہ طوبیٰ کے سامنے آتا گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ اِس بات پر خوش ہو یا فکرمند۔ جو بھی ہوا تھا اُس کے مستقبل کے لیے حوصلہ افزا نہ تھا۔ ٹیم میٹنگ بھی قریب تھی اور طرح طرح کے خدشات اب سر اُبھارنے لگے تھے۔

میٹنگ کی صبح ہی کو اُس کا سنعیہ سے ایک بار پھر اکیلے آمنا سامنا ہوا لیکن رات گئی بات گئی کے مصداق طوبیٰ بھی سنعیہ کی باتوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ سنعیہ کی جیلیسی کی نوعیت کا اُس کو کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا اور اب فرحان کے لیے دیئے رویّے نے نہ صرف طوبیٰ بلکہ سنعیہ کو بھی سکون بہم پہنچایا تھا۔

"طوبیٰ، میں چاہتا ہوں آپ اِس نئے پروجیکٹ کی قیادت کریں۔" فرحان کی مضبوط اور پیشہ ورانہ انداز سے کہی گئی اِس بات پر سب ہی ہمہ تن گوش تھے۔ "مجھے لگتا ہے آپ اِس پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔"

ایک کے بعد دوسرا اتنا بڑا پروجیکٹ دوبارہ طوبیٰ کی جھولی میں ڈالنا کسی کو بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میٹنگ روم میں موجود تمام افراد کے ساتھ طوبیٰ بھی ہکّا بکّا بیٹھی تھی۔ اصولاً اُسے اِس بات پر بہت خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اُس کے دماغ کا ایک حصّہ اُسے آنے والے خطرے کی طرف سے خبردار

کر رہا تھا۔

فرحان اب باقی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا اور طوبیٰ چور نظروں سے سنعیہ کو کھوج رہی تھی جو سُست چہرہ لئے بیٹھی تھی۔

"بہت شکریہ سر.... مجھ پر اعتماد ظاہر کرنے کے لیے۔" طوبیٰ نے بھی انتہائی پیشہ ورانہ انداز اختیار کیا۔ "پچھلی بار کی طرح، اب کی بار بھی میں اِس پراجیکٹ کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کروں گی۔"

فرحان نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

"مجھے آپ سے بہترین کے سوا کوئی اور امید نہیں ہے، مِس طوبیٰ۔"

فرحان کی آنکھوں کی چمک نے طوبیٰ کو نظریں چُرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ترمیم کی کوشش تھی یا پھر کوئی نقطہ ثابت کرنے کی سعی، طوبیٰ کوئی فیصلہ نہ کر پائی لیکن میٹنگ روم سے باہر نکلتے وقت وہ اِس احساس کے پوری طرح لپیٹ میں تھی کہ وہ کسی جال میں پھنس رہی ہے۔ ایک طرف کامیاب ہونے کا عزم تھا تو دوسری طرف سیاست کے پیچیدہ جال میں سے سرخرو ہو کر نکلنا۔ مشکلات تھیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

...۞...

اگلے دن کی شروعات ایک معمول کی طرح تھی۔ وہ اپنے مقررّہ وقت پر آفس میں موجود تھی اور اپنے کام میں مگن جب دیکھے جانے کے ایک مستقل احساس سے وہ شدید بے آرام ہونے لگی، نظر اُٹھا کر دیکھنے پر پتا چلا کہ اُس کا یہ احساس حق بجانب تھا۔

دور کھڑے کچھ کولیگز اُس کو دیکھ کر ہی باتیں کر رہے تھے اور اب مشاہدہ کئے جانے پر کچھ تو رُخ موڑ گئے تھے اور کچھ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ طوبیٰ کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔ شدید جھنجھلاہٹ کے ساتھ وہ سخت کوفت میں بھی مبتلا ہوئی۔

دوسرے ڈیپارٹمنٹ سے کچھ اہم معلومات لینے کے لیے وہ کاریڈور سے گزر رہی تھی جب ایک بار

پھر سنعیہ کی آواز نے اُس کے پاؤں جکڑ لیے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا طوبیٰ کو سب پتا ہوتا ہے کہ اُسے کب، کہاں اور کس کے ساتھ ہونا ہے۔"

آواز میں طنز، تفاخر، حسد سب ہی نمایاں تھا۔

سلمان نے اب کی مرتبہ طوبیٰ کا کوئی بچاؤ نہ کیا۔ اُس کی خاموشی ہی اُس کی رضا مندی تھی۔

"سرفرحان کہیں طوبیٰ کا کیریئر تو سبوتاژ نہیں کرنا چاہتے؟" علی ہنستے ہوئے ایک اور نکتہ لے آیا تھا۔

"اتنے کم وقت میں اتنے پراجیکٹ وہ بھی اتنی قریب ڈیڈلائن کے ساتھ عنایت کم اور بدلہ زیادہ لگ رہے ہیں۔"

"لیکن وہ ایسا کیوں کریں گے؟" سلمان کی پُرسوچ آواز اُبھری تھی۔ کسی کے پاس بھی اِس بات کا جواب نہیں تھا۔

یہ سب سننے کیلئے طوبیٰ وہاں بالکل بھی نہیں رُکی تھی۔ اِن سب باتوں سے انجان بن کر کام کرنے ہی میں اُس کی بھلائی تھی لیکن ایسا ہونا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

...۞...

رمشہ نے ایک ناقدانہ نظر اپنے سامنے کھڑے قدآدم آئینے پر ڈالی۔ وہ پرکشش تو تھی ہی اور آج تو کچھ مختلف ہی لگ رہی تھی۔ بھورے بالکل سیدھے بال اس کی کمر تک آ رہے تھے اور کانوں میں پڑی چاندرنگ بڑی بڑی بالیاں اس کے بالوں میں جھانکتی خوب چمک رہی تھیں۔ دوپٹہ پہلے اس نے پھیلا کر سینے پر اوڑھا۔ اپنا آپ کچھ اچھا نہ لگا تو انداز بدل لیا۔

کبھی ہاتھوں میں پیچھے کی طرف تو کبھی گلے میں۔ پھر آخر ایک طرف کاندھے پر ڈال کر دائیں بائیں مڑ کر ہر رُخ سے اپنا جائزہ لیا، اپنے نشیب و فراز کو جانچا اور تسلی کر لینے کے بعد ایک بار پھر لپ گلوس اٹھا کر ہونٹوں کو ننھے سے بُرش سے چھوا۔

ہلکے گلابی ہونٹ لپ گلوس سے مس ہوتے ہی چمکنے لگے تھے۔ اب مسکارا اٹھا کر پلکوں کی کوٹنگ شروع کر دی۔ نئی برانڈ کا کیٹ آئی مسکارا اس نے حال ہی میں خریدا تھا۔ اس کی بادامی آنکھیں

بھاری پلکوں کی قید میں کچھ اور افسانوی لگنے لگیں۔

طوبیٰ اندار داخل ہوتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔

''ایسے جاؤ گی تم؟'' اس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

آج کنول کا نکاح تھا اور سب لوگ بس تیار ہو کر نکلنے ہی والے تھے۔

''ہاں، کیوں؟'' رمشہ نے آئینے میں ایک بار پھر خود کو جانچا۔''تھیم کے حساب ہی سے تو سفید اور سلور پہنا ہے میں نے.....'' طوبیٰ کے سوال پر وہ حیران ہوئی۔

''میرا مطلب ہے مخلوط محفل ہوگی۔'' طوبیٰ نے رمشہ کی معلومات میں اضافہ کیا اور نفاست سے حجاب کو سر پر لے کر سیٹ کرنے لگی۔

''تو....؟'' رمشہ کی آنکھوں میں اب سوال کے ساتھ جھنجھلاہٹ بھی تھی۔ کمان جیسی ابروؤں کے درمیان ایک سلوٹ اُبھر آئی تھی۔

''تو یہ کہ دوپٹہ سر پر تو لے لو کم از کم۔ یہ کیا کنارے ایک ہنگر کی طرح لٹکا رکھا ہے۔'' طوبیٰ تھوڑی تلخ ہوئی۔

''دیکھو آپی! مانا کہ تم مجھ سے بڑی ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم ہر بات پر روک ٹوک کرو۔'' رمشہ کا موڈ خاصہ خراب ہو چکا تھا۔

''امی ابو نے ہم سب کو اپنے طریقے پر زندگی گزارنے کی اجازت دی ہے۔ جن حدود کو وہ مجھے باور کرا چکے ہیں میں ان کو کبھی پار نہیں کرتی۔

حجاب لینا تمھاری خواہش ہے میری نہیں۔ براہِ مہربانی اپنی زندگی کے لیے لئے گئے فیصلے میرے اوپر نہ تھوپو۔'' رمشہ نے کوئی لگی لپٹی نہ رکھی تھی۔ اس کی آواز ٹھنڈی اور تلخ تھی۔

طوبیٰ سُن کھڑی رہ گئی۔ اس کی کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔ وہ چپ چاپ کھڑی رمشہ کو دیکھے گئی۔ وہ اپنا پرس اُٹھا کر جانے لگی۔

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ میرا کام تمہیں بتانا تھا سو بتا دیا۔ بالآخر طوبیٰ نے کندھے اُچکائے۔ رمشہ

جاتے جاتے دروازے پر رُک گئی۔

''آپی ایک بات کہوں؟''

رمشہ نے یوں اجازت طلب کی جیسے اگر طوبیٰ منع کر دے گی تو وہ خاموش ہو جائے گی۔

''تکبر انسان کو تباہ کر دیتا ہے، چاہے وہ حسن پہ ہو، کامیابی پر یا اپنے تقویٰ پر۔تم بہت زیادتی کرتی ہو مجھے یہ باور کروا کر کہ تم مجھ سے بہتر مسلمان ہو۔ ہر کسی کا امتحان مختلف ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے میں ابھی ایمان کے نچلے درجے پر ہوں اور ہوسکتا ہے اگلے پہر تم سے بھی آگے۔ شیطان تو ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔کیا تم کو اتنا بھروسہ ہے کہ ہر بار شیطان کو چت کر دو گی؟''

طوبیٰ کے چہرے پر کون سا رنگ آیا تھا اسے اندازہ نہیں تھا۔ رمشہ جا چکی تھی اور طوبیٰ تب تک جامد بیٹھی رہی جب تک حسنہ اسے عندیہ دینے نہ آ گئی کہ سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔

.....۞.....

اسفر جب میدان میں پہنچا تو ایمل نے جس سیشن کی بات کی تھی وہ شروع ہو چکا تھا۔ کچھ قیدی وہاں موجود تھے اور اسفر کے ساتھ ہی دو تین لوگ اور اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ وہ سب ایک دائرے میں بیٹھے تھے اور ایمل بھی ان کے درمیان زمین ہی پر بیٹھا تھا۔

''انسان کی ضروریات لامحدود ہیں۔ ان میں سے کچھ ضروریات سے تو دنیا میں آتے ہی پالا پڑ جاتا ہے اور اس کا علم انسان کو ماں کی کوکھ ہی میں دے دیا جاتا ہے جیسے سانس کیسے لینی ہے، دودھ کیسے پینا ہے یا ضرورت کے وقت رونا ہے یہ باتیں تو انسان کو اس وقت بھی پتا ہوتی ہیں جب اس کو کسی بات کا بھی ہوش نہیں ہوتا اور کچھ ضروریات ایسی شدید نہیں ہیں جیسے عمدہ کھانا کھانے کی چاہ، آرائش اور رہن سہن کو خوب سے خوب تر بنانا۔ غرض وہ کام جو انسان کو طبعی طور پر نہیں آتے بلکہ وہ انہیں سیکھتا ہے۔ اور جب انسان سیکھنا شروع کرتا ہے تو رُکتا کہاں ہے۔ معلومات کا ذخیرہ کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس ذخیرہ ہی کا نام سائنس یا فلسفہ یا حکمت ہے۔''

ایمل نے دھیمے دھیمے لہجے میں ہر شخص کو اپنی بات سمجھانے کی پوری کوشش کی۔

''تو گویا سائنس، فلسفہ اور حکمت ایک ہی علم کے تین نام ہیں؟'' ایک سیاہ فارم نے اٹک اٹک کر ٹوٹی پھوٹی جرمن میں سوال کیا۔ غالباً وہ اس زبان کو سمجھ تو لیتا تھا لیکن روانی سے بولنا ابھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

ایمل نے خوش دلی سے سوال کا خیر مقدم کیا اور گویا ہوا۔ ''حکمت تو نام ہے موجودہ حقائق یا علم کا جو ہم سب ہی کے لیے جاننا از حد ضروری ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ہم حکمت سیکھ جاتے ہیں۔ اصل بحث فلسفہ اور سائنس کی ہے۔''

اتنا کہہ کر ایمل نے بامعنی خاموشی کا وقفہ لیا۔ سب ہی اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔

''فلسفی کہتا ہے میں سائنسدان سے بہتر ہوں اور سائنس دان کہتا ہے کہ فلسفہ تو بس کتابی باتیں ہیں۔

حالانکہ سائنس اور فلسفہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔''

''لیکن فلسفہ اور سائنس بھلا ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟'' ایک آواز اُبھری جو اسفر کے ساتھ دوسری بہت سی سوچوں کی عکاس تھی۔

''بہت اچھا سوال ہے'' ایمل نے خوش دلی سے سوال کرنے والے کا خیر مقدم کیا۔

''فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں love of wisdom یعنی حکمت کی محبت۔ اور سائنس کیا ہے؟ سائنس فطری اور سماجی دنیا کے اس علم کا نام ہے جو شواہد پر مبنی ہو۔

لیکن اصل مدعا یہ نہیں کہ کون ان میں بہتر ہے، اصل بات تو یہ ہے کہ جو بھی علم حاصل ہو صحیح طریق پر حاصل ہو۔ اگر غلطی کے ساتھ ہوا جیسے پاگلوں کو ہوتا ہے کہ دوست کو دشمن سمجھ کر اینٹ مارنے لگتا ہے تو نہ اس کو حکمت کہیں گے اور نہ اس کے جاننے والے کو حکیم۔''

اسفر کو یہ گفتگو انتہائی دلچسپ لگی۔ جیل میں کم از کم کچھ وقت وہ کچھ نیا سیکھنے میں گزار سکتا تھا۔ اپنا تعلیمی سال ضائع ہونے کا اس کو حقیقی قلق تھا لیکن اس کا کچھ مداوا فی الوقت ممکن نظر آ رہا تھا۔

''تو جناب معلومات کا یہ ذخیرہ جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے اتنی ہی سہولتیں زندگی میں آتی جاتی ہیں۔ جسے ہم ترقی کہتے ہیں۔'' ایمل کی آواز اسفر کو اپنی سوچوں سے واپس کھینچ لائی تھی۔

''اور یاد رکھیں فلسفہ میں ترقی کرنے کا مطلب ہر طرح کے علم میں ترقی کرنا ہے۔ اس طرح دو فلسفے وجود میں آئے ہیں قدیم اور جدید۔ جن پر ہم کل بات کریں گے۔ تب تک آپ آج کی گفتگو پر غور کر لیجئے گا۔''

وہ چند ہی لوگ تھے جو ایک ایک کر کے اٹھ کر چلے گئے۔ صرف اسفر اور ایمل ہی وہاں بیٹھے رہ گئے۔

''آؤ اسفر! درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھتے ہیں۔'' ایمل نے میدان کے دوسری طرف ایک کونے کو اشارہ کیا جہاں ایک ہرا بھرا درخت ہوا سے لہلہا رہا تھا۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' ایمل نے اسفر کے بیٹھنے کے بعد گفتگو کا آغاز کیا۔

''مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' اسفر کی زرد رنگت اسفر کے الفاظ کی گواہ تھی۔

''مجھے اپنے سیل میں وحشت ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میرا وہاں دم گھٹ جائے گا۔ موت مجھے آ لے گی۔'' اسفر کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔

ایمل نے اسفر کو بغور دیکھا۔ ''تمہیں اصل خوف تنہائی کا ہے یا موت کا؟''

ایمل کے سوال پر اسفر نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد بھی اسفر کو کچھ سمجھ نہ آیا۔

''میں نے دونوں ہی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے دونوں سے خوف کھانے کی مجھے کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔''

ایمل کی سوالیہ نظروں پر اسفر نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''گھر والوں سے میرا ایک عرصے سے رابطہ نہیں ہے، تقریبا تین سال سے میں تنہا ہوں۔ چند ایک رشتے بنانے کی کوشش کی بھی تو وہ مجھے راس نہ آئے۔ یہی وجہ ہے جو میں یہاں ہوں۔ اور ایک طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ قریبی ہسپتال میں assistant ambler ہوں۔''

ایمل نے کچھ سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔

''کسی چیز کو قریب سے دیکھ لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا خوف دل سے نکل جائے۔ بعض اوقات کسی چیز کی محبت بھی انسان کو ڈرپوک بنا دیتی ہے۔ تم بتاؤ تمہیں کس چیز کی محبت نے اس خوف میں مبتلا کیا ہے؟''

سوال کی نوعیت ایسی تھی کہ اسفر ایک لمحے کو سٹپٹا گیا۔ ایمل نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''سوچو اسفر تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز عزیز ہے؟''

ایمل کا سوال کافی ذاتی نوعیت کا تھا لیکن اسفر کو من وعن اس کی ہر بات پر عمل کرنے میں کوئی تأمل نہ ہوا۔ ایمل کی ذات میں ایک مقناطیسیت تھی۔ حالانکہ ایمل اور اس کی عمر میں کافی فرق تھا۔ ایمل ادھیڑ عمری میں تھا۔ کافی چاق و چوبند اور خوش مزاج بھی۔

اسفر نے غور کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے اپنے گھر والوں کے چہرے اس کے سامنے لہرا گئے۔ پھر ایک جانا پہچانا چہرہ نظروں کے سامنے ٹھہر سا گیا۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ آج بھی وہ

اس کے حواسوں پر پوری طرح قابض تھی۔ پورے حق کے ساتھ۔ ایمل بہت گہری نظر سے اسفر کا جائزہ لیتا رہا۔ اسفر نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ دوست یار، کولیگز، نیا شہر، نئے چہرے..... پوری زندگی اس کے سامنے ایک بل بورڈ کی مانند کھڑی تھی۔

''مجھے سب سے زیادہ زندگی سے پیار ہے۔'' اسفر نے پُروثوق لہجے میں کہا ''زندگی بہت قیمتی ہے۔ یہ دنیا زندگی کے پاس امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں میں اس دنیا میں آیا ہوں تو اپنا بھرپور کردار نبھاؤں۔ اس زندگی سے ہر رنگ کشید کروں لیکن میری ہر خوشی کی راہ میں ایک نئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔''

ایمل اسفر کی باتیں سن کر ایک لمحے کو ٹھٹکا اور پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

''زندگی'' ایمل کی آواز کھوئی کھوئی تھی۔ ''بڑی ہی نایاب پسند ہے تمہاری۔'' زندگی کا نام لے کر تم نے ہر چیز سے محبت کا اظہار کر دیا۔'' ایمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسفر نے ایک گہرا سانس لیا۔ بالآخر کوئی تھا جو اس کے انتخاب کو سراہ رہا تھا ورنہ آج سے پہلے اپنے طرزِ زندگی اور طرزِ خیالات پر وہ دھتکارا ہی گیا تھا۔

''جب اتنی حسین چیز سے محبت ہو تو سکون کیونکر ہو۔'' ایمل نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کس چیز سے محبت ہے؟ سب سے زیادہ محبت۔'' اسفر نے دلچسپی سے ایمل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال پلٹا دیا۔

''مجھے؟'' ایمل خوشدلی سے ایک بار پھر مسکرا دیا۔ اسفر نے آج تک اتنا زیادہ مسکرانے والا شخص نہیں دیکھا تھا۔

''مجھے زندگی کی حقیقت سے محبت ہے۔'' ایمل نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

گویا آپ اور میں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔'' اسفر نے راحت کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن ایمل کے نفی میں سر ہلانے پر وہ رُک سا گیا۔

''دونوں میں بہت فرق ہے۔ زندگی کچھ اور ہے اور زندگی کی حقیقت کچھ اور ہے۔'' ایمل نے

ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اسفر کچھ اُلجھ سا گیا۔ ''مجھے تو ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔''

ایمل نے سر ہلا کر اسفر کی تائید کی۔ ''صحیح کہتے ہو۔ فرق واضح نہیں۔ لیکن کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں۔''

اسفر نے کچھ ناسمجھی کے عالم میں ایمل کی طرف دیکھا۔ ایمل نے اُسکی آنکھوں میں چھپی اُلجھن کو بھانپتے ہوئے کہا

''مجھے لگتا ہے یہ گفتگو قبل از وقت ہے لیکن اگر تم واقعی کھُلے دل و دماغ سے اس پر بات کرنا چاہتے ہو تو میں تیار ہوں۔ اور ہاں اس بات کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ میں تمہاری باتوں سے قائل نہیں ہوں گا۔ جہاں تم مجھے دلائل سے چت کر دو گے میں بخوشی اپنی ہار تسلیم کر لوں گا۔''

گفتگو اسفر کے لیے دلچسپ سے دلچسپ ترین ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے اس بات سے ہی طمانیت کا احساس ہوا تھا کہ کم از کم یکطرفہ بحث نہیں ہوگی۔

''بالکل۔'' اسفر نے بخوشی اس پیشکش کو قبول کیا۔

اسی اثناء میں جیل کے اسٹاف میں سے ایک فرمانروا وہاں آ موجود ہوا، اور درشتی سے ان دونوں کو اپنی الاٹ کی ہوئی ذمہ داریوں پر عمل کرنے کا عندیہ دیا۔ وہ دونوں ہی مسکراتے ہوئے مستعدی سے اُٹھ گئے۔ ایمل کی ڈیوٹی کمروں کی صفائی ستھرائی کی تھی جسے وہ انتہائی خوشدلی سے سرانجام دے رہا تھا جبکہ اسفر کو خانساماؤں کی مدد کا کام سونپا گیا تھا۔

اُس کی ڈیوٹی صبح گیارہ سے شام چار بجے تک تھی۔ یہ وقت رات گزارنے جیسا مشکل نہیں لیکن اُس سے کچھ کم بھی نہیں تھا۔

ہیڈ باورچی جارج انتہائی اکھڑ مزاج تھا۔ چولہے پر چڑھی دیگ کے ساتھ وہ خود بھی اُبلتا رہتا تھا اور دوسروں کو بھی جھلسانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا تھا۔ اُس کا بات کرنے کا انداز انتہائی ہتک آمیز ہوتا اور اس کی نظریں انسان کو اپنی نظر میں گرا دینے کے مترادف ہوتیں۔ اُس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ ایک

ریٹائرڈ پولیس افسر تھا اور اُس کی اضافی نوکری غالباً اُس لے کیے کسی تمغے کی مانند تھی۔ اُس کے تمام ماتحت قیدی ہی تھے اور ان قیدیوں کا وہ اکیلا جیلر تھا۔

آج بھی جب جارج کی صلوٰتیں سننے کے ساتھ ساتھ اسفر برتن دھو رہا تھا تو ایک وقت پر اُسے ایسا لگا کہ ہاتھوں میں موجود پلیٹ اب وہ شاید جارج کے سر پر ہی دے مارے گا لیکن وہ اپنے غصے کو پرائے دیس میں بے قابو ہونے کا نتیجہ بخوبی بھگت رہا تھا اور اس کبھی نہ ختم ہونے والی سزا میں کوئی اضافہ نہیں چاہتا تھا۔

جیل میں گزرے ہوئے اِن چند دنوں نے اُس کو زندگی کے جو سبق پڑھائے تھے وہ بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں بھی نہ سیکھ سکتا تھا۔

.....۞.....

''سوری'' اگلے دن طوبیٰ آفس کے لیے تیار ہو رہی تھی جب رمشہ نے خلافِ توقع آ کر اس سے معذرت کی۔

''کس لیے؟'' طوبیٰ کے چہرے پر سن بلاک لگاتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے آئینے میں بیٹھے رمشہ کے عکس سے آنکھیں ملائیں۔

''کل میں نے تمہیں کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ مجھے تم سے نہیں کہنی چاہیے تھیں۔''

طوبیٰ نے ٹیوب بند کر کے دراز میں رکھی اور رمشہ کی طرف پلٹتے ہوئے کہا

''تم نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ غصہ دلانے والی بات تو میں نے کی تھی۔ تم حق بجانب تھیں۔''

طوبیٰ پنوں سے اپنا دوپٹہ لگانے لگی۔

رمشہ ہنستے ہوئے بولی ''ہاں کہہ تو صحیح رہی ہو' بات تو غصہ دلانے والی ہی تھی۔''

طوبیٰ نے اب اپنا پرس اٹھا لیا تھا۔ والٹ اور موبائل ڈالتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا ''پھر سوچا تم نے ان باتوں کے بارے میں جو میں نے تم سے کہی تھیں۔''

رمشہ نے حیرانی سے طوبیٰ کو دیکھا۔ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ پاؤں سمیٹ کر اس نے گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کر لیے۔

''میں نے کل اپنا نقطہ نظر تم پر واضح کر دیا تھا۔ اب مزید کیا سوچنا ہے اس چیز پر۔''

طوبیٰ اب نکلنے کے لیے تیار تھی ''لیکن میں نے کافی غور کیا تمہاری باتوں پر۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ ایک ذرا سا حجاب کیا اوڑھنے لگی میں اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھنے لگی تھی۔ نیتوں کا حال بہرحال اللہ ہی جانتا ہے لیکن پھر بھی میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گی کہ انسان جس کو خوش کرنا چاہتا ہے کم از کم اس کی پسند کے مطابق ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان کاموں سے بچتا ہے جس سے اس کی ناراضگی کا ڈر ہو۔ میں نے بھی بس ایک چھوٹا سا قدم ہی اٹھایا ہے اور ابھی تک ڈگمگا رہی ہوں۔ جب سنبھل

گئی تو اگلا قدم اٹھانے کی سوچوں گی۔ اور ہر مرتبہ اس بڑائی کے بت کو اپنے دل سے گراتے وقت تمہاری احسان مند رہوں گی۔''

رمشہ کی بات سنے بغیر طوبیٰ کمرے سے جا چکی تھی۔

...۞...

اسفر ایمل کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا وہ ان چند ملاقاتوں میں اخذ کر پایا تھا۔ بات چیت اور عادات و اطوار سے وہ خاصہ پڑھا لکھا لگتا تھا لیکن اس کی عاجزانہ طبیعت اور بے تحاشہ مسکرانے کی عادت اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔

''آخر کیا وجہ ہوگی جو ایمل جیسا آدمی جیل میں ہے؟'' رات اپنا دھیان بٹانے کے لیے اسفر ایمل اور اس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا۔'' میں کون سا عادی مجرم تھا جو یہاں آیا ہوں۔ میں بھی تو بے قصور ہی یہاں آ پھنسا۔'' اس کے اندر سے ایک جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔

''کیا پتا ایمل بھی ایسی ہی کسی ناگہانی بلا کا شکار ہوا ہو!''

بلا کے نام پر زینیا کا چہرہ اسفر کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے جو ہوا سو ہوا کہہ کر خیالات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ اور توجہ ایمل سے کی گئی گفتگو کی طرف موڑی۔

''کسی بات کا سمجھ نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں۔''

اسفر ایمل کے جملے میں الجھ کر رہ گیا'' آخر ایمل کا اس بات سے کیا مطلب تھا۔''

وہ سوچ کر رہ گیا اس سوال کا جواب اب اسے اگلے ہفتے ہی ملنا تھا۔

...۞...

اگلے ہفتے وہ وقت سے پہلے ہی مرکزی میدان میں پہنچ گیا۔ ایمل وہاں پہلے سے موجود تھا اور کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ یہ کتاب وہی بوسیدہ کتاب تھی جو اسفر نے پہلے ایمل کے ہاتھوں میں دیکھی تھی۔ اسفر خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔

ایمل نے اپنے قریب کسی شخص کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور اسفر کو دیکھتے ہوئے کتاب مسکراتے ہوئے بند کر کے رکھ دی۔

''آج صبح سویرے؟'' ایمل نے عینک اُتارتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بس سوچا فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے آپ کے ساتھ کچھ سیر حاصل گفتگو کر لوں۔''

ایمل اب پوری طرح اسفر کی طرف متوجہ تھا ''کیوں نہیں؟ تو بتاؤ کچھ سکون میسر آیا تم کو، اسی کی تلاش میں تھے نا تم؟''

''نہیں۔ بس کچھ جاننے کی بے چینی ہے۔'' اسفر نے ایمل کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا اور مسکراہٹ دباتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''اچھا، کیا میں مدد کر سکتا ہوں؟'' ایمل نے رسان سے کہا۔

''صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔'' اسفر نے بدستور ادھر ادھر دیکھتے سرسری انداز میں جواب دیا۔ اور پھر ساری توجہ ایمل کی طرف مرکوز کر دی۔

ایمل اسفر کی بات پر کچھ حیران ہوا ''اچھا، پھر تو میں ضرور اس بے چینی پیدا کرنے والی الجھن کو جاننا چاہوں گا۔''

''آپ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور یہاں کیوں ہیں؟''

اسفر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے تینوں سوالات اس طرح بیان کیے جیسے وہ واقعی بہت گھمبیر مسئلہ ہو۔''

''ہا ہا ہا!'' ایمل کا قہقہہ بلند تھا ''تو یہ بے چینی ہے آپ کو۔ چلیں ابھی دور کیے دیتا ہوں۔ میں ایک عام انسان ہوں جس کو علم سیکھنے اور سکھانے سے لگاؤ ہے۔ ایک محقق ہوں اور نئی و پرانی تھیوریز کے اوپر ریسرچ کرتا ہوں۔ یہاں اس لیے موجود ہوں کہ یہاں کی حکومت کو میرے خیالات سے کچھ خاص ہمنوائی نہ تھی۔ سو اختلاف رائے کے سبب میں کچھ قوانین توڑنے کا ملزم ٹھہرا۔ تو بس اس سنہری موقع کو جو چھ ماہ پر مشتمل ہے پوری طرح بروئے کار لا کر فلسفہ سیکھ رہا ہوں۔'' ایمل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اسفر نے سیٹی کے انداز میں لب سکیڑے اور پھر سر ہلاتے ہوئے کچھ سمجھی نا سمجھی کا مظاہرہ کیا۔ ''آپ استاد کے پیشے سے منسلک ہیں؟''

ایمل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکچر دیتا ہوں کبھی کبھی جب میری کوئی تحقیق مکمل ہو جاتی ہے اور اگر کوئی اُسے سننا چاہتا ہے تو۔

''آج کل آپ کی ریسرچ کا عنوان کیا ہے؟'' اسفر نے تجسس سے پوچھا؟

''فلسفہ اور جدید تحقیق۔'' ایمل نے سوچ سمجھ کر بالآخر کچھ تأمل کے بعد اسفر کے گوش گزار کیا۔

اسفر کو یہ موضوع انتہائی دلچسپ لگا۔ اور ایک دن پہلے ایمل کے دیئے گئے تدریسی عنوان کی بھی سمجھ آنے لگی۔

''تو کیا نتائج اخذ کیے آپ نے؟'' اسفر نے مزید سوال کیا۔

ایمل حسبِ عادت مسکرانے لگا۔

''اسفر، اگر میں آپ کو ابھی اپنی تحقیق کے نتائج بتاؤں تو آپ کبھی بھی میری بات پر یقین نہیں کریں گے بلکہ مجھے پاگل ہی کہیں گے۔''

''ایسا کیوں؟'' اسفر کو اچنبھا ہوا۔

''ایسا ہی ہے۔ آپ جیسے انسان جو ہر بات کو سوچ سمجھ کر اور پھر زمانے کی کسوٹی پر پرکھ کر فیصلہ کرتے ہیں بہت خاص ہوتے ہیں۔ بہتر ہے ہم براہِ راست نتیجے پر بات کرنے کے بجائے مشاہدات پر

پہلے بات کریں۔''

اسفر نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اسی اثناء میں ایک ایک کر کے لوگ ان کے پاس جمع ہونے لگے تھے۔ تدریس کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ جب کافی لوگ جمع ہو گئے تو ایمل نے سب کو خوش آمدید کہا اور گفتگو کا آغاز کیا۔

''پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ میں سے کتنے لوگوں کو میرے بارے میں جاننے کا تجسس ہے؟''

یہ سوال سب کے لیے غیر متوقع تھا تو ہلکی ہنسی کی کچھ آوازیں مجمع میں سے برآمد ہوئیں لیکن ساتھ ہی کچھ لوگوں نے جاننے کی خواہش ظاہر کی۔

ایمل نے کچھ سمجھنے کے سے انداز میں سر ہلا دیا اور اپنا تعارف کروایا

''میرا نام ایمل ہے اور آسٹریا میرا وطن ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ڈگری یافتہ ہوں لیکن ہر طرح کے مطالعے کا بے حد شوقین ہوں۔ آج کل ایک نئے موضوع پر تحقیق کر رہا ہوں اور اپنی معلومات آپ کے ساتھ بانٹنا مجھے اچھا لگتا ہے خاص طور سے تب جب آپ مکالمہ کرتے ہیں جس سے کچھ الجھی گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔ یہاں میں اس لیے ہوں کہ حکومت سے میرے کچھ نظریاتی اختلاف ہو گئے تھے۔ میرا اصل کام چنگاری بھڑکانا ہے باقی ہر شخص کی محنت پر منحصر ہے وہ اس سے اپنا راستہ کتنا روشن کرتا ہے۔'' ایمل نے مسکراتے ہوئے دس لوگوں کے قریب اس مجمع کو دیکھا: ''کیا کچھ اور بھی جاننے کے خواہشمند ہیں آپ؟ یا ہم اپنی گزشتہ گفتگو کو آگے بڑھائیں؟''

تمام لوگوں ہی نے ایمل کی اپنے بارے میں دی گئی معلومات کا خیر مقدم کیا اور آگے بڑھنے کا عندیہ دے دیا۔

ایمل نے گلا کھنکار کر بولنا شروع کیا ''فلسفہ حکمت سے محبت کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی سرگرمی ہے جو لوگ تب سرانجام دیتے ہیں جب وہ اپنی، اس دنیا کی اور اس دنیا کی مخلوق سے اپنے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے کوئی علم خارج نہیں۔

اور اگر سائنس کی بات کریں تو سائنس حقائق کی تلاش اور چھان بین کا علم ہے۔ تو گویا فلسفہ سائنس سے قوی تر ہے۔ کیا آپ میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟''

اسفر متذبذب تھا کہ یہ گفتگو آیا تمام افراد کو سمجھ بھی آ رہی ہے یا نہیں۔ کیونکہ فلسفہ اور سائنس اسفر کے نزدیک دو الگ سمتیں تھیں۔ فلسفہ اور سائنس کے تعلق کا یہ ادراک اُسے حال میں ہی ہوا تھا۔ تمام افراد ہی نے کچھ سمجھنے کے سے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

''بہت خوب! تو چلیں آپ بتائیں آپ اپنے آپ کو ایک فلسفی کہتے ہیں یا سائنسدان؟''

تمام ہی لوگوں نے اپنے آپ کے فلسفی ہونے کا عندیہ دیا سوائے اسفر کے۔

''بہت دلچسپ۔'' ایمل بہت پر جوش نظر آ رہا تھا۔'' مجھے خوشی ہے یہاں کوئی اپنے آپ کو سائنس دان بھی کہتا ہے ورنہ یہ بات تو طے ہے کہ ہم سب فطرتاً فلسفی ہی ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ انسان کن ذرائع سے ادراک حاصل کرتا ہے۔ ادراک یا تو کسی کے خبر دینے سے ملتا ہے، دوسرا ذریعہ ہماری عقل ہے جس پر پرکھ کر ہم کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں اور تیسرا ذریعہ ہمارے محسوسات ہیں۔ اپنے اپنے موقع پر یہ تینوں کام کرتے ہیں۔ ایک بھی آلے کو چھوڑ دینے والا حالات واقعی پوری طرح کیسے جان سکتا ہے؟''

ایمل نے کچھ توقف کے بعد سوال کیا'' کیا آپ بھی ان تین ذرائع کا استعمال کرتے ہیں؟''

سب ہی نے اثبات میں جواب دیا تو ایمل نے مسکراتے ہوئے بات آگے بڑھائی'' آپ کے نزدیک سب سے اہم آلہ کون سا ہے؟''

''میرے خیال میں عقل اور محسوسات سب سے زیادہ مستعمل ہیں۔'' ایک آواز ابھری اور باقی سر بھی اس کی تائید میں ہلنے لگے۔ کچھ کا خیال تھا کہ خبر بھی اہم جزو ہوسکتا ہے۔ اسفر خاموش بیٹھا ابھی غور و خوض ہی کر رہا تھا ایمل نے نام لے کر اس کی رائے جاننی چاہی۔

''میرے نزدیک محسوسات معلومات حاصل کرنے، اس کو پرکھنے اور صحیح فیصلہ کرنے میں سب سے زیادہ مدد دیتے ہیں۔ مشاہدے کے بعد ہی کسی بھی چیز کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''

ایمل نے سب ہی کی تائید میں سر ہلا دیا "اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سائنسدان ہیں یہ انہی کا طرزِ عمل ہے۔" ایمل نے سر کی جنبش سے اسفر کو سراہا۔ "عقل معلومات بہم پہنچانے کا اوسط ذریعہ ہے جس سے فلسفی بہت زیادہ استدلال کرتے ہیں اور معذرت کے ساتھ اسفر میں آپ کی بات سے تعارض برت رہا ہوں لیکن محسوسات معلومات حاصل کرنے کا سب سے کمزور ذریعہ ہے اور مزیدار بات یہ ہے کہ اس کو سب سے زیادہ استعمال وہی لوگ کرتے ہیں جو زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔''

بڑی خوبصورتی سے ایمل نے باتوں کو لپیٹا تھا۔ اسفر کو اس بات پر کوئی شک نہیں تھا کہ ایمل کی معلومات اور مطالعہ کمال کا تھا اور وہ بغیر کسی کی دل آزاری کیے قاری تک اپنا مدعا پہنچانا جانتا تھا۔ وہ الفاظ کا جادوگر تھا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' اسفر نے بلا تأمل سوال داغا۔

''اسفر ابھی اپ ہی نے اس کی بہترین وضاحت کی ہے کہ محسوسات میں مشاہدہ داخل ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہوائی جہاز کا جب مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ چھوٹا معلوم ہوتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ بڑا ہوتا ہے۔''

''لیکن وہ تو فاصلے کی وجہ سے ہوتا ہے۔'' اسفر کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''فرض کر لیں آپ ایک پانچ سالہ بچے ہیں آپ اس بچے کی نظر سے مشاہدہ کریں کیا آپ اب بھی یہی کہیں گے؟''

اسفر لاجواب ہو گیا۔

''وجوہات تو بعد کی بات ہے۔ ابھی تو سائنس صرف مشاہدہ پر استدلال کر رہی ہے ہاں اگلا پڑاؤ وجوہات کو جانچنے کا ہے کہ ایسا کیوں ہے، اسی کو ہم سائنس کی ترقی کہتے ہیں۔ سائنس نے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا، لیکن سب سے پہلے مشاہدہ کیا پھر اس مشاہدے کے جواز تلاش کیے، ان کو پرکھا، ان کو جانچا اور اس پر اپنی تھیوریز پیش کیں جس میں بعض اوقات صدیاں لگ گئی اور جب مشاہدات بدلتے جاتے ہیں ان تھیوریز میں بھی رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔

جیسے 350 قبل مسیح میں ایک فلاسفر ارسطو نے کہا کہ کائنات کا مرکز ہماری زمین ہے کیونکہ یہ اس کا مشاہدہ تھا گو کہ وہ ایک سائنسدان نہیں تھا پھر بھی اس نے بڑے پتے کی بات کہی اس نے غور کیا، محسوس کیا جانا اور یہ علم آگے بڑھا دیا۔

پھر 1543 عیسوی میں ایک سائنسدان نے جو کہ ماہرِ فلکیات تھا، نظامِ شمسی کا تعارف دیا اور بتایا کہ سیارے سورج کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ پھر اٹھارویں صدی میں سائنسدانوں نے کہا کہ کائنات میں گرد و غبار کے بادل آباد ہیں تو آپ کے خیال میں اس ہزار سال کے دورانیہ میں کیا ہوا ہوگا؟"

تمام ہی لوگ خاموش بیٹھے تھے اور ایمل کی گفتگو میں گُم تھے۔

"یقیناً تین گروہ بن گئے ہوں گے۔ ایک وہ گروہ جس کے پاس پرانے وقتوں کی خبر تھی کہ اس کائنات کو ایک ہستی نے تخلیق کیا ہے دوسرا وہ گروہ جس نے ارسطو کی بات کو من و عن مان لیا اور تیسرا گروہ وہ جو مزید مشاہدات اور مزید جانچ میں لگ گیا جنہیں ہم سائنسدان کہتے ہیں۔"

سب ہی لاجواب بیٹھے پرت در پرت کھلتی اِن معلومات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"تو یہاں پر سب سے زیادہ فائدہ میں کون رہا؟"

"جن کے پاس علم پہلے سے موجود تھا۔" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں

"بالکل" ایمل نے تائید میں سر ہلا دیا "لیکن باقی دو کی جستجو قابلِ تعریف تھی۔"

اسفر گنگ بیٹھا تھا۔ کتنا فخر تھا اُسے اپنی عقل پر، اپنے مشاہدے پر اور آج یہ انکشاف نا قابلِ یقین تھا کہ وہ معلومات کو پرکھنے کے کمزور ترین درجے پر فائز تھا۔

...۞...

ایک ہفتہ اسفر نے انتہائی شش و پنج میں گزارا۔ ایمل کی باتوں سے وہ اتفاق کرتا تھا لیکن اس صورت میں اپنے آپ کو سب سے کم عقل گردانتا اُسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی درخواست پر کتب خانے میں کچھ نئی کتابوں کا اضافہ کیا گیا تھا جن میں سرِ فہرست اسٹیفن ہاکنگ کی کتب تھیں۔ اسفر کو اس لکھاری کی روگردانی ہمیشہ ہی ایک راحت میسر کرتی تھی۔

''سائنس کو سمجھنے سے پہلے یہ تناظر فطری بات ہے کہ خدا نے کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز تو ضروری تھا لیکن اب جبکہ سائنس ایک زیادہ قابل اعتماد وضاحت پیش کرتی ہے تو ہم خدا کے دماغ کو جان لیں گے۔ یعنی ہم وہ سب کچھ جان لیں گے جو خدا کو معلوم ہوگا اگر خدا ہوتا جو کہ میں جانتا ہوں کہ نہیں ہے۔''

اپنا پسندیدہ پیراگراف پڑھ کر اسفر نے اپنے آپ کو تسلی دی ''میں غلط نہیں ہوں'' کا راگ الاپا اور پھر سونے لیٹ گیا۔ اگلے دن ایمل سے گفتگو کا دن تھا۔ ''سیر حاصل گفتگو'' ویسے تو مختلف اوقات میں کہیں نہ کہیں ایمل سے ملاقات میں ہو ہی جاتی تھی لیکن ہر پیر کی صبح کا انتظار اسفر کو اب ہمیشہ ہی بے صبری سے رہتا تھا۔ اور آنے والی صبح کے لیے اسفر نے خوب تیاری کر رکھی تھی۔

...۞...

''میں کسی خدا کی موجودگی پر یقین نہیں رکھتا۔'' اسفر کا لہجہ قطعی تھا۔ ایمل کی پچھلی گفتگو کا حوالہ دیتے ساتھ ہی اسفر نے ایمل کی بات کو رد کر دیا تھا۔ پاس بیٹھے تمام ہی لوگوں کے لیے یہ بات حیران کُن تھی۔

خلافِ توقع نہ ایمل کے چہرے کا رنگ بدلا اور نہ اس کے چہرے کے خدوخال بگڑے بلکہ ایک روایتی مسکراہٹ ایمل کے چہرے کا حصہ بن گئی۔

''تم مبارکباد کے مستحق ہو۔''

اسفر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی ایمل نے خدا کی موجودگی کو اپنے دلائل سے ثابت کیا تھا اور آج اسفر کے عدم اعتماد پر مبارکباد دے رہا تھا۔ اس چھوٹے سے مجمع پر بھی سکوت طاری تھا۔ سب ہی حیران تھے۔ ایمل کیا اپنی ہی بات کی نفی کرے گا۔

"کسی بھی اندھے یقین کا میں بھی قائل نہیں۔" ایمل نے دونوں ہاتھ سامنے کھڑے کر کے قطعیت سے کہا۔ سکون کی ایک آبشار تھی جو اسفر کے تپتے وجود پر پڑی تھی۔ اسے لگا وہ ایک نخلستان میں آموجود ہوا ہے، فضا یک دم ہی خوشگوار ہوگئی تھی۔ پہاڑ جیسا وہ بوجھ جو سالوں سے اپنے وجود پر لئے گھوم رہا تھا دھڑام سے زمین پر آگرا تھا۔

''شکر ہے کوئی تو میرے موقف کو سمجھا۔'' اسفر کے لہجے سے تھکن عیاں تھی۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو اسفر! اپنے آس پاس دیکھو لوگ اندھی تقلید میں لگے ہیں۔ کوئی عیسائی ہے کیونکہ وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا، کوئی مسلمان ہے تو بس ہے، اس کو خود بھی نہیں علم کہ وہ کیا ہے، بس ایک نیم ٹیگ ہے جو سب نے اپنی ذات پر سجا لیا ہے۔ حقیقت سے کوئی آشنا نہیں۔''

''بالکل'' اسفر نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا ''ہم ایتھیسٹ کسی بھی مذہب سے ہوں، کم سے کم آنکھیں ہماری دیکھنے اور دماغ سوچنے لائق ہیں۔''

''تمہاری عادات و اطوار سے لگتا ہے تمہارا تعلق اسلام سے تھا۔'' ایمل نے معنیٰ خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں....'' اسفر نے خوش کُن حیرانی کے ساتھ کہا ''لیکن آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا۔''

''تمہارے روشن چہرے اور اٹھنے بیٹھنے کے سلیقے سے۔ یہ سلیقہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

''آپ کون سے مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔'' اسفر کو بھی تجسس ہوا۔

''میں تو بنیاد پرست ہوں۔'' ایمل نے گول مول جواب دیا ''لیکن میں تمہارے بارے میں سوچوں تو تم ابھی بھی آدھے مسلمان ہو۔''

اسفر ایمل کی بات پر چونک گیا''ایسا کیوں لگا آپ کو؟''

ایمل کی ہر اگلی بات اس کو متجسس کر دیتی تھی۔ اس کا اندازِ گفتگو ہی ایسا تھا جو اپنے سامع کو مصروف رکھتا تھا۔

''بھئی تم لا الہ پر جو یقین رکھتے ہو۔'' ایمل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کوئی خدا نہیں ہے۔'' ایمل کا قہقہہ کافی بلند تھا۔ اسفر بھی خوب محظوظ ہوا۔ کہاں سے کہاں ڈور باندھی تھی ایمل نے۔ اسفر کھل کر ہنسا۔

آس پاس بیٹھے کچھ لوگ اِس گفتگو سے اُلجھن کا شکار تھے اور کچھ دوسرے کاموں میں مصروف ہو کر اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کر چکے تھے۔

ایمل کی تمام توجہ اسفر پر مرکوز تھی۔

''ویسے تمھارا کیا خیال ہے؟ خدا کہتے کس کو ہیں؟'' ایمل نے اپنی جیب میں سے چند مونگ پھلیاں برآمد کیں مونگ پھلی کو اپنی دانتوں میں دبا کر چٹخایا اور نہایت انہماک سے اس کو چھلکے سے نکالنے میں جُت گیا۔

''جب وہ ہے ہی نہیں تو مجھے اس سے کیا کہ خدا کس کو کہتے ہیں۔'' اسفر نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

''تم جس چیز کا انکار کر رہے ہو، تمہیں اس کے بارے میں تمام معلومات ہونی چاہئیں کہ وہ کیا ہے۔ تاکہ تم یقین سے کہہ سکو کہ وہ وجود ہی نہیں رکھتا۔'' ایمل نے بڑے ناصحانہ انداز میں کہا۔

اسفر سوچ میں پڑ گیا۔

ایمل نے چھلے ہوئے مونگ پھلی کے دانے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے آگے کر دیے۔ جیسے ہی اسفر نے کے مونگ پھلی اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ایمل نے شرارت سے مٹھی بند کر لی اور کہا''یہاں کوئی مونگ پھلی نہیں۔''

اسفر نے ایمل کو دیکھا تو وہ جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اسفر نے اطمینان سے کہا''بالکل ہیں لیکن آپ

نے اپنی انگلیوں سے اسے ڈھانپ لیا ہے۔''

ایمل نے معنیٰ خیز ہنسی ہنستے ہوئے تمام مونگ پھلیاں اسفر کے ہاتھ میں تھما دیں اور ہلکی آواز سے ہنستے ہوئے اپنے ہی کئے گئے مذاق پر محظوظ ہونے لگا۔ بقایا افراد کو بھی بات سمجھ آئی تو اُن سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

اسفر کچھ ناسمجھی کے عالم میں ایمل کو دیکھتا رہا اور جب اس کو بات سمجھ آئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''کسی بات کا سمجھ نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں۔'' یہ الفاظ کتنے ہی دن اس کے دماغ کی بازگشت تھے۔

''تو آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟'' اسفر نے ایک نکتے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" ایمل حیران ہوا ''میں تو ہر اس چیز پر یقین رکھتا ہوں جس کی دلیل موجود ہو۔'' ایمل نے پاؤں پھیلا کر آرام دہ حالت میں آتے ہوئے کہا۔ تمام مجمع اب انتہائی دلچسپی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔

''تو کیا آپ کے پاس خدا کے ہونے کی دلیل ہے؟'' اسفر کا لہجہ ناچاہتے ہوئے بھی تھوڑا چبھتا ہوا تھا۔

''پروبیبلٹی (Probablity) تو پڑھی ہوگی تم نے؟'' ایمل کا جواب ایک اور سوال کی صورت میں تھا۔

''ہاں!'' اسفر اب محتاط انداز سے جواب دے رہا تھا۔

ایمل نے بند مٹھی اس کے آگے کر دی۔ ''بتاؤ اس میں مونگ پھلی ہے یا نہیں؟'' اس بات کے کتنے فیصد چانسز ہیں۔''

''۵۰ فیصد چانسز ہیں کہ اس ہاتھ میں مونگ پھلی موجود نہیں ہے۔'' اسفر نے پرسکون ہو کر جواب دیا۔

''پچاس فیصد چانسز یہ بھی تو ہیں کہ اس میں مونگ پھلی موجود ہے۔''

ایمل نے بڑی معصومیت سے کہا۔ اسفر کو ہنسی آ گئی۔ ''ابھی تم ہی نے تو کہا تھا کہ مونگ پھلی ہاتھ میں تھی لیکن تمہیں نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ میں نے اُسے ڈھانپ لیا تھا۔''

اسفر کے جسم میں تناؤ کی کیفیت آ گئی۔ ایمل نے ہتھیلی اسفر کے سامنے کر دی جس پہ ایک مونگ پھلی کا دانہ بھی نہ تھا۔ اسفر خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے پاس فی الوقت کہنے کو کچھ نہ تھا۔

''تمھاری لاجک کے مطابق خدا کے ہونے کے بھی پچاس فیصد چانسز ہیں؟ اپنے آپ سے جنگ مت لڑو۔ یقین اور غیر یقینی کی کیفیت کے درمیان لٹکنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مشکل اپنے آپ سے جنگ لڑ کر دماغ میں سر اٹھانے والے خیالات کو عارضی سکون یا اپنی انا کی تسکین کے لیے دبا دینا ہوتا ہے۔''

ایمل نے بڑے ہی سادہ لفظوں میں اسفر کی زندگی کی گُتھی سلجھا دی تھی۔ اسفر ایک ٹک ایمل کو دیکھے گیا جواب کھڑے ہو کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔

''چلو، ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے۔''

محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اسفر بھی خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن دماغ میں ایک جوار بھاٹا تھا۔ وہ ہر بار ہی ایمل سے مات کھا رہا تھا۔ اب یہ بحث اس کے لیے مقابلہ بن چکی تھی اور اپنی ذات کی تجدید کے لیے اس سے یہ جنگ ہر صورت جیتنی تھی۔

...۞...

سنعیہ بظاہر اپنے کام میں مصروف تھی لیکن درحقیقت اُس کی ساری توّجہ طوبیٰ کے اوپر مرکوز تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اِس دوڑ کا حصّہ بن گئی تھی جس میں اُسے طوبیٰ سے ہر قیمت پر جیتنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں طوبیٰ اپنا کام مکمل کر کے اُٹھنے والی تھی اور یہ بات سنعیہ کو اچھی طرح معلوم تھی۔ یہ پچھلے دو ہفتوں کی محنت کا نتیجہ تھا جو وہ مستقل طوبیٰ کے اوپر لگاتی آئی تھی۔ کئی دفع موقع دیکھ کر نہ صرف اُس نے اہم اندراجات میں تبدیلیاں کی تھیں بلکہ اہم فائلز کو ڈیلیٹ کرنے سے بھی نہ چُوکی تھی۔

"طوبیٰ، اب کی بار میں تُم کو خود سے آگے نہیں نکلنے دوں گی۔" سنعیہ نے ہمکلامی کی اور انتہائی خاموشی سے اپنا کام نمٹا کر وہ واپس اپنی جگہ پر موجود تھی۔ فرحان کی نظروں میں اپنی ساکھ کو بہتر بنانے کیلئے اُس نے آسان ترین آپشن کا انتخاب کیا تھا۔ دوسرے کو ناکام بنانے کا۔

...۞...

رات کو اینگزائٹی اٹیک دوبارہ نہیں ہوا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ جیل کے معمول کا عادی ہو چکا تھا۔ اب دن گن گن کر نہیں پیر کے دن کے انتظار میں گزرتے تھے۔

اس کی سوچ کے زاویے روشن ہو رہے تھے لیکن جتنا طویل اور کٹھن سفر طے کر کے وہ آ گیا تھا وہاں سے پلٹنا اور ایک نئے نقطہ نظر کے ساتھ چیزوں کا آغاز کرنا نہ صرف ایک جھنجھلا دینے والا عمل تھا بلکہ اس کی انا بھی اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ جس چیز کو پرکھ کر اور چھان پٹک کر اپنی عقل پر چاہے وہ معلومات کا کمزور ترین ذریعہ ہی کیوں نہ ہو پورا بھروسہ کر کے وہ رد کرتا آ رہا تھا اب کیونکر اس کی طرف لوٹ جائے۔ یہ سودا اس نے سب کچھ لٹا کر کیا تھا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ دماغ بس ایک کمپیوٹر ہے اور یہ اعضاء اس کے پرزے۔ جب ایک ایک کر کے یہ شٹ ڈاؤن ہو جائیں گے تو اس بے کار اور ٹوٹے پھوٹے کمپیوٹر کے لیے کوئی بعد کی زندگی نہیں۔ یہ بس اندھیرے سے خوفزدہ لوگوں کے لیے ایک پریوں کی کہانی ہے۔ میں ایمل سے ضرورت سے زیادہ ہی متاثر ہو رہا ہوں۔ صرف اس کی گول مول باتوں میں الجھ کر میں اپنا سکون نہیں برباد کر سکتا۔''

اسفر نے خود کلامی کی اور اپنے سیل میں ہلکی پھلکی ورزش میں مصروف ہو گیا۔ آج کل وہ اپنی صحت پر خاص دھیان دے رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی فیلڈ سے متعلق کتب کا مطالعہ کرنا اس کا مشغلہ تھا۔

جو بھی تھا ایمل نے ایک بات بالکل ٹھیک کہی تھی۔ اس کے موجودہ حالات اس کے لیے سنہری موقع ثابت ہو سکتے تھے اور وہ اس وقت کا بھرپور استعمال کرنا چاہتا تھا۔ گو کہ جیل سے باہر نکلنے کے بعد زندگی اور مشکل ہونے والی تھی لیکن حالات سے سمجھوتا کرنا اس نے سیکھ لیا تھا۔

''منزل ہر مرتبہ جگہ نہیں ہوتی کسی نقطۂ نظر کا آغاز بھی ہوتا ہے۔'' ایمل کی کہی ہوئی بات ایک جھماکے سے دماغ میں روشن ہوئی اور وہ جھنجھلائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کمال کا فلسفی تھا۔ اسفر چاہ کر بھی اس کے دلائل کو غلط ثابت نہیں کر پا رہا تھا۔

...۞...

کانفرنس روم کلائنٹس اور آفس اسٹاف سے پُر تھا۔ آج طوبیٰ کو اپنی فائنل پریزینٹیشن دینی تھی جو کمپنی کے لیے نہایت اہم تھی۔ جتنے عرصے میں طوبیٰ نے اپنی کامیابی کا سفر طے کیا تھا وہ غیر معمولی تھا یہی وجہ تھی کہ ذوالقرنین انٹر پرائیز کی امیدیں بھی طوبیٰ سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔

سنعیہ بھی اپنی سیٹ پر براجمان تھی۔ وہ بظاہر بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن دل کے دھڑکنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ چہرے پر میٹھی سی مسکان کے پیچھے طوبیٰ کے نہ صرف بُری طرح ناکام ہونے بلکہ پوری کمپنی کے ساتھ ساتھ کلائنٹس کے سامنے غلط ڈیٹا پیش کرنے کی پاداش میں کمپنی سے نکالے جانے کے بھی بھرپور امکانات تھے۔ ایسے میں نہ صرف سنعیہ سے پرسکون بیٹھنا محال تھا، بلکہ سب کے سامنے بہترین ایکٹنگ کرنا اور آخر میں طوبیٰ سے ہمدردی دکھانا بھی اُس کو خاصہ مشکل نظر آ رہا تھا۔

طوبیٰ ہمیشہ کی طرح پُراعتماد انداز میں سامعین کے سامنے موجود تھی۔ وہ ایک ایک کر کے سلائیڈز پر کلک کرتی گئی اور ڈیمانڈ، سپلائی اور ممکنہ وسائل پر بحث کے بعد اب مؤثر مہم پر سب اپنے اپنے آئیڈیاز پیش کر رہے تھے۔

سنعیہ گم صم اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ ہونّقوں کی طرح طوبیٰ کو نہ صرف صحیح اعداد و شمار پیش کرتے ہوے دیکھ رہی تھی، بلکہ جس طرح اُسے تمام حاضرین کی طرف سے داد و تحسین موصول ہو رہی تھی، وہ سنعیہ کو ایک خواب لگ رہا تھا۔ اِس بات میں فرق کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جو کوشش وہ پچھلے ہفتوں میں کرتی رہی تھی وہ حقیقت تھی یا جو کچھ وہ اب دیکھ رہی تھی وہ سب۔

''سر ڈزنی موووی آج کل بہت ٹرینڈ کر رہی ہے تو ہم بھی فیری ٹیل انداز ہی میں کیوں نہ اپنی مہم

چلائیں۔'' ایک سینئر خاتون کی تجویز پر کچھ لوگوں نے سر ہلا کر تائید کا اظہار کیا۔ رستم جو صدارتی کرسی پر براجمان تھے کوئی تاثرات نہ دیئے۔

''معذرت چاہوں گی لیکن آج کی لڑکی کسی فیری ٹیل پر یقین نہیں رکھتی۔'' طوبیٰ کی پُر اعتماد مداخلت نے سب ہی کو اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''آج کی لڑکی کہاں کسی پرنس چارمنگ کا انتظار کرتی ہے اور نہ ہی لڑکے ایسی چھوئی موئی لڑکیوں کے دلدادہ ہیں۔ اب تو اپنی پہچان بنانے اور منوانے کا وقت ہے آج کا مرد عورت کو سپورٹ کرتا ہے اور اسے کامیاب دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہ جنریشن زی ہے تو یہ اشتہاری مہم بھی اسی کے مطابق ہونی چاہیے۔''

دوسرے سینئرز نے بھی طوبیٰ کی بھرپور تائید کی اور نئے آئیڈیاز بیان کیے۔ اکثریت ہی طوبیٰ کے موقف کی حامی تھی اور فرحان جو مشکل ہی سے من وعن کسی بات سے راضی ہوتا تھا طوبیٰ سے بھرپور اتفاق کا عندیہ دے رہا تھا۔

''خود اعتمادی اور ذہانت تمہارے سر کا تاج ہیں۔ اور یہی تمہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے طوبیٰ۔'' فرحان دل ہی دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

...۞...

میٹنگ کے برخاست ہونے سے پہلے طوبیٰ نے تمام ہی آفس ممبران کو کلائنٹس کے جانے کے بعد کچھ دیر مزید رُکنے کی درخواست کی۔

"اور بھی کچھ ڈسکس کرنا ہے، مس طوبیٰ۔" رستم نے حیرانگی سے سوال کیا۔

"جی سر، کچھ ہماری اندرونی ڈسکشن ابھی باقی ہے جو میں کلائنٹس کے سامنے نہیں کرنا چاہتی۔"

رستم نے سر ہلا کر رضامندی کا عندیہ دیا۔

طوبیٰ نے ایک گہرا سانس لیا اور آخری سلائیڈ بھی اسکرین پر ظاہر کر دی جس میں جلی حروف میں لکھا تھا۔ "تعاون کے لیے سنعیہ کا خصوصی شکریہ۔"

سب ہی نے حیرت سے سنعیہ کی طرف دیکھا اور اعزاز میں تالیاں بجا دیں۔ سنعیہ کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ سب کچھ مٹھی میں ہو اور پھر کچھ بھی نہ ہو یہ سنعیہ کو آج سمجھ آیا تھا۔ "سنعیہ، آپ طوبیٰ کی ٹیم کا حصّہ بھی نہیں تھیں۔ اِس کے باوجود آپ نے تعاون کیا، یہ بات قابلِ تعریف ہے۔" فرحان نے سنعیہ کی تعریف کی لیکن سنعیہ کی بدلی ہوئی رنگت نے سب ہی کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

"سنعیہ، تُم ٹھیک ہو؟" پاس ہی بیٹھی ایک کولیگ نے سنعیہ کا ہاتھ ہلایا۔ سنعیہ جو بمشکل اپنی سیٹ پر سیدھی بیٹھی تھی، اِک دم چونک گئی۔ خشک ہوتے حلق سے تھوک تک نگلنا مشکل لگ رہا تھا۔

"وہ میں.... سر.... طوبیٰ.... پلیز۔" سنعیہ کا یہ نیا روپ سب کے لیے ہی حیران کُن تھا۔ وہ انتہائی پُر اعتماد اور ہر صورت سے ایک مکمل اور قابلِ تعریف سراپا تھی لیکن اُس کا آج یوں طوبیٰ کے سامنے گھگھیانا سب ہی کے لیے صدمہ کا باعث تھا۔

گھمبیر خاموشی کو فرحان کے موبائل کی گھنٹی نے توڑ دیا۔ فرحان نے فون کان سے لگایا اور ایک پل میں بدلتے لہجے نے سب ہی کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

"کیا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

کانفرنس روم میں چہ مگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ سنعیہ کا دل ڈوب گیا۔ بالآخر فرحان نے سب کے سامنے بم پھوڑا۔ "سنعیہ، طوبیٰ نے آپ کے خلاف شکایت درج کروائی ہے اور آپ پر بدنامی، ہراساں کرنے کا الزام، اور نازک دستاویزات کے ساتھ کھیل کرنے کا الزام ہے جس سے کمپنی کی ساکھ بھی متاثر ہوسکتی تھی۔"

فرحان کا ٹھنڈا لہجہ سنعیہ کے کانوں میں سیسہ اُنڈیلنے کے مترادف تھا۔ اِسی اثناء میں HR سے مسز عندلیب کانفرنس ہال میں داخل ہوئیں اور سنعیہ کو فوری ڈیپارٹمنٹ میں رپورٹ کرنے کا عندیہ دیا۔

سنعیہ اپنی کُرسی میں کچھ اور دھنس گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں اقرار کرتی ہوں میں نے طوبیٰ کے کام کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بس کمپنی میں آگے بڑھنے کی ایک کوشش تھی۔" بمشکل الفاظ سنعیہ کے منہ سے ادا ہو رہے تھے۔

طوبیٰ کی آنکھوں میں تاسف عود آیا۔ وہ سنعیہ کو سزا دینا چاہتی تھی لیکن اُسے لگا کہ اپنی عزّت بچانے اور معاملے کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے شاید اُس نے زیادہ ہی کڑی سزا کا اہتمام کرلیا تھا۔

"سنعیہ، کسی کی ساکھ اور کیریئر کو برباد کرنے کو تُم ایک آگے بڑھنے کی کوشش کا نام دے رہی ہو؟" طوبیٰ کو حقیقی دُکھ ہوا۔ "اگر میں اپنا ڈیٹا ہر مرتبہ دو جگہوں پر محفوظ نہ کرتی تو مجھے کبھی اِس چیز کا ادراک نہ ہوتا۔ اور پھر شک ہوجانے پر ہی میں نے نہ صرف تُم پر نظر رکھی بلکہ سی سی ٹی وی کیمرے سے ثبوت بھی اکٹھے کئے۔ مجھے نہیں یاد میں نے کبھی تمہارے ساتھ کچھ ایسا کیا ہو کہ تم میرے خلاف یہ پروپیگینڈا کرو۔"

سب ہی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔

"یہ مقابلہ نہیں تھا سنعیہ، سراسر دھوکہ تھا۔"

طوبیٰ نے ایک گہرا سانس لیا، "میں کوئی قانونی کارروائی نہیں چاہتی سر۔" مخاطب اب فرحان اور رستم تھے۔ "لیکن میں بار بار ایک ہی محاز پر لڑ کر اپنی توانائی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، اسی لئے مجھے یہ بولڈ اسٹیپ لینا پڑا۔"

"بھلے ہی آپ قانونی کارروائی نہیں چاہتیں، لیکن کمپنی کے بھی کچھ قوانین ہیں۔ مِس سنعیہ آپ کا رویہ نا قابلِ قبول ہے اور اِس کے خلاف مطلوبہ کارروائی بھی کی جائے گی۔" فرحان نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ سنعیہ کو لگا اُس کے ہر طرف تاریکی ہے۔ جس لڑکی کو وہ پیادہ سمجھ رہی تھی وہ شطرنج کی بساط کی رانی تھی۔

...۞...

وقت پر لگا کر اُڑ گیا۔ زندگی ایک ڈگر پر چلی جارہی تھی۔ صدیق کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں تو موضوع گفتگو زیادہ تر خریداری ہی ہوتا۔ آج بھی جب وہ آفس سے گھر پہنچی تو آسودہ ماحول دیکھ کر ایک تمکنت اس کے دل میں اُتر آئی۔ لیکن کچھ عرصے سے رضیہ کو طوبیٰ کو خوش وخرم دیکھ کر بس ایک ہی بات یاد آتی تھی جو آج پھر سب کے سامنے دہرائی گئی۔

''اب بس اللہ تمہیں بھی اپنے گھر کا کر دے۔''

طوبیٰ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ پہلے بھی ان گنت بار یہ موضوع چھیڑا جا چکا تھا کبھی کھانے کی میز پر، کبھی کوئی شادی کا کارڈ پڑھتے وقت، کبھی کسی کے گھر پیدائش کی مٹھائی کھاتے وقت اور تو اور سر بازار عروسی لباس دیکھ کر۔

''مجھے شادی نہیں کرنی امی۔'' اس نے پرس ایک کنارے رکھتے ہوئے کہا اور لاؤنج میں رکھے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی صدیق کی دلہن کے بری کے جوڑے پھیلے ہوئے تھے۔

''کیوں نہیں کرنی؟ پڑھ لکھ لیا، دو سال نوکری بھی کر لی۔ اب شادی کی عمر ہے۔ عمر نکل گئی تو کوئی نہیں پوچھتا۔''

''ہو تو رہی ہے صدیق بھائی کی شادی۔ آپ بس خوب خوشیاں منائیں۔'' طوبیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ تو بیٹا ہے۔ بیٹی کے شادی کے ایک الگ ارمان ہوتے ہیں۔'' رضیہ بھی ہار ماننے والی نہ تھیں۔

''ویسے یہ ماں باپ بھی بڑے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ ساری زندگی اپنی جس تخلیق کو زمانے کے سرد و گرم سے بچا کر رکھتے ہیں۔ عین شباب میں اس کو کسی دوسرے کے ہاتھوں سونپ دیتے ہیں۔ اب وہ اس نازک کلی کو مسل ڈالے یا محبت سے سینچے کس کو خبر..... جوئے کی بازیوں میں سب سے بڑی یہ شادی کی بازی ہے۔ جہاں انسان اپنی ساری پونجی بلائنڈ کھیلنے کے لیے مچلتا رہتا ہے۔''

طوبیٰ اپنی رو میں بہتی کہتی ہی چلی گئی۔

''بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو عقلِ کل سمجھنے لگتے ہیں اپنے آپ کو۔'' رضیہ خفا ہو کر بڑبڑانے لگیں۔ طوبیٰ کی بے تکی باتوں کا اُن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ ''ایسے تھوڑی نہ گزرتی ہے زندگی۔''

''ارے امی! شادی بس زندگی کا ایک حصہ ہے، پوری زندگی نہیں ہے۔'' طوبیٰ نے ایک آخری کوشش کی۔ اس موضوع سے وہ جتنا بھاگتی تھی اتنا ہی رضیہ کے لیے یہ موضوع پسندیدہ ترین تھا۔

رضیہ سخت ناراض ہو کر خاموشی سے احتیاط کے ساتھ جوڑے طے کر کے رکھنے لگیں۔ طوبیٰ نے

ندامت سے اپنے ہونٹ کاٹے

''کیا ہی اچھا ہوتا جو کان دبا کر سن لیتی۔'' لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

''امی میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ آپ جانتی ہیں میں ابھی اس لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ کا اگر اتنا دل تو آپ رمشہ کی شادی کر دیں'' طوبیٰ نے رضیہ کے گرد اپنے باز وحمائل کیے۔

''بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کی شادی کر دوں؟'' رضیہ نے غصے میں آنکھیں نکالیں۔

''اچھا سوری!'' جس لفظ سے طوبیٰ کو سخت الرجی تھی آخر وہی اس کو کہنا پڑا۔

''کیا فائدہ ایسے سوری کا جب تم نے اپنی ہی من مانی کرنی ہے۔'' رضیہ کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا اور اب وہ غصے میں رمشہ کو آوازیں لگا رہی تھی۔

رمشہ کمرے سے دوڑی آئی ''کیا ہوا امی؟'' آج کل اس کے امتحانات جاری تھے اور وہ اپنے پڑھائی میں مصروف تھی۔

''یہ کپڑے لے جا کر احتیاط سے الماری میں رکھ دو۔ اور میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو۔ میرے سر میں درد ہے۔''

''میں بناتی ہوں چائے۔'' طوبیٰ نے رضیہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے'' رضیہ نے اُسے گھرکا ''تم بس اپنی من مانی کرو۔ رمشہ ہی کر دے گی میرا کام۔''

رمشہ ہنستے ہوئے باورچی خانہ کی طرف بڑھ گئی۔

''اچھا تو پھر.....'' طوبیٰ سوچ میں پڑ گئی کہ اب وہ ایسا کیا کہے کہ رضیہ اس کی شادی کا مدعا بھول جائیں۔

''پھر کچھ نہیں سننا مجھے۔ چوبیس کی ہو چکی ہو اب وقت ہے ہم تمہیں زندگی میں settle دیکھیں۔''

''امی اور کتنا settle دیکھنا چاہتی ہیں آپ مجھے؟''۔ طوبیٰ نے ایک بار پھر رضیہ کو رام کرنے کی کوشش کی۔ ''اچھی جاب ہے، اب تو مجھے گاڑی کے لیے علیحدہ الاؤنس بھی ملنے لگا ہے، آپ اور ابو

ہیں میرے پاس اور مجھے کچھ نہیں چاہئے زندگی میں۔''

''ہم ساری زندگی ساتھ نہیں رہیں گے بیٹا!'' رضیہ اب غصے میں اُٹھ کر کنارے رکھے دھلے ہوئے کپڑے طے کرنے میں لگ گئیں۔''میں نے صوفیہ کو بولا ہے لڑکے کے گھر والوں کو لے آئیں اس اتوار۔صیف بنک میں کام کرتا ہے۔اچھی پوسٹ پر ہے۔ایک بہن اور ایک بھائی۔خاندان بھی اچھا ہے۔''

رضیہ جس روانی سے جھٹک جھٹک کر کپڑے طے کر رہی تھیں اُسی روانی سے بولتی جا رہی تھیں بنا دیکھے کہ پیچھے گنگ بیٹھی طوبیٰ صیف سے آگے کچھ نہ سُن سکی تھی۔

...۞...

پندرہ سال پہلے طوبیٰ کو روبی کسی افسانے کے ہیروئن لگتی تھی جو انتہا کی جاذبِ نظر اور جامہ زیب بھی۔ جب ہر صبح وہ اپنا پرس اور دوپٹا سنبھالتی گھر کو تالا لگاتی تو جیسے طوبیٰ کے دل پر ایک مہر ثبت ہو جاتی تھی کہ یہ اس کا مستقبل ہے۔

جب وہ چابیوں کے گچھے میں سے دو انگلیوں کے بیچ گاڑی کی چابی دبائے آگے بڑھتی تو طوبیٰ کے ہاتھ غیر اختیاری طور پر گاڑی کے دروازے میں چابی گھما رہے ہوتے۔ کالا چشمہ آنکھوں پر ٹکائے سیٹ بیلٹ لگاتے وہ اسے بالکل انگلش فلموں کی ہیروئن لگا کرتی تھی۔ طوبیٰ کو مکمل طور پر اپنی شخصیت میں اتار لینے کی تمام خوبیاں روبی میں موجود تھیں۔

''السلام علیکم....'' بڑے ہی پیار سے کئے گئے سلام کے جواب میں ایک دن طوبیٰ مبہوت سی رہ گئی تھی۔ ہلکے اور گہرے نیلے رنگ کا یونیفارم پہلے اور اس پر پونی ٹیل۔ روبی بھی اتفاق سے ہلکے اور گہرے رنگ کے امتزاج کا ایک خوبصورت اور جدید فشنی جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ طوبیٰ کو ایک دم ہی فخر محسوس ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام....'' طوبیٰ کے اندر ایک دم ہی اعتماد عود آیا تھا۔ اسے اپنا آپ روبی سے بس کچھ ہی کم لگا۔ وہ بھی نک سک سے تیار ہو کر نفاست سے بال سنوارے اسکول وین کا انتظار کر رہی تھی جبکہ روبی اپنے آٹھ سالہ بیٹے کا ہاتھ تھامے گھر سے نکلی تھی۔

''آل ریڈی ٹو گو ٹو اسکول؟'' روبی کے منہ سے انگریزی بھی پھولوں کی طرح جھڑ رہی تھی۔

''یس'' طوبیٰ بس اتنا ہی جواب دے پائی۔ روبی نے کار کا دروازہ کھولا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ نیلی پری اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جا چکی تھی۔ سارا دن طوبیٰ اسی خمار میں رہی کہ اس نے روبی کے ساتھ پورے اعتماد سے بات کی تھی۔ اپنے لیے روبی کی ستائشی نظریں اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھیں۔

بس ایک ہی ہفتہ تو گزرا تھا اس بات کو جب صبح ہی صبح ایک دن گلی میں نامانوس ہلچل تھی۔رضیہ ابھی ابھی بدحواسی کے عالم میں گھر میں داخل ہوئی تھیں۔لوگوں کا ہجوم روبی کے گھر کے باہر جمع تھا۔طوبیٰ آنکھیں ملتی داخلی دروازے تک آئی تو رضیہ نے اِک دم ہی دروازہ بند کر دیا۔

''کیا ہوا امّی؟'' آج آپ نے مجھے اٹھایا نہیں مجھے اسکول سے دیر ہو جائے گی۔''

''آں..... ہاں بس جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ میں دودھ دے دیتی ہوں۔''

طوبیٰ نے بغور جائزہ لیا'' آپ نے میرا ٹفن بھی نہیں بنایا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں وہ بس آج نہیں بنایا.....تم جاؤ تیار ہو جاؤ میں گلی کے کونے تک چھوڑ آتی ہوں۔''

رضیہ نے باورچی خانے میں سلیپ کے اوپر رکھے ایک پلاسٹک کے ڈبے میں سے بیس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور طوبیٰ کی طرف بڑھا دیا''یہ لو کینٹین سے کچھ لے کر کھا لینا۔''

رضیہ کی عجلت اور حرکات میں اِک عجیب سی پریشانی تھی۔

طوبیٰ حیرانی سے واپس مڑ گئی۔جب تیار ہو کر گھر سے باہر نکلی تو تقریباً گلی کے سارے لوگ روبی کے گھر کے آگے موجود تھے۔

''یہاں کیوں کھڑے ہیں سب لوگ؟'' اس نے خود کلامی کی۔اسے امید تھی ہمیشہ کی طرح رضیہ اس کی خود کلامی کا جواب دیں گی لیکن جب وہ تیز قدموں سے گلی کے کونے کی طرف بڑھیں تو طوبیٰ کو سچ مچ احساس ہوا کہ شاید کچھ بہت مختلف ہوا ہے جو آج تک نہ ہوا تھا تب ہی تو رضیہ جو کبھی دروازے پر بھی صبح چھوڑنے نہ آتی تھیں آج اسے گلی کے کونے تک لے جا رہی تھیں۔

''امی وین اندر آ جائے گی۔'' طوبیٰ نے رضیہ کو اطلاع دی۔

''ہاں.....آج نہیں آئے گی۔'' رضیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''اتنا رش کیوں ہے روبی باجی کے دروازے کے باہر؟'' طوبیٰ نے پھر امّی سے پوچھا۔

رضیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح پلک جھپکتے وہ طوبیٰ کو وہاں سے لے کر غائب ہو جاتیں، روبی سے طوبیٰ کو کس قدر لگاؤ تھا، اس بات سے وہ بخوبی واقف تھیں اسی لیے رضیہ نے اسی میں عافیت جانی

کے جلد از جلد طوبیٰ کو وہاں سے لے جایا جائے۔ بھلا جو کچھ روبی کے ساتھ ہوا تھا وہ معصوم جانوں کو بتا سکتی تھیں؟ صبح ہی صبح جو منظر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی تھیں اس نے انہیں حواس باختہ کر دیا تھا۔

''روبی کا قتل ہو گیا ہے۔'' یہ بات اکبر نے عین اس وقت بتائی جب وہ فجر کی نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھیں۔

''کیا؟'' رضیہ ایک لمحے کو سکتے میں آ گئیں۔''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے رضیہ ہکا بکا کھڑی تھیں۔

''اس کے شوہر نے قتل کر دیا ہے اُسے؟''

''یا خدا.....'' رضیہ کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ نماز کی ادائیگی کے دوران ہی دروازہ زور سے بجا تھا اور اس انہونے وقت پر انہونی دستک نے نماز میں بھی رضیہ کا دل دہلا دیا تھا۔ بھلا اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ اکبر کہتے ہوئے دروازہ کھولنے چلے گئے تھے اور رضیہ جلد از جلد نماز ختم کر کے اکبر کی طرف متوجہ ہونے ہی والی تھیں۔ جب اکبر نے یہ خبر ان کو سنائی تھی۔

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" رضیہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ ایسی بات ہے کیا کہ اس پر مذاق کیا جائے؟" اکبر نے سنجیدگی سے کہا "تم ٹھہرو میں دیکھ کر آتا ہوں، اسلم صاحب آئے تھے اطلاع دینے غالباً پولیس کو فون کیا ہے۔''

رضیہ کا وہ حال تھا گویا کاٹو تو جسم میں لہو نہ ہو۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے طوبیٰ کے ہاتھوں انہوں نے کڑ ہی چاول بھجوائے تھے اور وہ خود شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔

''ناس ہو اس کمبخت کا جس نے ایسی قابل عورت کی قدر نہ کی۔'' رضیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ صیف کا اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیں، نادانستہ طور پر وہ بھی اکبر کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔''تم رُکو گھر پر۔'' اکبر نے تشویش سے رضیہ کو دیکھا۔

''نہیں، میں بھی آ رہی ہوں۔'' رضیہ یہ کہتے ہوئے اکبر سے پہلے دروازے سے باہر تھیں۔ اکبر عجلت

میں پیچھے لپکے،لیکن رضیہ بجلی کی تیزی سے ہجوم کو چیرتی ہوئی روبی کے گھر میں داخل ہو چکی تھیں۔ نفاست سے سجا ہوا چھوٹا سا گھر کسی جنت کا نظارہ پیش کرتا اگر دو میں سے ایک خواب گاہ میں سے خون کی بو نہ آ رہی ہوتی۔

رضیہ کو ایک دم ابکائی آئی، چند عورتیں منہ پر دوپٹہ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بے جان لاشے کو دیکھ رہی تھیں جس کو کبھی حسرت سے دیکھا کرتی تھیں، اور رشک کیا کرتی تھیں، آج وہ حسین سراپا خون میں لت پت بے ترتیب بستر پر پڑا تھا۔ سلمٰی خالہ جو کہ محلے بھر کی بزرگ تھیں، وہاں موجود ہاتھ اٹھا اٹھا کر صیف کو بددعائیں دے رہی تھیں۔ بظاہر کمرے میں ہر چیز ترتیب سے رکھی تھی سوائے ایک سائیڈ لیمپ کے جو زمین پر گر کر ٹوٹ چکا تھا اور بستر پر پڑی بے شمار سلوٹیں جو اس بات کا ثبوت تھی کہ روبی نے خاصی مزاحمت کی تھی۔

باورچی خانے میں استعمال ہونے والی سب سے بڑی چھری سینہ اور پیٹ کے بیچ میں اندر تک گھنپی ہوئی تھی اور بستر سارا خون جذب کر چکا تھا۔ روز صبح جو چند بالوں کی خوبصورت لٹیں دوپٹے کے ہالے سے باہر جھانکتی تھیں، آج آزادانہ چہرے پر پڑی تھیں۔ وہ آنکھیں جو کالے چشموں کے پیچھے سے ہی نہ جانے کتنے دلوں کو لبھا لیا کرتی تھیں۔ آج پتھرائی ہوئی چھت کو تک رہی تھیں۔ جسم پر پڑی چادر بھی اب خون سے تر ہو چکی تھی جو اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ وار صرف ایک بار نہیں کیا گیا تھا۔

''ہائے! خدا غارت کرے صیف تجھے، کیسے ایک سلیقہ شعار لڑکی کا کام تمام کر دیا۔ معصوم بچے سے ماں چھین لی، توبہ توبہ ایسے آدمی سے کبھی دشمن کا بھی پالا نہ پڑے!'' سلمٰی خالہ کا بین زور وشور سے جاری تھا۔

''ارے جاوید تو نماز کے لیے اٹھنے ہی والے تھے کہ اچانک چیخنے کی آوازیں آئیں۔ پہلے گھر کے اندر سے اور پھر.....'' بتول جو روبی کے بالکل سامنے والے گھر میں رہا کرتی تھی کانوں کو ہاتھ لگا کر پوری تفصیل بیان کر رہی تھی۔

'' ارے لڑکا ایسے چلّا رہا تھا اور بھرا جا رہا تھا جاوید نے خود دیکھا۔'' بتول کا انگ انگ بول رہا تھا۔

''چلّا رہا تھا، مما کو مار دیا، بابا نے مما کو چھری سے مار دیا۔'' تب ہی جاوید کو دیکھتے ہی صیف نے زبردستی ریّان کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور یہ جا وہ جا۔'' بتول اپنے گال پر ہاتھ رکھے اب بھی تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔

سب اب کمرے سے باہر آ چکے تھے اور پولیس کو فون کیا جا چکا تھا۔ رضیہ کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا.....طوبیٰ۔ رضیہ بھاگم بھاگ گھر پہنچیں تو طوبیٰ جاگ چکی تھی۔ وہ اس کو گلی کے کونے تک چھوڑ کر واپس روبی کے گھر پر موجود تھیں، طوبیٰ کس قدر روبی پر فریفتہ تھی، یہ رضیہ تو کیا پورا محلہ جانتا تھا۔ اس کی ہر بات روبی سے شروع روبی پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔

روبی کے سراپے سے لے کر اس کے اٹھنے بیٹھنے کے طریقے تک طوبیٰ نقل کیا کرتی تھی۔ محلے کی کچھ خواتین خوش تھیں کہ ایک مثالی شخصیت محلے میں آ بسی تھی جس کا حوالہ دے کر وہ اپنی لڑکیوں کو روشن مستقبل کے خواب دکھا سکتی تھیں اور وہیں قریباً ہم تعداد وہ خواتین بھی تھیں جو روبی کو صبح ہی صبح آفس جاتا دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیا کرتی تھیں۔

'' دیکھ لو میم صاحبہ کو، سواری نکل پڑی ہے۔''

''ہماری تو بچیاں گھر داری چھوڑ کر ایسے ہی خواب دیکھنے لگی ہیں۔''

''ایسی عورتوں کی پرچھائی سے بھی دور رکھوں میں تو اپنی بیٹی کو، نہ جانے کن غیر مردوں کے بیچ کام کرتی ہوگی۔''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور آج بھی حال کچھ ایسا ہی تھا کوئی صیف کو کوس رہا تھا تو کوئی اس کے جرم کی دلیلیں دے رہا تھا۔

''کیا پتا کیوں مارا۔ کوئی غیرت کا معاملہ بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ہاں سچ کہتی ہو ورنہ کوئی کیوں بلاوجہ ایسی بیوی کو خراش پہنچائے۔''

''اسی لیے کہتی ہوں عورتوں کو گھر داری سنبھالنی چاہیے، نہ دوسرے جھمیلے پالیں نہ یہ سارے مسئلے ہوں۔''

رضیہ گال پر ہاتھ رکھے سُن سی کھڑی تھیں۔ نہ جانے کتنی ہی دیر وہ کھڑی رہیں اور جب پولیس کے سائرن کی آواز پر پلٹیں تو پاؤں تلے زمین باقی نہ تھی۔

سامنے طوبیٰ کھڑی تھی۔ بے حس وحرکت دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

''طوبیٰ!'' سرگوشی ہی برآمد ہوئی۔ ''تم اسکول کیوں نہیں گئیں؟ میں تمہیں گلی کے کونے پر چھوڑ کے آئی تھی۔'' رضیہ کے الفاظ حلق میں پھنس رہے تھے۔

طوبیٰ کی نظریں ابھی تک روبی کے بے جان سراپے پر جمی تھیں۔ وہ آج بھی طوبیٰ کو اتنی ہی حسین لگی جتنی ہمیشہ لگا کرتی تھی۔ غیر معمولی..... بالکل منفرد.....جیسی زندگی تابناک..... ویسی ہی موت بالکل افسانوی۔

''امی آج وین والے نے چھٹی کر لی۔'' طوبیٰ نے بالکل عام سے لہجے میں جواب دیا۔ ہاں نظریں روبی کے پیٹ میں گھسے چھُرے پر ہی جمی تھیں۔

رضیہ نے طوبیٰ کا ہاتھ پکڑنا چاہا،لیکن طوبیٰ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ رضیہ غصے اور جھنجھلاہٹ کی ملی جلی کیفیت سے طوبیٰ کو دیکھتی رہیں۔ ''طوبیٰ چلو گھر!'' رضیہ نے سختی سے کہا طوبیٰ مشینی انداز میں قدم آگے بڑھانے لگی۔

''ارے روکو اس لڑکی کو!'' خالہ نے آواز لگائی اور کئی ایک خواتین طوبیٰ کو پکڑنے آگے بڑھیں لیکن ایک چھوٹی بچی نہ جانے کیسے کسی کو کندھے پر ہاتھ بھی نہ رکھنے دے رہی تھی۔

''چلو سب باہر کنارے ہو جاؤ۔'' ایک کرخت آواز نے تمام خواتین میں ہلچل مچادی اور سب ایک کونے میں سمٹ رہیں، بھاری جوتوں کی آواز کے ساتھ ہی چار پولیس والے کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔

''سب باہر نکلو ورنہ شہادت خراب کرنے کے جرم میں اندر ہو جاؤ گے۔''

ایک اور کرخت آواز گونجنے پر خواتین تیزی سے باہر سرکنے لگیں۔ رضیہ نے ایک بار پھر جھپٹ کر طوبیٰ کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ لڑکی کسی اور ہی اثر میں تھی۔ رضیہ کا ہاتھ جھٹک کر اب وہ بالکل روبی کے لاشے

کے ساتھ کھڑی تھی۔

''طوبیٰ!'' اب کہ رضیہ غرّائیں، لیکن روبی کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

''کس کی بچی ہے ہٹاؤ اس کو .....'' ایک بار پھر درشت آواز آئی۔طوبیٰ نے ہاتھ بڑھا کر روبی کی انگلیوں کو مس کیا۔ وہ محسوس کرنا چاہتی تھی کہ اس کی آئیڈیل جیتی جاگتی بار بی ڈول حقیقت ہے یا افسانہ بن چکی ہے۔سرد جسم نے طوبیٰ کے جسم میں ایک کرنٹ سا پیدا کیا اور اسی لمحے ایک سخت گرفت نے اُسے شانے سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔طوبیٰ لڑکھڑا کر گر پڑی اور ایک دم جیسے اپنے حواس میں واپس آ گئی۔

رضیہ قریباً گھسیٹتے ہوئے اسے کمرے سے باہر لے آئی تھیں۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھیں جب سارا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی جستجو میں وہ طوبیٰ کو گلی کے کونے پر اکیلا چھوڑ آئی تھیں اگر وہ وہاں تھوڑی دیر رک جاتیں تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔

طوبیٰ بھی ایک بے جان لاشے کی طرح گھسٹتی آئی۔ بالآخر دروازے کے قریب اس نے اپنی ٹانگوں میں جان محسوس کی اور لڑکھڑاتے قدموں سے آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

گھر کی چوکھٹ پار کرتے ہی رضیہ نے ایک زوردار تھپڑ طوبیٰ کے منہ پر جڑ دیا۔

''کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی۔ وین نہیں آئی تھی تو سیدھا گھر آنا چاہیے تھا۔'' زندگی میں یہ پہلی بار تھا جو رضیہ نے طوبیٰ کے اوپر ہاتھ اٹھایا تھا۔ بے بسی کی شدت سے رضیہ کا جسم کپکپا رہا تھا۔طوبیٰ ہکا بکا کھڑی تھی۔صبح سے سب کچھ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ ابھی تو وہ اس صدمے سے بھی نہ نکلی تھی کہ جو نظارہ اس نے دیکھا تھا وہ خواب تھا یا حقیقت، کہ ایک اور سانحہ اس کے ساتھ ہو گیا تھا۔اُسے احساس ہوا کہ شاید کوئی قبیح جرم تھا جو اس سے سرزد ہو گیا تھا۔رضیہ اب طوبیٰ کو اپنے سینے سے چمٹائے کھڑی تھیں اور خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔

طوبیٰ اب بھی کسی بت کی طرف خاموش کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ اپنے تمتماتے گال سے زیادہ اس لمس کا اثر محسوس کر رہے تھے جو روبی کی انگلیوں کو اپنی پوروں سے مس کرنے کے بعد اُسے ملا تھا۔

''کیا ہوا طوبیٰ کو؟'' اکبر کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر رضیہ جیسے اپنے ہوش وحواس میں واپس آئی۔ کچھ نہیں بس کچھ گھبرا گئی جو وین نہیں آئی۔''

رضیہ نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ان کو یہ سوچ ہی کھائے جا رہی تھی کہ طوبیٰ اس سارے سانحے پر کیا ردعمل دے گی۔ گو کہ روبی اُن کی صرف ایک پڑوسن تھی لیکن محلے کی تمام خواتین کے اوپر جو گہری دھاک بٹھائی تھی اس سے وہ قطعاً انکار نہ کر سکتی تھیں۔ دن بھر اچھے یا برے، یا نئے و پرانے اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لیے ہر عورت روبی کا ذکر کئی بار کرتی تھی اور بچیوں کو تو اس سے جیسے ایک عقیدت تھی۔

''چلو میں تمہارا یونیفارم بدلوا دوں۔'' رضیہ طوبیٰ کو لے کر بچوں کے کمرے میں آ گئی۔ طوبیٰ ایک میکانکی انداز میں رضیہ کی تمام ہدایات پر من وعن عمل کر رہی تھی۔ تابعدار تو وہ ویسے بھی تھی لیکن آج یہ بات رضیہ کو بہت کھل رہی تھی۔

''ناشتہ لے کر آؤں؟'' رضیہ نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے طوبیٰ سے سوال کیا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' طوبیٰ اپنے بستر کی طرف بڑھ چکی تھی اور رضیہ کو طوبیٰ کی یہ سنجیدہ مزاجی کھائے جا رہی تھا۔

...۞...

رات طوبیٰ کے کمرے سے زور زور سے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رمشہ اور حُسنہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھی تھیں۔ وہ ابھی تک حواس باختہ تھیں کہ ان کے کمرے میں کوئی کیونکر ایسے چلّا رہا ہے جیسے اس کو چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔

طوبیٰ بدستور خوف کے عالم میں بستر پر تڑپ رہی تھی۔ اکبر اور رضیہ بھی اپنے کمرے سے ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے بچیوں کے کمرے میں آئے تھے۔ طوبیٰ اپنے بستر پر مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اس کی دلدوز چیخیں سن کر حُسنہ نے بھی رونا شروع کر دیا تھا اور رمشہ اب کمرے میں کونے میں کھڑی ،عباس اور رضیہ کو طوبیٰ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے دیکھ رہی تھی۔

آج محلے میں ہونے والے دل دوز قتل کو تیسرا دن تھا اور طوبیٰ کی ہسٹریائی حالت کو بھی۔ وہ رات کو کسی بھی وقت بے تحاشہ چلّانا شروع کر دیتی اور بے تحاشہ جھنجھوڑنے پر بھی اس کیفیت سے باہر نہ آتی۔ اب کی بار تو اس کے ہاتھ پاؤں بھی مڑنے لگے تھے اور وہ اکڑ کر کسی لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی۔

رضیہ کے تو ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے اور عباس کے لیے اتنی سی بچی کو اکیلے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

طوبیٰ کی چیخیں سن کر صدیق اور اصغر بھی دروازے پر پہنچ چکے تھے اور بے بسی سے عباس کو طوبیٰ کو سنبھالتے دیکھ رہے تھے۔

''صدیق، ایمبولینس بلاؤ۔ فوراً اکبر کی آواز کے ساتھ ہی صدیق نے مستعدی سے ایمبولنس کو کال کی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں سائرن بجاتی سفید اایمبولینس دروازے پر موجود تھی اور آدھے محلے والے اس کے آس پاس جمع تھے۔ چھوٹے محلے میں لوگوں کے دل ایک دوسرے کے لیے ہی دھڑکتے تھے۔ منٹوں میں ہی بے جان لاشے کی طرح پڑی طوبیٰ کو عباس، رضیہ اور پڑوس والے مولوی بھائی جان کی معیت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

ایمرجنسی وارڈ میں ہاؤس جاب کرنے والے دو ڈاکٹر موجود تھے۔ جو ممکن تھا وہ علاج مہیا کرنے کے بعد سینئر ڈاکٹر کو کال ملائی جا چکی تھی اور فون پر رابطے کے باعث مطلوبہ انجیکشن بھی طوبیٰ کو دیے جا چکے تھے۔ وہ اسٹریچر پر ابھی بھی بے سُدھ پڑی تھی اور اب کچھ وقفے کے بعد اس کے جسم میں ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔

''میری بچی!'' رضیہ منہ پر دوپٹہ رکھے روئے جا رہی تھیں اور ایک ہی بات ان کی زبان پر تھی۔ ''روبی کے جانے کا صدمہ لے لیا میری بچی نے۔ خدا غارت کرے صیف کو، نہ جانے کتنوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں اس نے۔''

''ہوش کرو رضیہ!'' اکبر نے دھیمی آواز میں سرزنش کی۔''ہسپتال ہے یہ دوسرے مریض بھی ہیں۔''
رضیہ کی آہ وزاری اب سسکیوں میں بدل چکی تھی اور جتنی سورتیں یاد تھیں پڑھ پڑھ کر اب وہ طوبیٰ پر دم کر رہی تھیں۔
پچیس منٹ بعد ایک سینئر ڈاکٹر ہسپتال میں موجود تھا۔ غالباً اس کو نیند سے جگایا گیا تھا تب ہی آنکھیں گھر سے ہسپتال پہنچنے تک بھی ہلکی سرخ تھیں۔
پپوٹے اُٹھا کر آنکھیں چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر اب طوبیٰ کی نبض چیک کر رہا تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز سے لمبی گفت وشنید کے بعد بالآخر وہ اکبر صاحب کے سامنے موجود تھا۔
''کب سے دورے پڑ رہے ہیں بچی کو؟'' ڈاکٹر نے بڑے ہی پروفیشنل انداز میں پوچھا۔
''بس یہی تین دن سے۔'' عباس نے آہستگی سے جواب دیا۔
ڈاکٹر نے چونک کر عباس کو دیکھا۔
''کوئی فیملی ہسٹری؟''
''بالکل بھی نہیں۔'' اکبر نے فوری تردید کی۔''طوبیٰ ایک صحت مند بچی ہے۔ شاذونادر ہی بیمار ہوتی ہے۔ لیکن تین دن پہلے.....''
اکبر کہتے کہتے حلق میں آئے آنسوؤں کے گولے کو نگلنے کی کوشش کرنے لگے، تو ڈاکٹر نے اکبر کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ مرض کی صحیح تشخیص کے لیے تمام صورتحال کا جاننا ضروری تھا۔ رضیہ طوبیٰ کے سرہانے بیٹھی رہیں۔ طوبیٰ کا جسم اب دواؤں کے زیر اثر تھا اور پُرسکون بھی۔

...۞...

قید میں اُسے تین ماہ گزر چکے تھے اور ان تین ماہ میں اس نے اپنی زندگی کا ایک طویل سفر طے کر لیا تھا۔ بے سکونی ابھی بھی اس کا مقدر تھی لیکن وہ جان چکا تھا کہ اپنے جذبات کو اس نے کب اور کن راستوں سے ہموار کرنا ہے۔ وہ اپنی پچھلی چار سالہ زندگی کے بارے میں سوچتا تو سفر اُسے بہت طویل لگتا۔ اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سودا کیا تھا لیکن اچھا یا برا، ایمل کی باتوں نے اُسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اپنی ہار تسلیم کرنے کو وہ کسی صورت تیار نہ تھا سو ایک بار پھر وہ ایمل کے سامنے موجود تھا۔

ان اٹھارہ، بیس لوگوں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو خدا پر یقین نہ رکھتا ہو ان سب کو اندھا یقین تھا کہ یہ کائنات کسی کی تصنیف ہے، اسفر وہ واحد شخص تھا جو ہر بار دلائل دیتا، نئی سے نئی، ٹیکنالوجی پر بات کرتا لیکن ایمل کے پاس گویا ہر بات کا حوالہ موجود تھا۔

''بگ بینگ تھیوری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' اسفر نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اچھی تھیوری ہے، لیکن اس میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہے۔''

اسفر ایک لمحے کو بھونچکا رہ گیا تھا اور پھر ایمل کی بات سے خاصہ محظوظ ہوتے ہوئے کہا،

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں کہ اس تھیوری کے آنے سے پہلے ہی آپ جانتے تھے کہ دنیا ایک دھماکے کی صورت میں پیدا ہوئی ہو۔ مادّے کے پھیلاؤ کی وجہ سے۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی اسفر کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ وہ اب زچ ہونے لگا تھا۔ اس کی ساری معلومات ساری ریسرچ ایمل کے فلسفے کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی تھی۔

''اسفر! صرف مجھے ہی نہیں یہ بات اَن گنت لوگوں کو پتا تھی کہ پہلے کائنات سمٹی ہوئی تھی پھر کسی وجہ سے وہ پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔''

اسفر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا ''آپ کا اشارہ کہیں آسمانی کتابوں کی طرف تو نہیں ہے کہ اس میں کسی جانے مانے پیغمبر نے یہ بات بتائی ہو۔''

اسفر کو آج پہلی بار ایمل کا اندازِ گفتگو کچھ مضحکہ خیز لگا۔

ایمل نے اسفر کے چہرے کو انتہائی شفقت سے دیکھا۔ اسفر کو الجھن ہونے لگی۔

وہ اسفر کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کو آئسکریم کھاتا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ پھر اس نے ایک بالکل مختلف لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''جدید فزکس اور اس کی تھیوریز تجرباتی طور پر تصدیق شدہ قوانین کو کالعدم نہیں کرتیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ آنے والی نت نئی تھیوریز کو کچھ خاص حالات کے لیے موزوں قرار دے کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اس کی مثال آئین سٹائن اور نیوٹن کے دیئے گئے قوانین ہیں۔ نیوٹن کے قوانین بھی آئین اسٹائین کی تھیوری کا ایک حصہ ہیں جو کچھ خاص حالات میں کامیاب ہیں ورنہ ناکام۔

''$e=mc^2$ کی مساوات سے تو سب ہی واقف ہیں نا۔ بس ایسی ہی مثال بگ بینگ تھیوری کی ہے۔ ابھی اس میں سب کچھ صحیح لگ رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تھیوری بھی جدید سائنس کا صرف ایک حصہ رہ جائے گی۔ ابھی یہ تھیوری کہتی ہے کہ مادہ دھماکے کے ساتھ وسعت پانے لگا۔ سوال یہ ہے مادہ آیا کہاں سے؟''

سوال براہِ راست اسفر سے تھا۔ وہ ایمل کے کسی پروفیشنل کے سے انداز میں کی گئی جرح کے زیر اثر گنگ بیٹھا تھا۔ یہ ایمل کا انداز گفتگو نہ تھا۔ وہ تو بالکل عام سے انداز میں بات کرتا تھا، عام لوگوں کو سمجھانے کے لیے۔ اس وقت وہ ایک سائنسدان سے محو گفتگو نظر آیا۔

''مادہ پہلے سے موجود تھا۔'' اسفر نے پُراعتمادی سے جواب دیا۔

''اس بات کے کتنے چانسز ہیں کہ مادہ پہلے سے موجود تھا؟'' میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں تھا اور پھر خدا نے مادّہ تخلیق کیا۔'' ایمل کا پرسکون انداز قابل دید تھا۔

''مادہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کا جسم مٹی میں مل کر نئے اجزاء میں بدل جاتا ہے، جس سے پیڑ پودے اُگ جاتے ہیں جو چرند پرند کھاتے ہیں اور پھر ان کو دوسرے جاندار۔ مادہ نہ ہی تخلیق کیا جا سکتا ہے نہ ہی فنا، یہ ناممکن ہے۔''

اسفر کی دلیل پر سب ہی دنگ رہ گئے۔ ان کے پاس بھی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ واحد ایمل تھا جو بدستور پرسکون چہرہ لئے بیٹھا تھا۔ وہی اطمینان جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

''یہ تمہارا مشاہدہ ہے اسفر کہ مادّہ تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے یہ بھی مشاہدہ ہی تھا کہ روشنی صرف دن کے اوقات میں ہوسکتی ہے رات کو نہیں۔ پھر سائنسدانوں نے وہ طریقے ڈھونڈے کہ جب توانائی کو شکل بدل کر رات میں استعمال کریں۔ کئی سو سال پہلے یہ مشاہدہ تھا کہ انسان ہوا میں نہیں اُڑ سکتا۔ سائنس نے انسان کو اڑنے کے قابل بنا دیا، بالکل اسی طرح یہ بھی مشاہدہ تھا کہ دو الگ شہروں میں بیٹھے لوگ ایک دوسرے کی بات نہیں سن سکتے۔ اس وقت بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔ مجھے امید ہے سائنس ایک دن یہ جواب دے گی کہ اس مادے کا ایک خالق موجود ہے۔ لیکن اس میں ابھی وقت ہے۔''

ایمل خاموش ہو چکا تھا لیکن اسفر کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا سُن ہوتے دماغ کو ٹٹولتا رہا۔

''کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ اس مادے کا کوئی خالق ہے۔'' اسفر کو اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن کا بخوبی اندازہ تھا لیکن اس سے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

ایمل کو ایک دم ہی ہنسی آ گئی لیکن بڑے سوبر انداز میں اس نے اسفر سے کہا ''مجھے معلوم تھا تم یہی کہنے والے ہو۔ میں نے بھی یہی کہا تھا۔ ابھی جو دلائل میں نے تمہیں دیے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں جس چیز کا مشاہدہ نہ کیا ہو وہ غلط ہی ہو۔ جیسے جب بجلی پیدا نہ ہوئی تھی اور اس وقت کوئی شخص آ کر کہتا کہ فلاں جگہ رات کو بھی اجالا رہتا ہے تو سب اسے دیوانہ ہی کہتے۔ اسی طرح کسی چیز کا مشاہدہ اگر آپ نے نہیں کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ممکن ہی نہیں۔''

اسفر کو وہ مونگ پھلی والی بات یاد آ گئی اور یہ بھی کہ ایمل اس سے اس دن کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

''اسفر! عقلمند شخص ہمیشہ محفوظ ترین آپشن کا انتخاب کرتا ہے۔ یا تو اس دن کا انتظار کرو جس دن سائنس یہ ثابت کر دے کہ مادہ تخلیق کیا جا سکتا ہے یا پھر اس خالق کے پیغام پر یقین کر لو۔''

اسفر کا چہرہ دھواں دھواں تھا اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مات کھا جائے گا۔ سب کے کام کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اسفر میکانکی انداز میں جیل کے باورچی خانے میں تمام ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ ایمل کی بات کو رد کرنے کا اب اس کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔

.....۞.....

آج ایک بار پھر اکبر کا گھر ہسٹریائی، چیخوں سے گونج اُٹھا تھا۔ گہری نیند سے اکبر اور رضیہ دونوں ہی ہڑبڑا کر اٹھے تھے اور اپنے دھڑکتے دل پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لمحوں میں خوف کا ایک عفریت ان کو آکسٹوپس کی طرح جکڑ چکا تھا۔

''طوبیٰ....'' اکبر برہنہ پیر طوبیٰ کے کمرے کی طرف بھاگے۔ ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اکبر کو ڈاکٹر کی ہر ہدایت یاد تھی۔

حسب توقع طوبیٰ اپنا پیٹ پکڑ کر چلّا رہی تھی۔ عین اسی جگہ جہاں روبی کو چھری گھونپی گئی تھی۔

''دراصل طوبیٰ روبی سے اتنی زیادہ متاثر تھی کہ اس نے روبی کو اپنا رول ماڈل بنا لیا تھا۔ تصور میں اب وہ اپنے آپ کو روبی ہی سمجھتی ہے جس کو ایک شخص قتل کر رہا ہے۔ وہ اسی کرب سے گزرتی ہے جس سے مقتولہ گزری ہوگی۔ یہ سب دماغ کا کھیل ہے۔ طوبیٰ کو دواؤں کے ساتھ ایک اچھے سائیکاٹرسٹ کی بھی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز آج ایک بار پھر اکبر کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اکبر نے طوبیٰ کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور یہی وجہ تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اِن دوروں کا دورانیہ طویل ہوتا گیا بلکہ کئی سالوں سے تو وہ اب اس سانحے اور اس کے اثرات اپنی بیٹی پر بھلا چکے تھے لیکن آج اتنے سالوں بعد دوبارہ طوبیٰ کو یہ دورہ پڑنا سمجھ سے بالاتر تھا۔

ہسپتال کے سفید بستر پر طوبیٰ بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ صبح کے نو بج رہے تھے اور ساری رات اکبر اور رضیہ نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ پتا نہیں کون سا آنسوؤں کا ذخیرہ تھا جو رضیہ کی آنکھوں میں پوشیدہ تھا جو وہ وقفے وقفے سے آبشار کی مانند بہہ نکلتے تھے۔ اکبر کا جھریوں زدہ چہرہ کچھ اور بوڑھا ہو گیا تھا۔

جوان اولاد کو یوں بے بسی سے تڑپتے دیکھنا ماں باپ کی جھریاں کچھ اور گہری کر دیتا ہے۔

کچھ نہ بولنے کی قسم کھائی رضیہ نے بالآخر اپنے لب کھولنے کا فیصلہ کیا۔

''اکبر، میں نے طوبیٰ سے شادی کی بات کی تھی کل....''

اکبر نے شاکی نظروں سے رضیہ کو دیکھا۔ مضمحل اور ہاری ہوئی وہ عورت جس کے ساتھ زندگی کے شب وسال گزارے تھے کبھی ان سے کوئی بات نہ چھپاتی تھی۔ آج بھی بالآخر چند گھنٹوں کے بعد سچ اس عورت کے لبوں پر تھا۔

''شادی کی بات تو پہلے بھی کئی ایک دفعہ تم اس سے کر چکی ہو اور وہ ہر مرتبہ ہی ٹال دیتی ہے یا صاف انکار کر دیتی ہے لیکن ایسی حالت کی وجہ کیا ہے پھر؟'' اکبر کڑیاں جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''پہلے پہل تو مجھے بھی سمجھ نہیں آیا تھا لیکن اب مجھے سمجھ آ رہی ہے۔'' رضیہ نے جی کڑا کر کے اپنے آنسو پیئے اور جھکے کاندھے حتی الامکان سیدھے کرنے کی کوشش کی۔

''لڑکے کا نام صیف تھا۔''

اکبر اور رضیہ دونوں گنگ بیٹھے تھے۔ ساری گھتیاں سُلجھ چکی تھیں اور کہنے کو کچھ باقی ہی نہ بچا تھا۔

بہت دیر بعد بالآخر اکبر نے خاموشی کو توڑا جو رضیہ کے لیے اعصاب شکن ثابت ہو رہی تھی۔

''تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

اور رضیہ ایک بار پھر مجرموں کی طرح سر جھکائے آنسو بہانے لگیں۔ بوڑھی ہڈیوں میں اب اور دم خم نہیں تھا کہ روز رات کو اپنی جوان جہاں بیٹی کو لے کر ہسپتال دوڑتے رہیں۔

...۞...

آج پیر کا دن تھا۔ ایمل حسب معمول جیل خانے کے مرکزی میدان میں موجود اسی بوسیدہ کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا جو اب اس کی ذات کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ اسفر ہمیشہ ہی وقت سے پہلے وہاں موجود ہوتا تھا۔ ہر آہٹ پر ایمل نظر اٹھا کر دیکھتا لیکن اسفر آج اس محفل موجود نہ تھا۔ ایمل کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جناب! ہم پہلی مرتبہ خدا کے ہونے یا نہ ہونے پر بات کر رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے ہمیں اس موضوع کو طول دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم سب ہی خدا کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں چاہے کسی بھی مذہب سے ہوں۔''

ایک ادھیڑ عمر شخص نے آخر کار اس خاموشی کو توڑا جو طول پکڑتی جا رہی تھی۔

ایمل نے دھیان سے اس کی بات سُنی اور سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا اس شخص کا اشارہ اسفر کی غیر موجودگی کی طرف تھا۔ گو کہ اس مجمع کا ہر شخص کسی نہ کسی مذہب کا پیروکار تھا لیکن اسفر اور ایمل کی گفتگو ان کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی تھی۔ اپنی سوچ کے کسی کونے میں شاید ان میں کئی ہی کو اس بات کا انتظار تھا کہ جیت کس کی ہوتی ہیں اور اسفر کی غیر موجودگی نے فاتح ایمل کو قرار دے دیا تھا۔

ایمل اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ وہاں موجود لوگ پہلے تو ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے اور پھر ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ وہی شخص جس نے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا تھا دوبارہ کچھ کہتا، دور سے آتے اسفر کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اسے ایمل کی خاموشی کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ شاید ایمل جانتا تھا کہ اسفر ضرور آئے گا اسی لیے اب تک کوئی مکالمہ شروع نہ کیا تھا۔

پہلی نظر میں کئی لوگوں نے اسفر کو نہ پہچانا۔ آنکھوں کے گرد حلقے، بڑھی ہوئی شیو، بے ترتیب بال اور سست چال۔ اسفر ان کی جیل میں موجود ایک خوبرو نوجوان تھا اور آج وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی

دے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر مجمع کے درمیان بیٹھ گیا۔ کچھ کی نظروں میں اس کے لیے تمسخر تھا تو کچھ کی نظروں میں ترحم۔

دونوں گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کئے، سر جھکائے وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ ہمیشہ ایمل کے بالکل سامنے یا برابر میں بیٹھا کرتا تھا کیونکہ اُسے اپنے سوالوں کے جواب چاہیے ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا ایک ہفتے سے نہ ہی وہ سویا تھا اور نہ ہی اس نے ڈھنگ سے کھانا کھایا تھا اور ممکنہ وجہ یہ تھی کہ اب اس کے سوال ختم ہو گئے تھے۔ آج وہ ایمل کو صرف سننے آیا تھا۔

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کو اس کے ماں باپ یہودی نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ یعنی ہر بچے میں خلقی طور پر حق بات طبیعت کے اندر رکھی گئی ہے پھر اگر وہ اس سے صحیح طور پر کام لے تو حق پرست ورنہ باطل پرست ہو جاتا ہے۔"

''اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟'' ایک سوال اُبھرا۔

''ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے لیکن یہ تو دوسرا پڑاؤ ہے۔ سب سے پہلے تو خالق کے وجود کا انکار یا اقرار ہے۔ پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ کس کا خالق صحیح ہے۔ پہیلی پہیلی تو بہت آسان ہے اصل کام تو دوسری گھتی کو سلجھانا ہے اور اس کے لیے انسان کو اپنے آپ کو پہلے بالکل اَن چھوا کرنا ہوگا۔ ہر چیز کو کھلے دل سے دیکھنا ہوگا اپنے تمام حسیات کو محسوس کرنا ہوگا، تب ہی وہ حق کو پہچان پائے گا، یہ کام کوئی کسی کے لیے نہیں کر سکتا۔ یہ کام تو ہر شخص کو خود ہی کرنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہر شخص اپنی کشتی کا ناخدا خود ہے۔ بس، دل کی آنکھ سے دیکھو اور پرکھو۔ بہت جلد منزل پر پہنچ جاؤ گے۔"

اسفر نظر اٹھائے بغیر بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس کا اپنا سراپا اس کو یوں سر شکست خوردہ دیکھ کر دور کھڑا ہنس رہا تھا۔ کبھی اپنا ماتھا پیٹتے تو کبھی دہرا ہو کر ہنستے ہوئے۔

''ارے تم جو اتنے باعلم ہو اپنی کھلی آنکھوں سے اس کے اسرار کا جائزہ لیتے رہے ہو۔ تمہیں کیا لگا بس سب کچھ ایسے ہی ہوتا گیا؟ خود بخود؟ اپنے آپ؟''

اسفر کا سر کچھ اور جھک گیا۔ اس کے چاہنے والوں کے جملوں کی بازگشت اس کا ناخدا تھی لیکن اس نے

کبھی اس ناخدا پر بھروسہ نہ کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کا دل کسی نے باندھ دیا تھا اور وہ چاہ کر بھی اسے نہیں کھول پا رہا تھا۔ اس کو اپنی سوچیں مضحکہ خیز لگیں۔ ''بھلا دل کو باندھنے والا بھی کوئی ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔''

ایک جھماکہ سا ہوا اس کے دماغ میں۔ میں تو ہمیشہ خدا کی مخالف سمت میں بھاگا ہوں پھر کیوں ایسے لوگ بار بار میری زندگی میں آتے رہے جن سے میں دور جانا چاہتا ہوں؟''

وہ اپنی سوچوں میں غلطاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے اسفر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اسفر چونک گیا۔ آس پاس دیکھا تو کوئی نہ تھا، سارے اُٹھ کر جا چکے تھے۔ صرف ایمل اس کے پاس کھڑا تھا۔ آنکھوں میں ہمدردی تھی یا محبت اسفر کچھ اندازہ نہ لگا سکا۔

''تم جانتے ہو مجھے تم سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟''

اسفر نے حیرت سے ایمل کی آنکھوں میں جھانکا لیکن پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے تُم میں اپنا آپ نظر آتا ہے۔'' ایمل نے نظریں اسفر کے چہرے سے ہٹا کر آسمان پر ٹکا دیں۔ ''تمہاری طرح میں بھی خدا کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔''

ایمل یہ کہہ کر رُک گیا۔ خاموشی بہت معنیٰ خیز تھی۔ اسفر کچھ دیر بے صبری سے انتظار کرتا رہا لیکن ایمل نے تو جیسے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔

''تو پھر کیا وہ ملا؟'' اسفر کے لہجے سے بے قراری نمایاں تھی۔

اس سے پہلے کہ ایمل کچھ کہتا ایک باوردی پولیس آفسر نے اس کا نام پکارا ''ایمل گیبرئیل!!''

ایمل کپڑے جھاڑتا کھڑا ہو گیا۔

''اپنے دل کو تمام بتوں سے خالی کر دو۔ تمہیں اپنا جواب مل جائے گا اور جب جواب مل جائے گا تو آس پاس دیکھنا وہ تمام بت تمہیں اپنے آس پاس کھڑے ملیں گے۔''

ایمل یہ کہہ کر آفیسر کے ساتھ چلتا بنا۔ یہ اس کا قید میں آخری دن تھا۔

اُس کی چھ ماہ کی سزا پوری ہو چکی تھی۔ اسفر بے چینی سے پہلو بدلتا ایمل کی پشت کو دیکھتا رہا۔ وہ اب

آفیسر سے ہلکے پھلکے کے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ آخر کار وہ آہنی دروازے سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسفر ایک مخمصے میں تھا ''کیا تھا اگر وہ جواب دے جاتا!'' اسفر مزید مضمحل ہوا۔

''مجھے پتا ہے اس کے پاس جواب نہیں ہوگا تب ہی وہ گول مول باتیں کر کے چلا گیا۔''

اسفر نے اپنے سوچ کو منفی رنگ پہنانے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام رہا۔ ایمل جیسے شخص کے بارے میں صرف ایسا سوچنے پر بھی اُسے ہنسی آ گئی۔

''میرے دل میں بھلا کون سے بُت ہیں۔'' اسفر سوچ میں پڑ گیا ''مجھے سب سے زیادہ اپنی زندگی سے پیار ہے۔'' اسفر کے اپنے الفاظ اس کے کانوں میں گونج اٹھے اور اِک دم ہی ادراک کی کھڑکی وا ہوگئی۔

''کیا مجھے اپنی زندگی سے پیار نہیں ہونا چاہیے؟ کیا یہی وہ بُت ہے جو مجھے توڑنا ہے؟ تو کیا اپنی جان لے لوں؟''

بے سروپا خیالات یکے بعد دیگرے وارد ہونے لگے۔ وحشت کے عالم میں وہ کھڑا ہو گیا۔

''مجھے اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہیے۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ جیل خانے کے اندر موجود ایک اور قید خانے کی طرف بڑھ گیا..... باورچی خانے کی طرف۔

جھنجھلاہٹ میں وہ ہر کسی سے الجھ رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اصل زنداں تو کوئی اور تھا جسے وہ توڑنے کے قریب تھا۔ یہ تو بس ایک سراب تھا۔

شام کو جب وہ اپنے سیل کی طرف لوٹ رہا تھا تو ایمل کا ایک قریبی ساتھی تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور پھولی سانسوں کے ساتھ ایک کاغذ اُسے تھما کر چلا گیا۔

حیرانی کے عالم میں اسفر اس نفاست سے طے شدہ کاغذ کو تکتا رہا اور پھر اس کی پرتیں کھولتا اپنے سیل میں داخل ہو گیا۔ آہنی سلاخوں کا گیٹ بند ہو چکا تھا۔ کاغذ پر ایک پتہ درج تھا۔ ایک لیکچر ہال کا پتہ۔ اسفر کاغذ پر لکھی مختصر معلومات کو حیرت سے تکنے لگا۔

...۞...

کئی دن کے ناغے کے بعد جب طوبیٰ آفس پہنچی تو سب ہی کو اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھٹکے ہوئے جسم کو دیکھ کر اچنبھا ہوا۔

فرحان، جس سے صرف رسمی علیک سلیک کے علاوہ ایک کولیگ کا کچھ ایسا رشتہ بچا تھا جس میں فرحان کو نہ صرف نظر انداز کرنا بلکہ اس کی خاموش شکایتوں کو سنبھالنا بیک وقت مشکل اور آسان دونوں تھا، سامنے ہی تھا۔

''کیا ہوا ہے آپ کو؟'' وہ دونوں ہی کاریڈور میں ایک دوسرے کے سامنے سے گزر رہے تھے جب فرحان اس کی سست چال اور چہرے کی پیلی رنگت دیکھ کر ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ خاصہ متفکر نظر آ رہا تھا۔

''کچھ نہیں بس بیمار تھی۔'' طوبیٰ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ایسی کیا بیماری تھی جو چند دن میں یہ حالت ہوگئی؟'' فرحان ابھی تک شاکڈ تھا۔

''بس وائرل ہو گیا تھا شاید۔ آج کل بہت بخار پھیلا ہوا ہے۔'' طوبیٰ نے ٹالنے کی کوشش کی اور ساتھ قدم بڑھانے کی بھی لیکن فرحان نے اس کا راستہ روک لیا۔

''میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔'' اتنے وقت میں آپ سے تم کا فاصلہ جو اب تک طے نہ ہوا تھا چند ہی منٹوں میں ہو گیا تھا۔

طوبیٰ نے ایک نظر فرحان پر ڈالی جو اپنے آفس کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

پانچ سال پہلے کا دن طوبیٰ کی نظروں میں گھوم گیا۔ وہ اس کی زندگی کا ایک کڑا دن تھا اور ایک کڑا دن آج تھا۔

بعض اوقات جن فیصلوں کو کرنے میں سالوں گزر جاتے ہیں لمحوں میں یوں طے ہو جاتے ہیں جیسے بچوں کا کھیل ہو، فرحان نے بھی آج طوبیٰ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''فرحان سر! مجھے تھوڑا وقت دیجیے'' یہ کہہ کر طوبیٰ اس کے برابر سے گزر گئی۔ فرحان ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

...۞...

ایمل کے جانے کے بعد اسفر کے قید کے دن طویل سے طویل تر ہوتے گئے۔ اس کا زیادہ تر وقت جدید تحقیق کی کتب کے مطالعے میں صرف ہوتا۔ ہر نیا باب اس کے لیے ایک نیا دروازہ کھول دیتا۔ بچپن میں اس نے عباس کے ساتھ ایک وعظ میں شرکت کی تھی جہاں عالم صاحب بنی اسرائیل کی قوم کا قصہ بیان کر رہے تھے جب اُنہیں ایک اللہ کے حکم پر اپنے پسندیدہ بچھڑے کو ذبح کرنا تھا۔ عالم صاحب کا انداز بیان نہایت دلچسپ تھا۔

''بنی اسرائیل کو اپنی عقل پر خوب بھروسہ تھا۔ انہوں نے کہا سوال پر سوال کرتے جاتے ہیں۔ موسیٰ کے رب کے پاس کون سا ہر سوال کا جواب ہوگا۔ اسے مصروف رکھیں گے اور اپنے پیارے بچھڑے کی بھی خوب خدمت کریں گے۔ بھلا خدا بھی کوئی خدا ہے جو نظر ہی نہ آئے۔'' عالم صاحب کا مزاحیہ انداز بیان سب ہی کو محظوظ کر رہا تھا۔

''اُلٹی پڑ گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔'' عالم صاحب نے لہک لہک کر ایک شعر کا مصروعہ پڑھا۔ ''انہوں نے کہا..... کیسا بچھڑا..... خدا نے کہا زرد۔''

''انہوں نے کہا اور بتایئے..... خدا نے کہا بے عیب۔''

''انہوں نے کہا اور بتایئے۔''

''خدا نے کہا جو کسی کا خدمتگار نہ ہو۔''

عالم صاحب کی لمبی خاموشی بڑی گھمبیر تھی۔ ''تو ساتھیو! دیکھا آپ نے، جیسے جیسے وہ سوال پوچھتے گئے پھنستے گئے پھنستے گئے۔''

اسفر کو اپنا آپ اس وقت بالکل بنی اسرائیل کی قوم جیسا لگا۔ وہ جتنا واضح جواب چاہتا اتنا ہی پھنستا جا رہا تھا۔ ایمل نے کہا تھا یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ یہ قید اصل میں ایک سنہری موقع تھا اور شاید آخری موقع بھی جو اسے دیا جا رہا تھا تاکہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ اس کا دماغ دھواں دھواں اور چہرہ سُتا ہوا تھا۔

اس کا دماغ اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس کا کبھی دل چاہتا وہ دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے اور کبھی

کسی اونچی عمارت سے چھلانگ لگانے کو دل کرتا۔غرض اس کا ڈپریشن اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اس کو موت ہی جائے پناہ نظر آتی تھی۔ایک ایسی جگہ جہاں کچھ باقی نہ ہو۔یہی واحد فرار کا رستہ تھا۔دماغ تو کب کی ہار تسلیم کر چکا تھا لیکن دل تھا کہ ابھی تک اپنی بات پر اڑا تھا۔

''اتنی آگے آنے کے بعد میں کیسے پلٹ جاؤں؟''اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

تین ہفتوں کے بعد جب ایک شکست خوردہ شخص کی مانند وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو اس سے اس بات پر بالکل تعجب نہ ہوا کہ اس کی جگہ کوئی اور پُر کر چکا تھا۔موسیٰ کی جگہ ایک ادھیڑ عمر شخص لے چکا تھا البتہ اس کا سامان اسے جوکا توں نظر آیا۔

اس نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور باہر نکل آیا۔برفیلی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو گرم کپڑے جسم پر ہونے کے باوجود اسے جھرجھری آ گئی۔اصل وجہ وہ خوف تھا کہ اب اس نے کہاں جانا ہے۔یونیورسٹی کے دوست اس کے برائے نام ہی تھے۔

ایک ایک کر کے جتنے لوگوں کے نمبر تھے اس نے سب سے رابطہ کیا۔ایک بات قابل ستائش تھی، ایشیائی لوگوں کی طرح آسٹروی لوگ کوئی لگی لپٹی نہ رکھتے تھے۔اگر مدد کر سکتے ہوتے تو فوراً بتا دیتے ورنہ صاف جواب دے دیتے۔کوئی جھوٹی اُمید بھی نہیں بنتی تھی اور وقت بھی برباد ہونے سے بچ جاتا تھا۔

ہسپتال پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اب اس کی نوکری بھی موجود نہ تھی۔پانچ ماہ تک مطلع کرنے کے باوجود کوئی بھی ادارہ کسی کا انتظار کرنے کا پابند نہ تھا۔جلد ہی اسفر کو اندازہ ہو گیا کہ اصل امتحان تو اب شروع ہوا ہے۔آخر کار ایک تنگ مگر بند گلی اسے کچھ موزوں لگی۔بے گھر لوگوں کے مسائل کیا ہوتے ہیں کوئی شخص اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب وہ خود اس سے دوچار ہو۔

شام کے ڈھلتے سایوں سے پہلے ہی اس نے گاربیج ٹرنکس میں سے کچھ کارٹن ڈھونڈ نکالے جو نسبتاً صاف ستھرے تھے،خوش قسمتی سے اس کے پاس موٹے کپڑے موجود تھے جو اس نے دو تہوں میں جسم پر جڑھا لیے تھے،سردی کی شدت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔دو گھنٹوں بعد ہی مکمل اندھیرا چھا

گیا۔ اسٹریٹ لائٹس کی کچھ روشنی اس کے عارضی ٹھکانہ تک پہنچ رہی تھی۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی گئی گاڑیوں کی آوازیں بھی معدوم ہوتی گئیں۔

رات کے پہلے پہر ہی سردی سے اس کے دانت بجنے لگے۔ اس نے اپنے جسم کو سمیٹ لیا اور بیٹھے بیٹھے اپنے جسم کو پنڈولم کی طرح حرکت دینے لگا۔ ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر مستقل وہ اپنے گالوں اور ناک کو کچھ گرمائش پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہ ختم ہونے والی تاریک رات کسی بھی رات سے زیادہ گہری تھی۔ آسمان پر چاند بھی موجود نہ تھا کہ اسے تھوڑی ڈھارس رہتی۔

اُس کے جسم پر اب کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ صبح تک اس حالت میں بیٹھنے کا مطلب اکڑی ہوئی لاوارث لاش تھا۔ اس نے تصور میں اپنے بے جان لاشے کو ایک اسٹریچر پر پڑا دیکھا جہاں کارل اپنے ماتحت کو ہدایت دے رہا تھا۔ بلکہ نہیں وہ کہاں ہدایت دیا کرتا تھا۔ ایک ایمبلر ہدایت نامہ پڑھ کر اس کے جسم کو صاف ستھرا کر رہا تھا۔ پھر لاوارث لاش کا ٹیگ لگا کر اسے بھی اس قدآور برف کی الماری میں رکھ دیا گیا جہاں ایک ہفتے تک کوئی شناخت نہ ہونے پر اسے قریبی قبرستان میں دفن کر دیا جانا تھا۔

اسفر کو جھرجھری آ گئی۔ اس نے اُٹھ کر تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ اس نیم تاریک گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ان گنت چکر اس نے کاٹ لیے آخر کار چلتے چلتے جب اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں تو وہ ایک بار پھر تھک کر بیٹھ گیا۔

''آخر کس بات کی سزا مل رہی ہے مجھے؟'' اس نے غصے میں ایک مُکّا قریب رکھے بڑے سے ٹِن پر دے مارا۔ تکلیف کی ایک تیز لہر نے اسے دوہرا ہونے پر مجبور کر دیا۔ بے بسی کی شدت نے ایک بار پھر آنکھوں کے کنارے گیلے کر دیے۔ ''میں ہار نہیں مانوں گا!'' غصے کے عالم نے اس نے خود کلامی کی۔ ''اس دنیا، پر زندگی پر میرا حق ہے۔ میں اپنے حصے کی خوشیاں چھین کر رہوں گا۔'' دماغ کی سرگوشاں چیخوں میں بدل رہی تھیں۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور اب اسفر کے اعصاب بھی شل ہونے لگے تھے۔ شدید نیند اس پر غلبہ پا رہی تھی اور صفر سے نیچے درجہ حرارت میں سونے کا

مطلب لازمی موت کو دعوت دینا تھا۔ جوش، غصہ، ولولہ سب مایوسی میں بدل رہے تھے۔

''بس یہی تھی میری زندگی؟ اتنا ہی کردار تھا میرا؟''

اس کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے تھے۔ اس نے ہاتھ سے چھو کر اپنی ناک کو محسوس کیا۔ وہ وہاں موجود تھی لیکن اسفر کو اپنے ہی ہاتھ کا لمس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسفر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ناک کو ڈھانپ لیا اور کچھ گرماہٹ پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے سر پر موجود اونی ٹوپہ اس نے آنکھوں سے بھی نیچے کھینچ لیا۔ صرف ناک کے دو سوراخ کپڑوں سے باہر تھے ورنہ سر تا پاؤں وہ اونی کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا اس کے باوجود سردی اُسے اپنی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی ''نہ جانے یہ رات اتنی طویل کیوں ہے؟'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور سن ہوتے پیروں کے ساتھ ایک بار پھر چہل قدمی کرنے کی کوشش کی۔

وہ دو قدم چلنے کے بعد وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کی ہتھیلی کسی نوک دار چیز سے ٹکرائی اور درد کی تیز لہر ریڑھ کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ وہ ایک نوکیلا پتھر تھا جو اس کے ہاتھ میں گہرائی تک پیوست ہو گیا تھا۔ درد کی شدت سے وہ چیخ پڑا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیوں؟'' میری زندگی اتنی مختصر کیوں ہے؟ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا! جینا چاہتا ہوں!'' وہ پوری شدت سے چلّا رہا تھا۔ الٹے ہاتھ سے اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کو کس کر دبا رکھا تھا۔

جب روتے روتے نڈھال ہو گیا تو دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا۔ ''اس وقت کون مدد کرے گا میری؟'' اس نے خود ترسی کی حالت میں سوچا اور ایک بار پھر غصے میں بپھرا کھڑا ہو گیا۔

''میرے خالق کیا واقعی تو ہے!'' اس کی آواز سناٹے میں کچھ اور گونج رہی تھی۔ ''مجھے دکھا اگر تو واقعی موجود ہے؟ اگر میں تیری مخلوق ہوں تو مدد کر میری!''

''کیوں نئی مشکل کھڑی کر دی ہم سب کے لیے۔ پہلے ہی ہم کم پریشان تھے۔'' عائزہ کی رندھی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ عباس کا ہارا ہوا چہرہ اور عائشہ کی روتی ہوئی آنکھیں سب کچھ اِک دم اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

''میں بھی تکلیف میں تھا۔'' اس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا ''میں اب بھی تکلیف میں ہوں۔ سنا تم نے اگر تم موجود ہو۔ میں تکلیف میں ہوں۔ کیا مدد کرو گے اپنی مخلوق کی؟''

اسفر ایک بار پھر ہذیاتی انداز میں چیخ رہا تھا۔

"ایک ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے کیونکہ اسے لگتا ہے وہ اس کی تخلیق ہے۔ کیا تو بھی اپنی تخلیق سے محبت کرتا ہے؟"

ہر طرف سنّاٹے کا راج تھا۔ کوئی جواب نہ پا کر اسفر دھیمی آواز سے بلکنے لگا۔

''میں جانتا تھا وہ نہیں ہے مجھے پتا تھا۔ ورنہ وہ مجھے آج یوں مرنے نہ دیتا۔'' اسفر اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ہتھیلی سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور جسم کے ساتھ اب دل بھی ہار گیا تھا۔

''اپنے دل کو تمام بتوں سے خالی کر دو۔'' ایمل کی آواز سرگوشی کی صورت میں سنائی دی۔ اسفر کی بند ہوتی آنکھیں بوجھل سی ایک بار پھر کھل گئیں۔ ''میں..... میں سرینڈر کرتا ہوں۔ ہچکیوں کی صورت میں اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل رہے تھے۔ توڑتا ہوں اپنی عقل کے ناز کے بت کو۔ میں سرینڈر کر رہا ہوں.....'' لب ہلتے ہلتے بالکل خاموش ہو چکے تھے۔ جسم سرد پڑ چکا تھا۔ ہتھیلی سے ابلتا خون اب بھی رس رہا تھا۔ یخ بستہ رات جان لیوا تھی۔

...۞...

آج چند خوش قسمت دنوں میں ایک دن تھا۔طوبیٰ نے بالآخر اپنی گاڑی خرید لی تھی۔گو کہ وہ ایک چھوٹی کار تھی لیکن طوبیٰ کے لیے وہ کسی مرسڈیز سے کم نہ تھی۔خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ حالانکہ گھر میں اب صدیق کی گاڑی موجود تھی۔اور اب گھر کے کسی فرد کو بھی رکشہ یا بس کے دھکے کھانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ چونکہ خوشحالی ان کے گھر کا راستہ دیکھ ہی چکی تھی،صدیق کی نئی نوکری کے بعد گاڑی پوری طرح اصغر کی ڈرائیوری میں گھر کے لیے وقف تھی۔

''ایک اور گاڑی کی کیا ضرورت تھی طوبیٰ؟'' جہاں سب مبارکباد دے رہے تھے رضیہ بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

''امی یہ میرا خواب تھا۔اپنی گاڑی لینا۔میری اپنی کار۔'' طوبیٰ کی آنکھیں خوشی سے جھلملا رہی تھیں۔ جس نے ساری زندگی کفایت شعاری میں گزاری ہو،اس کے لیے یہ سراسر فضول خرچی تھی اور دل ہی دل میں یہ ملال کے ان پیسوں میں کتنا ہی جہیز کا سامان بن جاتا۔سب کو مٹھائی کھلا کر بالآخر وہ کمرے میں آئی اور کنول کو فون ملایا۔وہ شادی کے بعد کافی مصروف ہوگئی تھی،سو رابطہ بھی کافی کم ہو گیا تھا لیکن اس موقع کو طوبیٰ بھلا اپنے دوستوں کے بغیر کیسے سیلیبریٹ کرسکتی تھی۔دوسری کال ثناء کو ملائی ثناء کا ردعمل بے حد عجیب تھا۔

''تم گھر واپس آ گئی ہو؟''

''ہاں!'' طوبیٰ نے جواب دیا۔''خیریت ہے کچھ پریشان لگ رہی ہو؟'' طوبیٰ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''بس وہ ابھی ابھی ایک پرانے دوست کا فون آیا تھا۔اس نے کسی جوان موت کا تذکرہ کیا تو دل اداس ہو گیا۔امی ابو بھی لاہور گئے ہوئے ہیں تو خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی ہوں۔تم آسکتی ہو؟''

''اچھا میں کوشش کرتی ہوں۔'' طوبیٰ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور رضیہ کو اطلاع دینے چل دی۔

وہاں پہنچنے پر ثناء بہت چپ چپ لگی اور کچھ ہی دیر بعد دو آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

''کس کا انتقال ہو گیا ہے ثناء؟''

طوبیٰ کو اب پریشانی نے آ گھیرا۔ ثناء کی شادی قریب تھی اور آج کل اپنی رخصتی کو لے کر وہ بار بار جذباتی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں اس کا اس طرح پریشان ہونا طوبیٰ کو بہت کھل رہا تھا۔

''صدف کا فون آیا تھا ابھی۔ یاد ہے نا وہ اسکول والی صدف؟'' ثناء نے اس سے تصدیق چاہی۔

''ہاں!'' طوبیٰ نے پھر الجھے انداز میں جواب دیا۔

اس نے بتایا اسفر کی بہن کا کینسر سے انتقال ہو گیا ہے۔"

طوبیٰ گنگ بیٹھی رہ گئی۔ وہ پڑھاکو عائزہ اس کو آج تک یاد تھی۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ اول آنے والی۔ لیکن دکھ کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اتنی ہونہار لڑکی اتنی کم عمر میں یہ جہان چھوڑ گئی۔ دکھ کی اصل وجہ تو وہ نسبت تھی جس سے وہ اسے جانتی تھی۔

''بہت افسوس ہوا۔'' کافی دیر کے بعد طوبیٰ کے منہ سے بمشکل الفاظ نکلے۔

''اس خاندان پر بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے۔'' ثناء آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور طوبیٰ نارمل دکھنے کے بھرپور اداکاری کر رہی تھی۔

''اسفر کا کوئی جھگڑا ہوا تھا گھر میں اور اس کے ابو نے اسے گھر سے نکال دیا تھا، چند سال پہلے۔''

طوبیٰ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بے یقینی میں ثناء کا چہرہ تکے گئی جو اپنے دل کا دکھ چہرے پر سجائے بیٹھی تھی۔

ڈیڈ باڈی ابھی ہسپتال میں ہی ہے رات سے۔''

''کیوں؟'' بے ساختہ ہی لبوں سے نکلا۔

ہسپتال کا بل پورا ادا نہیں کر پائے وہ لوگ۔''

طوبیٰ کو سمجھ نہ آیا وہ کیا کہے۔

''کافی زیادہ بل بن گیا تھا تو صبح کا انتظار کرنا پڑا انتظام کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے رشتہ داروں اور دوستوں سب ہی نے مدد کی تب کہیں جا کر سب ہوا ہے۔ دیکھو اب کب تک تدفین ہوتی ہے۔'' ثناء

ابھی بھی صدمے میں تھی۔ تمام دوستوں میں ثناء سب سے زیادہ سوشل تھی، تب ہی اسکول کے سارے دوستوں سے اس کا اب تک رابطہ تھا۔

طوبیٰ ابھی تک سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی اسفر ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اسی لیے خوشیاں ان پر ہمیشہ مہربان تھیں۔ لیکن زندگی کبھی ایسے موڑ پر بھی لے آتی ہے اسے بالکل اندازہ نہ تھا۔

''اور مجھے لگتا تھا بس میری ہی پریشانی بڑی ہے۔ میں ہی مظلوم ہوں۔ سب مشکلیں اللہ نے میرے حصے میں ڈال دی ہیں۔'' طوبیٰ الگ ہی سوچوں میں غلطاں تھی۔

''کسی کو اپنے پیارے کو دفن کرنے کے لیے اس کا جسد بھی نہ ملے اس سے بڑا سانحہ کیا ہوسکتا ہے بھلا!۔'' طوبیٰ کی روح تک کانپ گئی۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی۔

زندگی کی اصل قیمت کا اندازہ اُسے آج ہوا تھا اور بے بسی کی انتہا کا بھی۔

جب کسی شخص کو کینسر ہوتا ہے تو وہ صرف اس شخص کو نہیں بلکہ پورے خاندان کی آسودگیوں کو بھی نگل جاتا ہے۔

.....۞.....

آس پاس کی آوازیں معنیٰ خیز ہونے لگی تھیں۔ دھیمی دھیمی سرگوشیاں اب باتوں کا روپ لینے لگی تھیں۔ کافی لوگ آس پاس موجود تھے۔ چہل پہل تھی، لیکن شور نہ تھا۔ فضا میں جراثیم کش دوا اور پرفیوم کی ملی جلی مہک کافی خوشگوار لگ رہی تھی۔ اسفر نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ چارسُو اجالا اور سفیدی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کے پردے میں گھِرا اس کا بستر اور پاس ہی ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان جو اس کو جاگتا دیکھ کر اب کھڑا ہو چکا تھا۔

''آخر کار تم جاگ گئے۔ مجھے لگا تم کبھی نہ جاگنے کے لیے سو رہے ہو۔'' وہ روانی سے جرمن بول رہا تھا اور خدوخال سے مقامی لگتا تھا۔

اسفر یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کل رات وہ کہاں سویا تھا اور پھر فلیش بیک کی طرح ایک ایک کر کے تمام واقعات آنکھوں کے گرد گھومنے لگے۔ ایک عجیب سا شور دماغ میں گونجنے لگا۔ اس نے سُرعت سے اپنے کان بند کرنے کی کوشش کی تو ہاتھ میں شدید تکلیف اور بھاری پن کے باعث اس کی کراہ نکل گئی۔ بمشکل تمام اٹھ کر بیٹھا تو ہاتھ کا جائزہ لیا۔ ہتھیلی پر پلستر جیسی پٹی کی گئی تھی۔''

تمہاری ہڈی پر گہری چوٹ ہے اور زخم بھی گہرا ہے۔'' وہ لڑکا وقتاً فوقتاً تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

اسفر ایک گہرا سانس لے کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ دکھ، ندامت، شرمندگی منہ کے بل گرنے کا احساس یا وہ احساس جب پتا چلے کہ دوڑ میں آپ ٹریک کے اُلٹی طرف دوڑ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ باقی سب پیچھے رہ گئے۔ رونے کو شاید آنسو بھی نہ بچے تھے۔ اسفر ایک شاک کے عالم میں بیٹھا تھا۔ حزن وملال کی صحیح تصویر۔

''تو خدا نے مجھے دکھا دیا کہ وہ موجود ہے'' ایک کراہ تھی یا خنجر جو دل کو چیرتا ہوا شکم تک اتر گیا۔

''میں بس کسی وجہ سے بھاگتا ہوا آیا تو تم کسی غیر مقامی زبان میں کچھ چلّا رہے تھے۔ میں بس جانے

ہی والا تھا کہ تم نے جرمن زبان میں کہا میں سرینڈر کرتا ہوں۔'' اس لڑکے نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور سرگوشی کی۔

''میں پولیس سے بچ کر ہی بھاگ رہا تھا، لیکن جب تم نے سرینڈر سرینڈر کا شور مچایا تو میں بھی گھبرا گیا کہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے۔ میں بھاگنے ہی لگا تھا کہ سامنے سے پولیس آ گئی۔ وہ تو شکر ہے میرے دماغ نے صحیح کام کیا۔ میں نے فوراً تمہیں اپنا بھائی بنا لیا اور پولیس کو بتایا کہ تمہاری گرل فرینڈ نے تمہیں ڈِچ کیا ہے اس لیے تم غم سے نڈھال ہو اور خدا کے آگے سرینڈر کر رہے ہو۔ پولیس ہم دونوں کو ہی یہاں لے آئی۔ دیکھو جو کہانی میں نے تمہیں سنائی ہے تم پولیس کو وہی بتانا ورنہ ہم دونوں ہی برے پھنسیں گے۔''

ابھی وہ لڑکا بڑی روانی سے اپنی کتھا سُنانے میں مصروف ہی تھا کہ ایک پولیس افسر نے اندر جھانکا اور اسفر کو ہوش میں دیکھ کر پردہ سرکا کر اندر چلا آیا۔

''میں نے تم سے کہاں تھا کہ تمہارے بھائی کو جیسے ہی ہوش آئے ہمیں مطلع کرنا!'' افسر نے رُکھائی سے اس لڑکے سے باز پرس شروع کر دی۔

''وہ..... اصل میں اتنی دیر بعد ہوش میں آیا تھا تو میں جذباتی ہو گیا اور حال چال پوچھنے لگا۔'' اس لڑکے نے انگلیاں مروڑتے جواب دیا'' بتاؤ نا بھائی تم بھلا دو گے اس بے وفا کو؟''

اسفر خالی الذہن کی حالت میں ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ الفاظ کو کوئی بھی جامہ پہنانے سے وہ قاصر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہو۔ دل، گردے، دماغ، پھیپھڑے سب کسی نے باہر نکال پھینکے ہوں۔ اور ایک تاریکی کا راج ہو۔ اتنی تاریکی کہ باہر کا اجالا بھی اندر نہ داخل ہو پا رہا ہو۔

سامنے کھڑا افسر کچھ کہہ کر اب سوالیہ نظروں سے اسفر کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اسفر کی خالی نظروں کو کچھ لمحے دیکھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اسفر بات کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔

''گہرا صدمہ پہنچا ہے۔'' افسر نے اس لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کیا۔ بلا کی

معصومیت اور بیچارگی اپنے چہرے پر سجائے وہ لڑکا اسفر کے کچھ قریب ہو گیا اور پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

''بھول جاؤ اُسے، جو تمہاری ذات کی نفی کر دے تم اس کی ذات کی نفی کر دو۔''

الفاظ چابک کی طرح لگے اور اسفر تڑپ اٹھا۔ اس لڑکے نے حیرانی سے اسفر کو دیکھا اور دل ہی دل میں اسفر کی بہترین ایکٹنگ کی داد دی۔

افسر تاسف سے سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد لڑکے نے سکون کا سانس لیا۔ اسفر کے سامان کی تلاشی وہ رات ہی لے چکا تھا۔ کپڑے اور کتابوں کے علاوہ اس کے پاس کچھ ہی نقدی تھی جو اس نے اپنی جینز کی جیب میں بحفاظت منتقل کر لی تھی۔ افسر کے جانے کے بعد بھی اسفر کو خلاؤں میں گھورتا دیکھ کر وہ لڑکا مسکراتے ہوئے آیا اور ایک تھپکی اسفر کو پیش کی۔

''واہ یار! تم نے تو کمال کر دیا۔ کیا ایکٹنگ کی ہے۔ میری مدد کرنے کا صحیح حق ادا کیا ہے تم نے۔''

وہ کافی پر جوش تھا۔ ''میں (SAM) سیم ہوں اور تمہارا نام اسفر ہے نا؟'' اُس نے فخریہ انداز میں پوچھا۔

اسفر کی طرف سے بدستور کوئی جواب نہ موصول ہونے کی صورت میں سیم اب کچھ جھنجلا گیا۔

''دوست! افسر چلا گیا اب کردار سے باہر آ جاؤ۔''

شکست خوردہ، تقریباً نیم مردہ حالت میں اسفر دوبارہ بستر پر ڈھیر تھا۔ وہ اس وقت واپس بے ہوش ہو جانا چاہتا تھا۔ دنیا وہ مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ ہوش میں تھا۔ دماغ میں ایک سنسناہٹ تھی۔ کتنا بڑا دھوکہ تھا جو اس نے خود کو دیا تھا۔

"لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ سیم وہاں آ گیا اور اس کو بچا لیا۔" ایک نحیف سی آواز دماغ کے کسی کونے سے آئی تھی لیکن دل کی آواز نے اُسے گھرک دیا ''تم میں ایسا کیا خاص ہیں جو تمام اتفاقات تمہارے ہی لیے ہیں؟ پرفیکٹ اتفاقات۔"

''مجھے بھی دین میں کچھ شکوک تھے تو میں نے بائبل پڑھی، جیسے جیسے پڑھتا گیا مجھے اندازہ ہوا یہ پوری کتاب ناقابل یقین قصے کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔'' لکاس کے جملے اسفر کو چابک کی طرح لگے۔

''کیا میں نے قرآن پر غور کیا جب مجھے اپنے مذہب پر شبہات ہوئے۔'' کسی نے اسفر کو آئینہ دکھایا تھا۔ ہر چیز کے بارے میں جانچ پڑتال اور چھان بین کر فیصلہ کرنے والا اللہ کے وجود کو چند سائنس کے قوانین کے عوض جھٹلا بیٹھا تھا۔ خدا کو چیلنج بھی کیا تو آخری آپشن میں.... جب کوئی راہ نظر نہ آئی تو خدا کو پکار بیٹھا۔ اپنا آپ انتہائی مضحکہ خیز لگا۔ اسے لگا وہ میدان حشر میں کھڑا ہے۔ تا حدّ نگاہ لوگ اس کے گرد دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ لاتعداد لوگ شہد کی مکھیوں کی مانند۔ اور سب اس کی بیوقوفی پر ہنس رہے ہیں۔ بے تحاشہ، انگلیاں اٹھا اٹھا کر۔ اسے لگا اب اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ ہسٹریائی انداز میں۔

''پہلے خود کو پہچان پھر دنیا کو پرکھ۔'' اس مچھیرے کی بات تھی یا کوئی شہاب ثاقب جو تاریک آسمان کو اِک دم روشن کر گیا۔

''عقل تو بس نظر کی محتاج ہے،'' ایک اور تارا ٹوٹا تھا۔

''اگر کوئی غور کرنا چاہے تو اس کو مشقت کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔'' تاریک آسمان پر ایک کے بعد ایک ستارے ٹوٹ کر ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔

''اللہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے اور کسی سے زور زبردستی نہیں کرتا۔ ایمان کا تو حسن ہی یہ ہے کہ انسان غور کرے، اُسے پہچانے اور تسلیم کرے۔'' بچپن میں اسلامیات کے اُستاد کے پڑھائے ہوئے سبق بھی ایک کے بعد ایک چمکدار ریڈیم جیسی روشنی کے ساتھ یاداشت کے پردے پر ابھر رہے تھے۔

''میں سب کو سن چکا تھا لیکن صرف کانوں ہی سے سنا تھا کبھی یہ باتیں میں نے دل سے تسلیم کیوں نہ کیں؟'' صدمہ سا صدمہ تھا۔

اسفر کو ہسٹریائی انداز میں چلاتا دیکھ کر سیم اب سچ مچ گھبرا گیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے بمشکل تمام اسفر کو چپ کروانے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی ایک ڈاکٹر اور ایک نرس اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سیم نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔

سب سے بڑا ڈر اُسے اس آفیسر کا تھا جو چند منٹ پہلے ہی کمرے سے باہر نکلا تھا۔ انتہائی تذبذب کے عالم نے اس نے کاریڈور میں جھانکا۔ خوش قسمتی سے وہ آفیسر اس کی کہانی پر یقین کر کے وہاں سے جا چکا تھا۔ سیم نے ایک ہی جست میں آدھا کاریڈور پار کر لیا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک اُسے اس رقم کا خیال آیا جو اس نے اسفر کی جیب سے برآمد کی تھی۔

''پتا نہیں کیا صدمہ ہے اس بیچارے کو۔ کہیں اس رقم کا عذاب ہی نہ پڑے مجھ پر۔'' بھاگتے بھاگتے دماغ میں آنے والی سوچوں پر وہ خود ہی چڑ گیا۔ تیزی سے پلٹ کر واپس آیا تو اسفر بدستور ہسٹریائی انداز میں چلّا رہا تھا۔

سیم دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر اور نرس اسفر کو دوسرے وارڈ میں منتقل کر رہے تھے۔ کمرے کے خالی ہوتے ہی سیم نے وہ مٹھی بھر رقم ایک کرسی کی پشت پر پڑی اسفر کی جیکٹ کی جیب میں ٹھونسی اور سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے دوڑ پڑا۔

.....۞.....

ہسپتال میں یہ اس کا دوسرا دن تھا اور طبیعت بھی کچھ مضمحل تھی۔ قلق تھا افسوس یا پچھتاوا، کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ نہ ختم ہونے والا پانی تھا جو آنکھوں سے امڈتا آ رہا تھا۔ جس عقل پر اسے ناز تھا وہ خود اس کی تخلیق تھی جسے وہ جھٹلاتا آیا تھا۔ اسے لگا وہ دو حصوں میں بٹ گیا ہو۔ ایک وہ جو ابھی تک اپنی ضد پر قائم تھا، عقل کا پرچار کرنے والا اور دوسرا وہ جو دور کھڑا اس پر ہنس رہا تھا، ناچ کر اپنی جیت کا جشن منا رہا تھا۔

''بس اب اور نہیں۔'' اس نے اپنے آپ کو حتمی فیصلہ سنایا ''اب واپسی ہی میں فلاح ہے۔'' اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ باہر نکلتے ہی پہلا کام اس نے گھر پر نمبر ملانے کا کیا۔ بیل ہوتی رہی۔ فون کی بجتی ہوئی گھنٹی اتنی اعصاب شکن بھی ہو سکتی ہے اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ آخر کار پانچویں گھنٹی پر کسی نے فون اٹھایا۔

''ہیلو، ہیلو!'' پیچھے کچھ شور تھا۔ آہ و فغاں۔ اسفر کو لگا اس کے اندر کا شور باہر آ گیا ہے۔ اسفر نے رسیور کان سے ہٹا کر اپنے سر پر دو گھونسے مارے کوئی بھی شخص اُسے دیکھتا تو پاگل سمجھتا۔

''ہیلو!'' اس کو اپنی آواز بھی اپنی کہاں لگ رہی تھی۔

''کون بات کر رہا ہے؟'' آواز اور لہجہ دونوں ہی انجانا تھا۔ اس سے پہلے کے اسفر کچھ کہتا سامع دوبارہ بول اٹھا ''دیکھیں مجھے آپ کی آواز نہیں آ رہی۔ اگر آپ نے جنازے کا پوچھنے کے لیے فون کیا ہے تو بس ابھی لے جا رہے ہیں عائزہ باجی کو۔ ہیلو! میں عائشہ باجی کی کام والی ہوں۔''

فون کھٹاک سے بند ہو چکا تھا۔

اسفر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جنازہ..... عائزہ کا جنازہ..... کیا وہ مر گئی؟

وہ تو اتنی قابل اور ذہین تھی..... ابھی تو اُسے جینا تھا..... وہ کیسے اتنی جلدی مر سکتی ہے؟ وہاں اس کا جنازہ اُٹھ رہا ہے اور میں یہاں کھڑا ہوں!

''وہ تمہاری وجہ ہی سے مری ہے۔'' کوئی تلخ آواز تھی جو اس کے اندر چیخ رہی تھی۔ آوازوں کا ایک طوفان تھا جو اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

پتا نہیں جسمانی کمزوری تھی یا اعصابی، اس کی ٹانگوں نے ایک دم اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ دھڑام سے شیشے کے دروازے کے ساتھ اس طرح گرا کہ سر سے نکلتی ایک خون کی لہر زمین کو رنگین کرنے لگی۔

.....۞.....

ڈیئر ڈائری.....

کیا لکھوں؟ آج کیا کہوں؟ میری خوشیاں بھی غموں کی پرچھائیوں کے ساتھ آتی ہیں۔ آج کتنے عرصے بعد میں خوش تھی لیکن اب دل اُداس ہے۔ بے حد اُداس۔ حالانکہ جانے والے سے میرا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ میں نے تو اسے کبھی جانا تک نہیں تھا۔ بس اس کا بھائی ہی میرا کچھ شناسا تھا لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی بہت اپنا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ دل مٹھی میں جکڑ لیا ہے کسی نے۔ اسفر کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اسفر! میں نے تمہیں ٹھکرا تو دیا لیکن آج تک میں تمہیں بھول نہیں پائی ہوں۔

کیا کہوں..... میرے نزدیک محبت دو لوگوں کے ملاپ کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ میں ہم دونوں کی اس معصوم سی محبت کو امر کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھا ہے جب محبوب مل جائے تو کیسے بے وقعت ہو جاتا ہے، مجھ میں حوصلہ نہیں تھا بے وقعت ہونے کا۔ بس میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جسے میں نے چاہا وہ بھی مجھے ایسے ہی چاہتا رہے۔ محبوب کو پا لینے کے بعد محبت بس ایک لین دین رہ جاتی ہے۔

آج نہ جانے کیوں مجھے روبی آنٹی بہت یاد آ رہی ہیں۔ بلا کی جاذب نظر تھیں وہ، اور ان کے شوہر بھی۔ چاند سورج کی جوڑی تھی دونوں کی، لیکن اپنے محبوب کو پانے کے بعد دونوں ہی ناقدرے ہو گئے تھے۔ محبت مل جائے تو ایسے ہی ارزاں ہو جاتی ہے۔ میں کبھی اپنی محبت کو ارزاں نہیں کروں گی۔

اسفر! کاش تم اپنے خاندان کے ساتھ کھڑے ہوتے آج۔ مجھے دکھ پہنچایا ہے تم نے اپنے خاندان کو اس مشکل وقت میں اکیلا چھوڑ کے۔ کیا مجبوری تھی جو یوں تم اپنی بہن کو بستر مرگ پر چھوڑ کر چلے گئے۔ یقیناً کچھ بہت گھمبیر وجہ ہوگی ورنہ تم ایسے کبھی بھی نہ تھے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں ہر کسی کی مدد کرتے دیکھا۔ دوسروں کی پریشانی میں خود کو ہلکان ہوتے دیکھا۔ تم تو سوشل ورک میں بھی ہم سب

سے آگے تھے۔ پھر یہ کیسے ہو گیا کہ اپنی جوان بہن کے جنازے تک میں شریک نہ ہوئے۔ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔

...۞...

گھر کے بڑے سے صحن میں سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور اس پر گٹھلیوں کا ڈھیر۔ مختلف عمر کی خواتین اور بچے گٹھلیوں کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ بچے گٹھلیوں سے کھیل رہے تھے۔ خواتین ہونہہ ہونہہ کی گردان کرتی ایک کے بعد ایک گٹھلی گرانے میں مصروف تھیں۔

عائشہ بھی میکانکی انداز میں ایک ہر تیس سیکنڈ پر ایک گٹھلی اپنی مٹھی سے گرا رہی تھیں۔

کھلی آنکھوں کے پچھلے پردے پر چھوٹے بچے بھاگتے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔

صبر کی انتہا ہو گئی تھی۔ پہلے بیٹا زندہ قبر میں اتار گیا تھا اور اب بیٹی خود قبر میں جا اتری تھی۔ عائشہ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''میرے مولا مجھے صبر دے!'' دل پکار رہا تھا۔ بے اختیار عائزہ کے کمرے کی طرف نظر اٹھی۔ کمرے کی ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ بستر کونے سے لگا تھا جس پر بزرگ خواتین براجمان تھیں۔ ہاتھوں میں تھال لیے ٹن ٹن گٹھلیاں گرا رہی تھیں۔ عائشہ کہیں دور آوازوں میں کھو گئیں۔

''امی! امی!'' وہ سخت گرمی میں باورچی خانے میں روٹیاں پکا رہی تھیں جب اسفر اور عائزہ ایک دم غل مچاتے سر پر سوار ہو گئے۔

''اسفر نے میرا قلم لے لیا ہے اور واپس نہیں کر رہا۔'' عائزہ چلّائی تھی۔

''میں کام کر رہا تھا امی اور ویسے بھی یہ مجھے ابو کی میز سے ملا تھا۔ مجھے لگا ان کا ہے۔'' اسفر نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''اب تو پتا چل گیا نا میرا ہے!'' عائزہ کا غصہ سوا تھا۔

''نہیں مجھے ثبوت چاہیے۔'' اسفر شرارت سے مسکرایا۔

''میں مسلمان ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتی۔'' عائزہ غصے میں لال پیلی ہو رہی تھی۔

''مسلمان پر غصہ بھی حرام ہوتا ہے۔'' اسفر عائزہ کو لال پیلے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا۔

''مسلمان پر دوسرے مسلمان کو تنگ کرنا بھی منع ہوتا ہے۔''

''اب میں نے یہ چمٹا تم دونوں کے سروں پر مار دینا ہے۔'' عائشہ گرمی سے بے حال ہوتے ایک دم ہی گرجی تھیں اور وہ دونوں ''سوری امی'' کہتے وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ اب ہر طرف سکون تھا۔ کاٹ کھانے والے سکون۔ وہ دونوں ان کی زندگی سے بھی غائب ہو گئے تھے۔

...۞...

''اسفر! کاش تم دیکھ سکتے، اپنے باپ کے ساتھ تم نے کیا کیا۔ مجھے چھوڑ گئے، مجھ سے کٹ گئے۔ جی کڑا کر کے کہا تھا میں نے کہ تم مر گئے میرے لیے۔ کیسے کہوں اب کسی سے کہ تم مجھے اب بھی یاد آتے ہو۔ زیادہ نہیں بس ہر گزرتے لمحے کے ساتھ۔

اتنا بے بس ہوں کہ یہ بات میں اپنی شریک حیات تک کو نہیں بتا سکتا۔ ورنہ اس نے جو صبر کے بند باندھے ہیں سب ٹوٹ کے بکھر جائیں گے اور مجھے ڈر ہے پھر اس سیلاب پر کوئی بند نہ ٹھہر پائے گا۔ وہ سیلاب سب کو بہا کر لے جائے گا۔'' عباس صحن میں پلنگ پر چت لیٹے تھے۔ آنکھیں خلاؤں میں گھور رہی تھی اور دل کہیں اور تھا۔

''میرا دل دکھایا ہے تم نے۔ میرے پاس تمہیں گھر سے نکل جانے کا کہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں شاید روک لیتا تو تمہیں سمجھا لیتا۔

شاید تم راہِ راست پر واپس لوٹ آتے۔ میں جانتا ہوں میں اب پچھتا رہا ہوں شاید لیکن میرا دماغ نہیں مانتا۔ وہ یہی کہتا ہے ہر فیصلہ جو اس وقت کے حالات میں کیا جائے بہترین ہوتا ہے۔ یہ تو ہم بعد میں سوچتے ہیں کہ یہ کر لیتے تو اچھا ہوتا، وہ کر لیتے تو بہتر ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ وقت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ واپس آئے تو ہم پھر وہی فیصلہ کریں گے۔ تم نے بھی تو میرا غرور ہی توڑ ڈالا۔ مسلمان ہونا میرا غرور ہی تو ہے اور تم تو لادین ہو گئے۔ جس گھر کی ایک ایک اینٹ کو حلال رزق اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر کے تعمیر کیا تھا، اس میں کیسے کسی ملحد کو پناہ دیتا۔ مجھے بڑا غرور ہے

اپنے گھر پر، اپنی حلال زندگی پر پھر کیسے تم بہک گئے۔تمہاری ماں تو تمہیں دودھ پلاتے بھی بسم اللہ کا ورد کرتی تھی، رب کریم کا ذکر کرتی تھی، پھر کیا کوتاہی ہوئی مجھ سے جو میں دیکھ ہی نہیں سکا کہ تم اپنی تخلیق کو بھول گئے۔

تم تو کبھی اللہ سے محبت کرتے تھے تو کہاں کے صنم اپنے دل میں لے آئے جو خدا کو بھلا بیٹھے۔اس علم سے تو لاعلم رہنا بہتر تھا جس نے تمہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔

کاش میں نے تمہیں جاہل ہی رکھ چھوڑا ہوتا۔

میرے ناتواں کاندھے میری جواں سالہ بیٹی کا لاشہ اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے لیکن جو میرے ربّ کی رضا۔بس تم مجھے اکیلا کر گئے۔

میں نے ہمیشہ تمہیں اختر پر ترجیح دی لیکن جسے میں کوئلہ سمجھتا رہا وہی اصل ہیرا نکلا اور تم.....تم اپنی ادھار کی چکاچوند کو اپنا حق سمجھ بیٹھے۔بڑا ہی ظلم کیا۔

تم تو بلندیوں کے مسافر تھے۔نہ جانے پستی میں کیسے جا گرے۔

اسفر! کاش تم دیکھ سکتے۔میری دعا ہے تم اس منجدھار سے نکل آؤ۔میرے ربّ میرے اسفر کو روشنی دکھا دے، بھلے مجھ سے نہ ملا بس وہ حقیقت کو پالے۔''

...۞...

زمین پر پڑا وہ بے ہوش نہ تھا، دنیا و مافیہا سے بے خبر،ٹھنڈی سڑک پر آس پاس اس کا سامان بکھرا تھا۔ ہوا سے اڑتے بال اس کی خون آلود پیشانی پر چپک گئے تھے،لیکن کانوں میں ہلکی آوازیں ابھی بھی آرہی تھیں۔ آتے جاتے لوگوں کے بوٹس کی آواز، مٹی کے جوتوں کے نیچے کِرکرانے کی آواز اور پھر کنکروں کے تڑخنے کی آوازیں، گاڑی کے ٹائروں کی آوازیں، شور..... لوگوں کا، بچوں کا، گاڑیوں کا۔کیا تھا وہ؟ مٹی..... اس وقت مٹی ہی میں منہ کے بل پڑا تھا..... بے بس۔آنکھیں جھپکے بنا.....اس نے اپنی ٹانگوں اور بازوں کو ہلانے کی کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا۔ بولنے کی کوشش میں صرف غاں غوں کی آوازیں ہی اس کے منہ سے برآمد ہوئیں۔

''تم نے مار ڈالا مجھے اسفی۔'' عائزہ سامنے کھڑی تھی۔ اسفر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ یہاں کیسے آ سکتی تھی؟ آج تو اس کا جنازہ ہے۔ اُسے تو قبرستان لے جا رہے ہوں گے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھی ''تمہیں صرف اپنی فکر تھی۔ تم نے مجھ پر رحم نہ کھایا۔ میرے کمزور وقت میں میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ تم میرے قاتل ہو۔''

وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی تھی اسفر دیوانہ وار کوشش کرتا جا رہا تھا کہ اپنا جسم اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑے اور اس سے کہے اس سے غلطی ہو گئی۔

وہ ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ غلط کر دیتا تھا لیکن عائزہ اُسے سدھار دیتی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ ہل تک نہ سکا، خوف کے مارے اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔

''غوں غوں''..... زبان جیسے مڑ گئی تھی کوئی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ کیسی سزا تھی جو اسے ملی تھی۔

''مانا مجھ سے غلطی ہوئی لیکن کیا اتنی بڑی سزا کا میں حقدار تھا؟'' اس نے پھر سوال اٹھایا ''ایسے بھی کوئی سزا دیتا ہے کیا؟'' میں نے تو سرینڈر کر دیا تھا۔ پھر اب کیوں؟ کیا تو معاف کرنے والا نہ تھا؟ کیا تو نے مجھے معاف نہ کیا خدا؟ میں جانتا ہوں تو ہے۔ مگر کہاں ہے؟''

وہ چیخ رہا تھا۔ چلّا رہا تھا لیکن کوئی اس کی آواز نہ سن رہا تھا۔ ایک ایمبولنس میں ایک بار پھر اس کو کچھ لوگوں نے سفید کوٹ والوں کے حوالے کر دیا۔

اس کی زبان گنگ تھی اور جسم بے جان۔ صرف آنسو تھے جو درد کا درماں تھے۔ وہ جب چاہتا نکل پڑتے اور جب چاہتا تھم جاتے۔ کمال کی بات تھی۔ جس چیز پر اختیار تھا وہ کھو چکا تھا اور جس پر نہیں تھا اس پر کمال ہو گیا تھا۔

.....۞.....

ہسپتال کی گاڑی ایک پرسکون عمارت کے عین سامنے آ کر رک گئی۔ٹرینکو لائزر کے زیرِ اثر اسفر گم صم گاڑی میں بیٹھا تھا۔آنکھیں کھلی تھیں لیکن تمام آوازیں جیسے بس کان کے پردے سے ٹکرا کر لوٹ جا رہی تھیں دماغ اُن کو process نہیں کر پا رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی تھی اور ہلکے ٹریفک کی روانی بھی۔ کچھ پیدل چلنے والوں کی چہل پہل تو کچھ سامنے بنی عمارت کے سرسبز لان میں ورزش کرتے لوگوں کی آوازیں۔

''آ جاؤ اسفر!'' گاڑی میں موجود ایک میل نرس نے اسفر کو ہاتھ کے اشارے سے گاڑی سے اترنے کو کہا۔اسفر آہستگی سے ہاتھ کا سہارا لیے باہر نکل آیا۔دبلا پتلا وہ وجود بمشکل قدم اُٹھا پا رہا تھا۔

ایک مستعد باوردی ملازم نے اس پرسکون عمارت میں ان کا استقبال کیا۔

"Welcome to Oak Wood"

اسفر کے دماغ میں کچھ سوالات اُبھرے ''کہاں، کدھر؟''

پیرا میڈک اسٹاف نے اسفر کا کاندھا تھپتھپایا ''فکر نہ کرو اسفر تم بالکل محفوظ ہو۔تم اس جگہ ہو جہاں تمہیں ہر ممکن مدد ملے گی۔''

اسفر ابھی بھی ناسمجھی کی کیفیت میں تھا ''مدد؟'' مبہم لیکن ہمدرد چہروں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ قابل بھروسہ ہیں۔

''میں نے سرینڈر کر دیا۔'' اسفر بڑبڑایا۔اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا وہ کیا بول رہا ہے۔بس کچھ بے ربط الفاظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔

ایک پرسکون ہال میں جا بجا لوگ گول میزوں کے گرد کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔کوئی پینٹنگ میں مصروف تھا تو کوئی بلڈنگ بلاکس بنانے میں، کوئی کتاب پڑھنے میں تو کوئی کسی پزل کو حل کرنے میں۔سب خاموشی سے اپنے کام میں مگن۔

سامنے سے ایک شخص سفید کوٹ پہنے نمودار ہوا۔

"خوش آمدید اسفر! یہاں آپ کا تجربہ یقینا بہترین ثابت ہوگا۔"

دواؤں کا خمار آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ اسفر کے جسم میں کچھ بے چینی ہوئی اور اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ یہ میری جگہ نہیں ہے۔''

ایک اور سٹاف اسفر کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور ایک بستر تک زبردستی لے جانے میں اس کی مدد کی۔ اسفر مستقل بڑبڑاتا رہا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟ اوہ میرے خدا میں نے کیا کر دیا ہے۔ میں نے جھٹلا دیا۔ میں نے سب کچھ کھو دیا۔ اب وہ مجھے آگ میں جلا دے گا۔ مجھے سزا دے گا۔'' اسفر ایک بار پھر بے قابو ہو رہا تھا۔

''اسفر میرا نام ڈاکٹر پال (paul) ہے۔ میں آپ کا فزیشن ہوں۔ آپ کو جو بھی پریشانی ہے آپ مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر پال ایک ادھیڑ عمر انتہائی مہربان چہرے اور آواز کا جادو لیے وہاں موجود تھا۔ Oak Wood اسائلم کا جانا مانا ڈاکٹر۔

''میں نے خدا کے ہونے پر شک کیا۔ تمہیں پتا ہے ناشک کرنے سے سب برباد ہوجاتا ہے۔ مجھے لگا میں سب جانتا ہوں مجھے سب پتہ ہے لیکن پھر، پھر سچ میرے سامنے آیا گیا۔ خدا ہے، تمہیں معلوم ہے نا خدا موجود ہے لیکن میں نے سب کھو دیا اپنا خاندان اپنے دوست سب، وہ سب جنہیں میں پیار کرتا تھا۔'' اسفر پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر پال کے چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بستر کی سفید چادر جکڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر پال کے اشارے پر باقی دو افراد وہاں سے چلے گئے ''تو تم پھر ان سب کے بعد کیسا محسوس کرتے ہو؟''

اسفر خالی آنکھوں سے ڈاکٹر کو تکتا رہا۔ اس کا ہاتھ اپنے دل پر پڑا۔ میری بہن، میری بہن عائزہ، وہ مرگئی ہے، وہ میری وجہ سے مرگئی۔ میں اُسے مشکل وقت میں تنہا چھوڑ آیا تھا۔ میرے ماں باپ نے

مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے سب نے چھوڑ دیا۔ مجھے خدا نے بھی چھوڑ دیا۔ مجھے نفرت ہوتی ہے خود سے اور مجھے غصہ آتا ہے۔ میں سو نہیں پاتا۔ مجھے لگتا ہے میں نے بہت بڑا گناہ کر دیا ہے۔ بہت بڑا گناہ۔''

اس کی وحشت زدہ آنکھیں جیسے اس پار کچھ دیکھ رہی تھیں جس سے وہ خوفزدہ ہو رہا تھا۔

''میں ایک بھیانک خواب میں پھنس گیا ہوں۔ نکلنا چاہتا ہوں لیکن نکل نہیں پا رہا۔'' اسفر روہانسا ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر پال بغور اسفر کی حرکات وسکنات کا مطالعہ کرتا رہا اور فائل میں کچھ چیزیں نوٹ کرنے کے بعد اسفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔

''اسفر میں چاہتا ہوں تم اب مجھ پر بھروسہ کرو، میں تمہیں اس بھیانک خواب سے نکالوں گا۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ کیا تم مجھے اپنا دوست سمجھو گے؟''

اسفر نے میں ہاں میں گردن ہلا دی۔ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی کہاں تھا؟

''میں تمہیں کچھ دوائیں دوں گا جو تم باقاعدگی سے کھاؤ گے۔ ٹھیک ہے نا؟''

ڈاکٹر پال نے تصدیق چاہی۔

اسفر نے ایک جھٹکے سے ڈاکٹر پال کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔''اب اور دوائیاں نہیں پلیز۔ میں ہوش میں رہنا چاہتا ہوں۔ بہتری کی طرف گامزن ہونا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر پال کو یقین ہی نہ ہوا کہ یہ وہی مریض ہیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے قابل رحم حالت میں گھگھیا رہا تھا اور اب کسی سمجھدار انسان کی طرح اپنی بہتری چاہتا ہے۔ یہ کیس جتنا آسان نظر آ رہا تھا اتنا آسان بالکل بھی نہ تھا۔ اس بات کا اندازہ ڈاکٹر پال کو بخوبی ہو گیا تھا۔

...۞...

اسائلم کے کمرے میں چار مشترکہ بستروں میں سے ایک بستر پر بیٹھا اسفر حسرت سے کھڑکی سے باہر روشن دن کو دیکھ رہا تھا۔

جب سے وہ آسٹریا آیا تھا زندگی بہت تیز رفتار ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی میں اُسے چھ سیمسٹر مکمل کرنے تھے۔جن میں سے عین تیسرے سیمسٹر کے اختتام سے قبل ہی وہ جیل جا پہنچا تھا۔جیل سے نکلتے ہی ہسپتال اور پھر وہاں سے اسائلم۔ زندگی ایک قید کا نام رہ گئی تھی اور اس قید میں صرف جیلر بدل رہے تھے ورنہ وہ بھی وہی تھا اور قید بھی۔

آج اس کو اس اسائلم میں رہتے ہوئے پورے تین مہینے ہو چکے تھے۔تھراپی اور دواؤں نے اس کی دماغی صحت کو بہتر بنانے میں بھرپور کام کیا تھا۔ڈاکٹر پال کے خیال کے مطابق اب وہ بالکل نارمل تھا اور اس کو صرف چند دنوں کے مشاہدے کے لیے اسائلم میں رکھا جا رہا تھا۔

اسفر کو بہرحال اس بات پر بھی شبہ تھا۔ڈاکٹر پال کی کہی ہوئی یہ بات تھراپی کا کوئی اہم پہلو بھی ہو سکتی تھی اور طریقہ علاج کا ایک حصہ بھی۔

اسفر کا ایک پورا سال ضائع ہو گیا تھا۔اُسے نئے سرے سے تیسرا سمیسٹر مکمل کرنا تھا جبکہ اس کو اس بات کا بھی سو فیصد یقین نہیں تھا کہ یونیورسٹی اس کے ایڈمیشن کو برقرار بھی رکھے گی یا نہیں۔

ای میل کے ذریعے وہ اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کو کچھ حادثات کے لبادے میں لپیٹ کر یونیورسٹی میں مینجمنٹ کو آگاہ کر چکا تھا۔اور اپنا ایڈمیشن منجمد کرنے کی درخواست بھی اس نے دے رکھی تھی۔

''مبارک ہو اسفر،کل صبح تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ڈاکٹر پال یہ خبر لے کر خود اسفر کے پاس آیا تھا۔ان تین مہینوں کے دوران وہ بہت سی نئی چیزوں اور باتوں سے روشناس ہوا تھا۔کسی وقت اسفر اسے کوئی روٹھا ہوا بچہ تو کسی وقت کوئی پائے کا لیکچرار نظر آتا۔ وہ اسفر کے مشاہدے اور اس کے

نظریات سے بہت متاثر ہوا تھا اور وہ دونوں زندگی کی حقیقت کو لے کر کافی سیر حاصل گفتگو کیا کرتے تھے۔

''تمہارے ساتھ کیے گئے سارے سیشنز کی رپورٹس بہترین آئی ہیں اور تم دماغی اور جسمانی طور پر اِک دم صحت مند انسان ثابت ہوئے ہو۔''

پال کافی پر جوش تھا۔

اسفر خوش دلی سے مسکرا دیا۔ کافی دنوں سے اب وہ مسکرانے لگا تھا ورنہ تو جیسے خوشیاں اس سے روٹھ گئی تھیں۔

''آپ کا شکریہ ڈاکٹر! آپ نہ ہوتے تو ایسا ممکن نہ ہوتا۔'' اسفر نے شکر گزاری سے کہا۔

''کم آن اسفر! تم ایک قابل اور ذہین انسان ہو۔ مجھے یقین ہے یہاں سے نکلنے کے ساتھ ہی تم بہت کچھ کرو گے۔'' پال اسفر کو خوش دیکھ کر خوش تھا۔

''تو یہاں سے نکل کر پہلا کام کیا کرو گے؟ پال نے خوشدلی سے پوچھا۔

''خدا کو ڈھونڈوں گا۔'' اسفر نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا اور پال کو لگا وہ ابھی بھی وہی اسفر ہے جو پہلے دن اس کے پاس آیا تھا۔

.....۞.....

آج ذوالقرنین انٹر پرائز کا سالانہ طعام تھا۔ ہیڈ آفس کے تمام ہی ایمپلائز نک سک سے تیار PC کی لابی میں موجود تھے۔

خوبصورت سجاوٹ، مدھم روشنیاں اور اس پر دھیمی موسیقی سب ہی کو مسرور کر رہی تھی۔ طوبیٰ نے آج ہلکے گلابی رنگ کا جوڑا پہنا تھا جس پر نفیس سلور لیس غضب ڈھا رہی تھی۔ خوبصورتی سے ہم رنگ اسکاف اپنے مومل چہرے کے گرد لپیٹے وہ کوئی پری لگ رہی تھی اور اس پر آرگنزا کا پرنٹڈ دوپٹہ جو بار بار پھسل کر اس کے ہاتھوں میں ہوتا۔ دوپٹے سے الجھتی جیسے ہی وہ ہال میں داخل ہوئی فرحان کی نگاہوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔ اس کی بے قراریاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

اس کی نظریں تب تک طوبیٰ کے سراپے کا طواف کرتی رہیں جب تک وہ سب سے ملتی ملاتی آخر کار اس میز کے نزدیک نہ آ پہنچی جہاں تمام ٹاپ مینجمنٹ بیٹھی تھی۔

خوشگوار ماحول میں علیک سلیک کے بعد طوبیٰ کونے میں رکھی نسبتاً خالی میز کے اطراف میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔

''آج آپ بہت فریش لگ رہی ہیں۔'' طوبیٰ سویٹ ڈش سے لطف اندوز ہو رہی تھی تب ہی اپنے بہت قریب کسی کی موجودگی کے احساس اور پھر آواز سے وہ اچھل پڑی۔

فرحان اس بے ساختگی سے کافی محظوظ ہوا۔

''معذرت میں نے شاید آپ کو ڈرا دیا۔'' چمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں۔'' طوبیٰ اب اعتماد سے کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' جس لمحے سے بچنے کی طوبیٰ نے ہر ممکن کوشش کی تھی وہ بالآخر آ چکا تھا۔

طوبیٰ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ صنفِ مخالف کی آنکھوں میں وارفتگیاں صنفِ نازک کس خوبی سے

پہچان لیتی ہے، اس کا اندازہ کہاں لوگوں کو ہوتا ہے۔ اسی لیے زبان کا سہارا لینا ایک روایت ٹھہری ہے۔ اپنے جانے میں طوبیٰ نے کافی موقعوں پر سرد مہری کا مظاہرہ کر کے فرحان کی حوصلہ شکنی کی تھی لیکن وہ محبت ہی کیا جو منع کرنے پر باز آ جائے۔ محبت تو بس کیے جانے کا نام ہے۔ بِنا رُکے، انجام سے بے خبر۔

''جی کہیے۔''

الفاظ کا چناؤ کرتے بالوں میں انگلیاں پھیرتے کچھ اضطرابی حالت میں وہ طوبیٰ کو کسی کی یاد دلا گیا۔ طوبیٰ کو اپنا آپ انتہائی ظالم اور خود غرض لگا۔ وہ اس دن کو دوبارہ کبھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن کسی آسیب کی طرح وہ پھر اپنے آپ کو دہرا رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلی دفعہ جو شخص سامنے تھا وہ من چاہا تھا اور اب جو سامنے تھا وہ بس ایک عام مرد۔

''ویسے تو ہم کافی ہم آہنگ ہیں.....'' فرحان اب بھی اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن طوبیٰ نے درمیان میں بات کاٹ دی۔

''ایسا کیوں لگتا ہے آپ کو؟ میرے خیال میں تو ہماری بالکل ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے۔''

فرحان سنجیدگی سے طوبیٰ کو دیکھے گیا اور پھر گویا ہوا۔''میں نے ہم دونوں کے بارے میں کافی سوچا ہے۔ آپ بھی مجھ سے اور میرے بیک گراؤنڈ سے واقف ہیں۔ اور میری خواہش ہے کہ زندگی کے سفر میں بھی ہم ساتھ چلیں۔ کیا میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیج سکتا ہوں؟

طوبیٰ نے پوری توجہ سے فرحان کے بات سنی پھر ایک گہرا سانس لیا۔

''سر، میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور آپ کی خواہش کا احترام بھی ہے لیکن میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔ مجھے خوشی ہوگی اگر ہم اپنے کولیگ کے رشتے کو کسی اور رشتے کا نام نہ دینے کی کوشش کریں۔ نہ ہی دوستی، نہ ہی رشتہ داری.....''

فرحان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اُس کے تصوّر میں طوبیٰ کا گلال چہرہ تھا لیکن یہاں تو کایا ہی پلٹ تھی۔ وہ جس سے شادی کی خواہشمند ہزار لڑکیاں تھیں، اپنی من پسند لڑکی کے ہاتھوں

مسترد ہو گیا تھا۔

''آخر ایسی کیا کمی ہے مجھ میں؟'' فرحان نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

طوبیٰ کو اس بات کی بالکل توقع نہ تھی۔

''ایکسیوزمی؟'' طوبیٰ نے نہ سمجھنے والے انداز میں وضاحت طلب کی۔

''میں کہہ رہا ہوں ایسی کیا کمی ہے مجھ میں جو آپ مجھے مسترد کر رہی ہیں؟'' فرحان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر طوبیٰ ہکّا بکّا تھی۔

''سر! آپ میرے سینیئر ہیں، میں آپ کی عزت کرتی ہوں، میں اپنی رائے میں آزاد ہوں جیسے آپ آزاد ہیں۔ اگر میں نے آپ کی رائے کا احترام کیا ہے تو میں آپ سے بھی یہی امید رکھتی ہوں۔منتخب یا رد کرنے کی بات نہیں۔ میں نے آپ کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا۔''

''تو اب سوچ لو۔'' فرحان بدستور بدمزہ تھا۔لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں ایک اچھی زندگی کے اور میں تمہیں بہترین زندگی دے سکتا ہوں۔''

فرحان نے آپ سے تم پر آنے میں بس ایک لمحہ ہی لگایا تھا۔

''بہترین زندگی صرف اللہ کی ذات دینے پر قادر ہے فرحان صاحب، ہماری اور آپ کی بساط کہاں۔ لیکن میرا خیال ہے اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے تو بہت بہتر ہے۔''

''میرا پروپوزل رد کر کے تم نے میری توہین کی ہے۔'' فرحان غضبناک ہو رہا تھا اور طوبیٰ کے لیے اس بیکار بھرم بازی کو برداشت کرنا۔

''سر! اگر میں آپ کی ہر بات سے اتفاق کرتی آئی ہوں اس کی وجہ آپ کی قابلیت اور انتہائی پروفیشنل انداز ہے لیکن جہاں بات میری زندگی کے ہے، اس کا فیصلہ میں نے آپ کو کیا اپنے والدین تک کو کرنے نہیں دیا۔''

''یہ حجاب لے کر تم سمجھتی ہو بڑی spiritual ہو گئی ہو، بڑا گھمنڈ ہوتا ہے تم جیسی لڑکیوں کو اپنے اوپر۔سب جانتا ہوں میں۔'' فرحان کا غصہ طوبیٰ کی سمجھ سے باہر تھا۔

طوبیٰ ایک لمحہ کو ہکّا بکّا رہ گئی۔ جو بات فرحان نے کی تھی وہ انتہائی غیر متوقع تھی۔

''میرا حجاب میرا غرور ہے اور یہ میں صرف اپنے رب کی رضا کے لیے کرتی ہوں۔ آپ کو اس حجاب کے بارے میں کیا پتا ہے کیا نہیں مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں لیکن اس حجاب کی ہتک میرے لیے نا قابل برداشت ہے، بہتر ہے آپ اپنا وقار جو کہ اب ڈانواڈول ہے اس کو ملحوظِ خاطر رکھیے اور مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے۔''

فرحان کف اڑاتا وہاں سے جا چکا تھا اور وہ کپکپاتی سامنے رکھی میز کو سختی سے تھامے وہاں اکیلی رہ گئی۔ پیالی میں رکھی آئس کریم پگھل کر بے شکل ہوگئی تھی بالکل طوبیٰ کے اندرونی احساسات کی طرح جو اس وقت کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھے۔ شکر تھا کہ اس وقت آس پاس قریب میں کوئی موجود نہ تھا ورنہ وہ سب کو کیا وضاحتیں دیتی اس کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

محبت کے دو متضاد رخ دیکھنے کے بعد وہ ششدر تھی۔ ایک طرف اسفر تھا جو شفاف پانی کی طرح اسے سرشار کرتا باوقار انداز میں گزر گیا تھا اور ایک فرحان تھا جو پگھلے ہوئے لاوے کی طرح اپنے آس پاس کی ہر چیز کو زبردستی اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا۔

...۞...

رات وہ بستر پہ لیٹے صرف چھت کو گھور رہی تھی۔ آج کی رات وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر آج کی رات وہ سوئی تو آنکھ ہسپتال میں ہی کھلے گی نیم مردگی کی حالت میں۔ روبی کا سسکتا وجود وہ اب مزید جھیلنا نہیں چاہتی تھی۔ صیف کو اپنی آنکھوں سے روبی کے شکم میں خنجر اتارنا، بار بار موت کو اتنا قریب سے دیکھنا ایک نہ ختم ہونے والا عذاب تھا۔

...۞...

جتنی جدوجہد کا سامنا اس نے پہلی مرتبہ آسٹریا آنے کے بعد کیا تھا اس سے کچھ کم کا سامنا اسے اب تھا۔فرق صرف یہ تھا کہ اب اس کی جیبیں بھی خالی تھیں۔

''ایمل'' اس کے دماغ میں اب بس ایک ہی نام تھا۔اس کے پاس اسفر کے ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔ وہ ایڈریس جو اس نے دیا تھا اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ہسپتالوں کے چکر میں اس کا سامان ادھر سے ادھر ہوتا رہا تھا۔

''کیا مجھے جیل جا کر اس کا پتا لینا چاہیے۔'' یہ پہلا خیال تھا جو اس کے دماغ میں آیا تھا لیکن وہ اس بارے میں بالکل پر اُمید نہیں تھا کہ اسے وہاں سے کوئی بھی مدد فوراً ملے گی۔سب سے پہلے رہائش کا بندوبست کرنا تھا۔اس سرد ٹھٹھرتی اندھیری رات کا بھوت آج بھی اس سے چمٹا ہوا تھا اور وہ ایسی مزید کوئی رات اپنی زندگی میں نہ چاہتا تھا۔

خالی الذہنی کی کیفیت میں وہ کس ٹرین میں سوار ہوا اور کہاں اترا، اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔ٹرین سے اترنے کے بعد بس قدم اپنے آپ ہی کسی بھی سمت میں اٹھتے جا رہے تھے۔ جب ہوش آیا تو ایک اندھیری گلی کے سامنے خود کو کھڑا پایا۔ جہاں کوئی بے گھر شخص کچرے کے ڈبوں میں سے اپنے کام کی چیزیں برآمد کر رہا تھا۔

اسفر کو جھرجھری آ گئی اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔راستہ جانا پہچانا لگا اور ایک موڑ مڑتے ساتھ ہی اسے اندازہ ہو گیا وہ کہاں تھا۔یونیورسٹی آف ویانا کے عین سامنے۔

''مجھے یہیں ہونا چاہیے تھا'' اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔کتنی ہی دیر سامنے کھڑا وہ یونیورسٹی کے چمکتے ہوئے نام کو تکتا رہا اسے اندازہ نہ ہوا۔شاید وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ اندر جانے کے بعد اگر اُسے پتا چلا کہ اب وہ مزید وہاں نہیں آ سکتا تو وہ کیا کرے گا۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' پاس گزرنے والوں میں سے ایک مہربان صورت عورت فکرمندی سے کھڑی اس

کو دیکھ رہی تھی۔

اسفر چونکتے ہوئے حال میں واپس آیا ''ہاں!..... ہاں میں ٹھیک ہوں.....بس کچھ ڈھونڈ رہا ہوں۔''

اسفر کا جواب بے ترتیب الفاظ کی صورت میں تھا۔

''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔'' عورت نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ خستہ حال نوجوان اُسے بہت الجھا الجھا نظر آ رہا تھا۔

''آجاؤ، میں تمہیں قریبی کیفے سے کچھ کھانے کے لیے دلا دوں گی۔'' عورت نے انتہائی فراخ دلانا پیشکش کی۔

اسفر ایک لمحے کو حیران اور پھر بے حد شرمندہ ہوا۔ گویا اس کی حالت ایسی قابلِ رحم ہو چکی تھی کہ اب لوگ اسے کوئی لُٹا پٹا مسافر یا شاید قابل رحم فقیر سمجھ رہے تھے۔

اگر وہ اس وقت اپنی حالت آئینے میں دیکھتا تو وہ لوگوں کے تجزیئے کو غلط کبھی نہ کہتا۔

''نہیں، نہیں.....'' اسفر کو بے انتہا ہتک محسوس ہوئی۔ ''میں ٹھیک ہوں بس وہ.....'' اُسے شاید خود بھی نہیں پتا تھا کہ اسے کس کی تلاش ہے۔ اور جو پتا تھا وہ اس عورت سے کیسے کہتا کہ مجھے خدا کی تلاش ہے۔

''یہاں قریبی ایک شیلٹر ہے۔ اگر تمہیں کچھ وقت گزارنا ہو تو تم وہاں آ سکتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس عورت نے ایک پمفلٹ اسفر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''یہاں تمہیں ہر طرح کی رہنمائی مل جائے گی۔''

اسفر حیران تھا کہ کیسے وہ عورت فرشتہ بن کر اسے راستہ دکھانے آئی تھی۔ وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ چپ چاپ بنا کچھ کہے اور پھر شرمندگی سے سر جھکا کر پمفلٹ پر لکھا پتا سمجھنے لگا۔

...۞...

دو دن بعد جہاں طوبیٰ کے استعفیٰ نے ہلچل مچا دی تھی وہیں فرحان اس شدید ردعمل پر بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں آج تک ایسی باکمال لڑکی نہ دیکھی تھی جو جس بات کی ٹھان لیتی اسے کر کے چھوڑتی، چیلنج قبول کرنا اس کا مشغلہ تھا، بلا کی ذہین اور فطین.....مشکلوں کا حل تو جیسے اس کی انگلیوں کی پوروں پر تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچ جاتی تو اس کے سینئرز تک اُسے ہلا نہ پاتے۔ اپنے آپ کو صحیح ثابت کر کے ہی دم لیتی۔ میدان چھوڑ کر بھاگنا تو اسے آتا ہی نہ تھا۔

''طوبیٰ اکبر! میں تمہیں نے بہت ہلکا جان لیا تھا۔'' فرحان تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑایا۔ وہ جانتا تھا اگر طوبیٰ نے یہ نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو دنیا کی کوئی طاقت اُسے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی تھی کہ وہ دوبارہ وہ آفس جوائن کرے۔ سب ہی جانتے تھے اس کا مستقبل اس کمپنی میں کتنا روشن تھا اس کے باوجود وہ استعفیٰ بھیج چکی تھی۔

''میں نے کیسے یہ فرض کر لیا تھا کہ میں جیسا چاہوں گا وہ ویسا ہی کرے گی۔'' فرحان نے منہ کی کھائی تھی۔

اس کو تو طوبیٰ کا انتظار تھا کہ وہ اس سے اب چن چن کر اپنی ہتک کا بدلہ لے گا لیکن وہ تو مقابلے ہی پر نہ آئی تھی۔ اس باکسنگ رنگ میں وہ اس کو کسی جونیئر کی طرح لڑائی کے لیے پرجوش چھوڑ کر چلتی بنی تھی۔

''طوبیٰ! تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی۔ تمہارا جاب چھوڑ جانا تمہاری بزدلی ہرگز نہیں یہ تو میں جانتا ہوں، تم نایاب لڑکی ہو۔''

فرحان کو اپ پچھتاوے نے گھیر رکھا تھا۔ طوبیٰ کا اس سے اجتناب، باتوں کا پلٹنا، سنی ان سنی کرنا اسے سب یاد آ رہا تھا۔

''ہارا تو میں ہوں.....اپنا دل۔ جواب کبھی نارمل نہ دھڑک پائے گا۔''

وہ شکستہ تھا یا دل گرفتہ یا پھر مضمحل ۔ جو بھی تھا لیکن وہ اب غصے میں نہ تھا۔ وہ شخص جس کے آگے پیچھے لڑکیاں گھومتی تھیں اپنی ہی من پسند لڑکی کے ہاتھوں رد کر دیا گیا تھا۔

...۞...

اپنے بقا کی جنگ اس کے لیے اتنی بھی مشکل ثابت نہ ہوئی تھی۔ شیلٹر وہ صرف نام کا نہ تھا۔ وقتی رہائش کے ساتھ ممکنہ رہنمائی اسے واقعی بہم پہنچائی گئی تھی اور اسی کے توسط سے ایک اسٹور کیپر کی جاب اسے مل چکی تھی۔ اُسے وہاں رہتے دو ہفتے ہو چکے تھے اور اب اسے جلد از جلد خود کی رہائش کا انتظام کرنا تھا۔ فری لانسنگ کا تجربہ ایک بار پھر اس کے کام آ گیا تھا اور کسی بہتر نوکری کی بھی آنے والے دنوں میں امید دلائی گئی تھی۔

ان سب کے باوجود اس کو سکون نہ تھا۔ وہ رات بھر ایک ہی بات سوچتا رہتا۔ کون سا خدا۔ کون سا مذہب۔ ایمل نے کہا تھا اپنا آپ خالی کر دو روشنی خود بخود نظر آئے گی۔ اسلام کے علاوہ اب وہ دوسرے مذاہب کو جاننے کی جستجو میں تھا۔ خدا کی موجودگی پر یقین کے بعد اصل مسئلہ اصل خدا کی تلاش بن گیا تھا۔

ہر ثقافت، مذہب اور عقیدہ خدا کی ایک نئی تشریح دے رہا تھا۔ اور اسے کبھی کبھی لگتا کہ کوئی بھی خدا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہر کوئی اپنے عقائد، اقدار اور تجربات کی بنا پر خدا کی شکل تشکیل دے رہا تھا۔

''میں تمہیں کئی دنوں سے آتے دیکھ رہا ہوں۔''

آج بھی وہ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد اس چرچ میں بیٹھا تھوڑی دیر پہلے دی گئی تعلیمات اور لوگوں کے رویوں پر غور کر رہا تھا جب چرچ کا پادری آہستہ قدموں سے چلتا اس کے پاس آیا۔ یہ اس کا معمول ہو گیا تھا۔ کبھی کسی عبادت گاہ تو کبھی کسی اور، اسفر نے سر اٹھا کر اس کو دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑے توقف کے بعد بالآخر بول اٹھا۔

''مذاہب کی بھول بھلیوں میں کھو گیا ہوں۔ ڈھونڈ رہا ہوں کہ کوئی سِرا، کوئی حکایت، کوئی ہدایت ایسی موجود ہو جو مجھے سچ کے سچ ہونے کا پتا دے دے۔''

وہ پادری مسکراتے ہوئے قریب ہی بیٹھ گیا ''بڑے ہی عظیم تعقّب میں ہیں آپ تو۔ کوئی کامیابی نہیں ہوئی اب تک؟''

اسفر خاموش ہو گیا۔ کتنے ہی ثانیے ایسے گزر گئے۔ ''جتنا پانے کی کوشش کر رہا ہوں اتنا الجھتا جا رہا ہوں۔ معلومات کی زیادتی بھی تریاق کے بجائے زہر بنتی جا رہی ہے میرے لیے۔''

وہ سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔ کیسے نہ الجھتا۔ اب یہ صرف اس کی زندگی کا نہیں بلکہ موت کا بھی مسئلہ تھا۔

''صحیح خدا کو تلاش کرنے سے پہلے اپنے آپ سے سوال کرو کہ کیا چیز تم کو مقصد اور معنی کا احساس دلاتی ہے؟ کون سی تعلیمات ہیں جو یقین کے درجے کو چھوتی ہیں اور سب سے اہم یہ کہ تمہیں کہاں اصل سکون میسر آتا ہے۔'' جھریوں میں تجربہ چھپائے وہ شخص کامیابی کی پہیلی سمجھا رہا تھا۔ ''سب کی طرح میں بھی تمہیں اپنے مذہب کی طرف دعوت دے سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ حق کو پہچان کر تم خود اس کی طرف کھنچے چلے آؤ گے۔''

اس کی مسکراہٹ میں چھپی گرماہٹ نے اسفر کو کافی تسلی دی۔ وہ شکریہ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ ان الفاظ کو پرکھتے اس کے قدم ایک بار پھر حرکت میں تھے۔

یونیورسٹی میں اس کی اسکالرشپ کی درخواست رد کر دی گئی تھی اور اب اس کو جو کرنا تھا اپنے بل پر کرنا تھا۔ ایک چھوٹی اور سستی رہائش کا انتظام ہو چکا تھا۔ گو کہ اس کمرے کی حالت کافی خراب تھی لیکن موجود حالات میں اس سے زیادہ اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنے گھر دوبارہ بات کرنے کی ہمت ابھی بھی نہ ہوئی۔ اس چیز کے بارے میں اب وہ سوچنا بھی نہ چاہتا تھا۔ یہ سوچ ہی اُس کے لیے سوہانِ روح تھی کہ اس کے والدین اس کو اپنی زندگی کا ولن سمجھتے ہوں گے۔ ان کا سامنا کرنا تو دور وہ ان کی ہر یاد سے بھاگ رہا تھا۔

چوبیس میں سے بیس گھنٹے یا تو وہ پیسے کمانے کی دھن میں ہوتا یا پھر مختلف مذاہب کی معلومات اکٹھی کرنے میں۔ باقی اور کسی بات پر وہ فی الوقت اپنا وقت برباد نہ کرنا چاہتا تھا۔

آج بھی عجلت میں وہ اسٹور کیپر کی نوکری کے بعد ایک ریسرچ جنرل رائٹنگ کمپنی میں اپنی نئی نوکری

کے لیے نکل ہی رہا تھا تب اچانک دروازے کے ساتھ تازہ اُتارے گئے سامان کے کریٹوں میں سے نکلی کوئی نوکیلی چیز اس کی جیکٹ کو چیرتی چلی گئی۔

اسفر سخت خائف ہوا۔ اس وقت اس کو جتنی جلدی تھی اتنی ہی بڑی رکاوٹ اس کی راہ میں آئی تھی۔

وہ عجلت میں اپنی رہائش گاہ پہنچا اور پرانے سامان کو کھنگھالتے ہوئے ایک دوسری بوسیدہ گرم جیکٹ کھینچ نکالی۔ اس نے تاسف سے اپنی پھٹی ہوئی جیکٹ کو دیکھا جو ابھی کافی بہتر حالت میں تھی اور پرانی جیکٹ پہن کر تیزی سے باہر نکلا۔ اسے ابھی دو ٹرینیں پکڑنی تھیں تب کہیں جا کر وہ اپنی منزل تک پہنچتا۔

اسٹیشن پر پہنچ کر اپنے والٹ کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ وہاں موجود نہ تھا۔

''اوہ!'' بے اختیار اسفر کے منہ سے نکلا۔ جلدی میں وہ والٹ وہیں چھوڑ آیا تھا۔

وہ دانت کچکچا کر رہ گیا اور جیب میں جو مڑے تُڑے نوٹ نظر آئے ان کو باہر نکالا۔

اسے یاد نہیں تھا آخری بار اس نے یہ جیکٹ کب پہنی تھی۔ شاید تب جب وہ جیل سے باہر نکلا تھا۔ اس کی عادت نہ تھی کہ وہ کرنسی کو اپنی جیبوں میں یوں ٹھونس لیتا۔ لہٰذا اس وقت ان مڑے توڑے نوٹوں کا ہاتھوں میں ہونا باعث حیرت تھا۔

ابھی وہ نوٹوں کو سیدھا ہی کر رہا تھا جب اچانک ہی کاغذ کا ایک تہہ شدہ ٹکڑا نوٹوں کے درمیان سے برآمد ہوا۔ اس پر ایک ایڈریس درج تھا ایک لیکچر حال کا ایڈریس۔

اسفر کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔

''تو میرے یہاں پہنچنے کا یہ وقت مقرر کیا تھا آپ نے۔'' اس نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

...۞...

وہ ایک درمیانے سائز کا ہال تھا جہاں اندازاً ڈیڑھ سو لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ موجود تھی اور وہاں بس اس سے کچھ کم ہی لوگ موجود تھے۔

اسفر بھی ایک کُرسی پر براجمان ہو گیا۔ وہاں پندرہ سے لے کر اسی سال تک کے لوگوں کی موجودگی نے اسفر کو حیرت میں ڈال دیا۔ اسے لگا تھا یہ کوئی فلسفی بیان یا سائنسی ریسرچ ہوگی کیونکہ وہ ایمل کو اسی حوالے سے جانتا تھا لیکن مختلف عمر کے لوگوں کی موجودگی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ گفتگو ہر خاص و عام کے لیے تھی۔

''سائنس کی جدید تحقیقات کے بارے میں تو بہت بات کر لی ہم نے۔ اس کائنات کے رموز ہیں ہی اتنے دلچسپ کے گھنٹوں بھی بات کریں تو کم لگتے ہیں۔'' ایمل ناک پر اپنا چشمہ ٹکائے کچھ پیپرز ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اس کا حلیہ جیل میں موجود حلیے سے کچھ خاص مختلف نہ تھا۔ وہی ڈھیلا ڈالا لباس، وہی مسکراہٹ اور وہی عینک۔

''اگر میں آپ سے کہوں کہ کسی شخص نے ایک ایسا سچ جو سائنس اب ثابت کرتی ہے وہ سو نہیں بلکہ ہزار سال پہلے بتا دیا تھا تو آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہوگی؟

مجمع میں ہلکی سی بھنبھناہٹ تھی۔ بالآخر ایک شخص نے مائیک میں جواب دیا ''میں کہوں گا یہ صرف ایک اتفاق ہے۔''

''بالکل صحیح کہا میرے دوست!'' ایمل نے انتہائی خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور تالی بجا کر اس شخص کو داد دی ''میں بھی بالکل یہی جواب دیتا کیونکہ یہی سچ ہے۔''

مجمع مطمئن بیٹھا تھا۔ ایمل ان سب کے خیالات کا حامی تھا یہ بات غالباً سب کو ایک تقویت دے رہی تھی۔

''اگر میں کہوں کہ یہ آئن سٹائن جس کے کچھ کارنامے ہم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دیکھے، اس نے جو بات کہی اس کائنات کے نقطۂ آغاز کے بارے میں کہ یہ انتہائی ایک کثیف مادے کی صورت میں

موجود تھی پھر یہ پھیلنا شروع ہوئی ،حالانکہ یہ ایک تھیوری ہے اور تھیوری غلط بھی ہوسکتی ہے۔'' ایمل نے تصحیح کی۔

''تو جناب اس سے کچھ ملتی جلتی کائنات کی تخلیق کی بات جب کہ سائنس بالکل ترقی پذیر تھی، کسی اور نے بھی کہی تھی تو اب آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

پورے مجمع میں ایک بھنبھناہٹ سی دوڑ گئی۔ پہلے جواب دینے والا شخص دوبارہ اس بات کو اتفاق نہیں کہہ سکتا تھا سو وہ خاموش رہا۔

''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ انسان کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کی اس کو خبر نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کوئی مطلب ہوتا ہے۔'' بالآخر پہلے شخص کی مشکل کسی دوسرے شخص نے حل کر دی۔

''ایک اور اتفاق'' ایمل نے کندھے اُچکائے۔''میں بھی یہی کہوں گا۔ ہو جاتا ہے کبھی.....لیکن ایسے اتفاقات اگر ایک تسلسل سے ہونے لگیں تو؟''

مجمع پر خاموشی طاری تھی۔

''جو بھی ہو میرا خیال ہے تھیوریز پر سب ہی اعتماد کرتے ہیں کیونکہ بہرحال وہ جانے مانے عقلمند سائنس دانوں نے لمبے عرصے تک مشاہدات کے بعد لکھی ہوتی ہیں۔کیا آپ کو بگ کرنچ تھیوری کے بارے میں معلوم ہے؟''

ایمل نے مجمع سے سوال کیا ہوا اور پھر خود ہی جواب دینے لگا۔

''یہ تھیوری آئن سٹائین کے آئیڈیا کو مزید آگے لے جاتی ہے اور ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ کائنات جس کا آغاز ایک دھماکہ سے ہوا ایسے ہی کسی دھماکہ یہ صورت میں ختم بھی ہو جائے گی۔''

ایمل نے مجمع کی طرف دیکھا''کون مانتا ہے یہ؟''

قریباً سب ہی نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''میں بھی جانتا ہوں ایمل نے بھی اپنا ہاتھ کھڑا کر دیا۔''کیونکہ میں مانتا ہوں کہ آئن سٹائن کا علم بہت زیادہ تھا اور اس دوسرے سائنسدان کا بھی جس کا نام الیگزینڈر فرائیڈ مین ہے ان کی ہر بات کے پیچھے نہ صرف دلائل بلکہ ثبوت بھی ہوتے ہیں۔

لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ بات بھی اسی پرانے سورس (source) نے ہزار سال پہلے بتا دی تھی۔ جسے ہم بار بار اتفاق کا نام دے رہے ہیں۔

کیا ابھی بھی آپ اس کو اتفاق ہی کہیں گے؟''

مجمع پر اب خاموشی طاری تھی۔

''اسی شخص نے ہزار سال پہلے یہ بھی کہا تھا کہ ہر جاندار چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اور مائکروسکوپ کی ایجاد کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ ہر جاندار جیو زیادہ تر پانی ہی پر مشتمل ہے۔

وہی شخص کیسے بتا دیتا ہے ایمبر یولوجی کے بارے میں کہ انسان کی ابتدا ایک خون کے لوتھڑے سے ہوئی؟ اس شخص کو کیسے کوئی اتفاق کہہ سکتا ہے جب وہ فلک کے رازوں کے بارے میں بتائے کہ اوزون کی تہہ کیسے ہمیں سورج کے خطرناک شعاؤں سے بچائے ہوئے ہے۔ اگر یہ حفاظتی تہہ نہ ہوتی تو زمین اور خلا کا درجہ حرارت ایک ہوتا اور ہم میں سے کوئی یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔''

مجمع میں اب اس سائنس دان کے بارے میں جاننے کی بے چینی عروج پر تھی۔ ایمل نے اپنی خاموشی کو قابل اعتراض حد تک طول دیا۔

''پھر اس شخص نے کہا لوہا زمین پر اتارا گیا۔ ایم۔ ای۔ والرتھ کہتے ہیں لوہا زمین سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ کچھ خلائی پتھر جو زمین سے آ کر ٹکرائے ان میں لوہے کی بڑی مقدار موجود تھی اور یوں ہم لوہے سے استفادہ کر رہے ہیں۔''

''ایک پسماندہ علاقے میں بیٹھے ایک ان پڑھ کو کیسے پتا تھا کہ دنیا میں دو سمندر ایسے بھی ہیں جو آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ اس نے بتایا یہ زمین سورج ستارے سب خلا میں تیرتے ہیں اپنے اپنے مدار میں اس وقت جب یہ بات کسی نے نہ کہی تھی۔''

اسفر گنگ بیٹھا تھا۔ وہ کس دولت کو چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھا رہا تھا اسے اب اندازہ ہو رہا تھا۔

''آپ ایک دیہاتی سے جا کر پوچھیں تو کیا وہ یہ سب بتا پائے گا؟''

''تو پھر اس شخص کے پاس یہ معلومات کہاں سے آ رہی تھیں۔'' ایک پندرہ سالہ لڑکے نے تجسس سے سوال کیا ''وہ بھی یقیناً کوئی مشہور سائنسدان ہوگا۔''

''ایک عام سا آدمی تھا۔لیکن کیا آپ نے یہ مان لیا کہ یہ اتفاقات نہیں تھے؟ کیا کسی کی زندگی میں اتنے سارے اتفاقات ممکن ہیں؟''

پورا ہی مجمع اب ایمل سے متفق تھا۔

''جب اتنے سارے اتفاقات جمع ہو جائیں تو انسان کو ان کو جگ سا پزل کے ٹکڑوں کی طرح جوڑ لینا چاہیے اور یقیناً ایک ہوشیار آدمی جگ سا پزل جوڑنے میں بہت اچھا ہوتا ہے۔''

ایمل کے مسکراتے لب، روشن اور بھوری آنکھیں پرسکون تھیں۔

''آپ بتائیں آپ کس شخص کی بات کر رہے ہیں۔کیا وہ بھی نامور سائنسدان تھا؟''

ایمل نے ایک بار پھر بولنا شروع کیا''میں ایک ایسے شخص کی بات کر رہا ہوں جو آئنسٹائن سے تیرہ سو سال پہلے پیدا ہوا ایک ایسے علاقے میں جو غریب تر تھا۔ وہاں مختلف مذہب کے قبیلے آباد تھے۔ وہ لڑکا یتیم پیدا ہوا 570ء میں۔ وہ بڑا ہوا تو خاندانی تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا لیکن ایمانداری میں مشہور تھا۔ سیدھا سادہ انسان، شادی بھی کر لی تھی پھر اچانک چالیس سال کی عمر میں اس نے انکشافات کرنے شروع کر دیے۔اس وقت سائنس نے اتنی ترقی نہ کی تھی تو اس کی باتیں کسی کو سمجھ نہ آتی تھیں۔ بس کچھ ہی لوگ سمجھتے تھے اسے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اس لڑکے کی باتوں کو آئن سٹائن نے 1300 سالوں بعد کچھ تغیر کے ساتھ توجیحات کے ساتھ بتایا۔''

''کون تھا وہ شخص؟''لوگ اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب تھے۔

''آخر اس شخص کو کہاں سے پتا چل رہی تھیں یہ باتیں؟''ایک نوعمر متجسس آواز پھر ابھری۔

اس شخص کا کہنا تھا کہ کوئی عجیب مخلوق آتی ہے اس کے پاس اور اس کو یہ سب بتاتی ہے۔''ایمل نے سادگی سے کہا۔

مجمع پر ایک لمحے کے لیے سناٹا طاری ہو گیا اور پھر لوگ باقاعدہ ہنسنا شروع ہو گئے۔ پورا ہال ہنسی کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ انہیں ایمل سے ایسے مذاق کی اُمید نہ تھی لیکن ایمل کی سنجیدگی دیکھ کر آہستہ آہستہ سب ہی دوبارہ سنجیدہ ہو گئے سوائے چند ایک کے۔

''میں نے اب تک جو کہا وہ بالکل سچ ہے کچھ مذاق نہیں۔تو ایسا کب ممکن ہے وہ بھی آج سے قریباً پندرہ سو سال پہلے؟''

ایمل دوبارہ گویا ہوا تھا۔

''ایسا تو تب ہی ممکن ہے جب بنانے والا خود ہی اپنا راز چپکے سے کسی کو بتا دے ورنہ اس شخص کو کیسے پتہ چل سکتی ہیں یہ باتیں۔کیا اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ہے؟''

ایک کونے سے ایک آواز اُبھری۔''کیا معلوم اس لڑکے کا دماغ غیر معمولی ہو اور اس کے دماغ میں ایسی باتیں آتی رہتی ہوں۔انسانی دماغ ایسی کہانیاں تشکیل دے سکتا ہے جو کبھی نہ ہوئی ہوں۔''

''بشرطیکہ وہ ساری کی ساری کہانیاں بعد میں سچ نہ ثابت ہو جائیں؟'' ایمل نے انگلی کے اشارے سے یاد دہانی کروائی۔

''ہو بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی۔'' وہ شخص اب بھی متذبذب تھا۔

یعنی اتفاق؟'' ایمل نے برجستہ پوچھا۔

وہ آواز اب خاموش تھی۔آخر تھوڑی دیر بعد وہ بول اٹھا''ہو بھی سکتا ہے'' آواز کی لڑکھڑاہٹ بولنے والے کے شک کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔

"اب کے اتفاق کہنا مشکل لگتا ہے۔" ایمل نے جیسے ہی اس کی بات کی تردید کی تمام مجمع ہی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ حالانکہ کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف بھی تھا لیکن چاہے وہ حامی بھرتے یا نفی کرتے وہ منجدھار ہی میں کھڑے تھے۔

''میں تو اس شخص کو آئن سٹائن سے بھی عظیم تر شخص سمجھتا ہوں۔آپ کا کیا خیال ہے؟''

آدھے سے زیادہ لوگوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جو شخص ساڑھے چودہ سو سال پہلے دنیا جہاں اور اس کی تخلیق کے رازوں سے پردہ اٹھا دے وہ یقیناً آئن سٹائن سے بڑا سائنسدان اور ارسطو سے بڑا فلسفی ہے۔

مجمع کی اکثریت نے ایمل سے اتفاق کیا۔''بولنے کا حسن اسی کو تو کہتے ہیں، اکثریت کو اپنے دلائل سے منوا لینا'' اسفر دل ہی دل میں معترف ہوا۔

''کون تھا وہ شخص؟ کیا وہ بھی آئنسٹائن کی طرف مشہور ہے؟'' ایک نسوانی آواز ابھری تھی۔

ہر طرف ایک سکوت تھا۔ طوفان سے پہلے کا سکوت۔ اَن گنت آنکھیں ایمل پر جمی ہوئی تھیں اور ایمل پرسکون کھڑا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی فاتحانہ جھلک نہ تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور تعظیم سے کھڑا ہو گیا۔

''اس کا نام محمد بن عبداللہ تھا۔''

الفاظ تھے یا بم جو ایمل نے ان ذہنوں پر پھوڑا تھا۔ ہر طرف چہ مگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ایمل شکریہ کہہ کر محفل برخاست کر چکا تھا۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے کہا تھا میرا کام چنگاری بھڑکانا ہے باقی ہر شخص کی محنت پر منحصر ہے وہ اس چنگاری سے اپنا راستہ کتنا روشن کر سکتا ہے۔

عباس نے کہا تھا ڈھونڈنے سے خدا مل جاتا ہے۔ اُسے اس بات پر کبھی یقین نہ آیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ عباس کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ آج اُسے اس پوپ کے سوالوں کے جواب بھی مل گئے تھے۔ مذہب کی خودی اور کمال یہ نہیں کہ اس میں بازی گری کے کھیل تماشے ہوں۔ مذہب کی خوبی یہ ہے کہ عقل اور فطرت کے موافق ہو۔

ہم کم عقل انسان اپنی عقل پر اتنا زیادہ بھروسہ کر لیتے ہیں کہ غائب کو حاضر پر خاص کر لیتے ہیں یعنی جس چیز کو دیکھا نہیں اس کی قوت کو دیکھی ہوئی چیزوں کی قوت کے برابر سمجھ لیتے ہیں جیسے خدا کی قدرت کو اپنی قدرت کے مطابق قیاس کر لیتے ہیں سوچتے ہیں کہ اگر ہم کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتے تو شاید اللہ بھی اس پر قادر نہ ہو، کوئی چیز اگر دیکھی نہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہے ہی نہیں۔

حق تعالیٰ قدیم بالزات اور بالزمان دونوں ہے۔ وہ اپنے وجودِ ذاتی اور صفات میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ وہ tiem اور space دونوں سے آزاد ہے۔

آج اسفر کی تلاش مکمل ہو گئی تھی۔

...۞...

کراچی کا دو دریا سے منسلک روڈ میرا پسندیدہ ٹریک ہے۔ اس کے اوپر گاڑیاں بھاگتی نہیں بہتی ہیں۔ کشادہ اور ہموار سڑکیں ڈرائیونگ کا مزہ دو بالا کر دیتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ ہی سے ڈرائیونگ کرنے کا بہت شوق تھا۔

نوکری لگ جانے کے بعد سب سے پہلا کام میں نے یہی کیا تھا۔ گاڑی چلانا سیکھا تھا۔ اس سے تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی میرے کنٹرول میں آ گئی ہے۔ میں جب بھی بہت تھک جاتی ہوں یا ذہنی طور پر الجھن کا شکار ہوتی ہوں ڈرائیونگ کے لیے نکل جاتی ہوں، میرے پاس کوئی بہت بڑی گاڑی نہیں ہے بس ایک چھوٹی گاڑی ہے لیکن نئی نکور۔ مجھے پرانی چیزیں استعمال کرنا بالکل پسند نہیں چاہے وہ کپڑے ہوں جیولری، موبائل یا پھر گاڑی۔

جب میں چھوٹی تھی تب بھی امی سے اس بات پر اکثر ڈانٹ کھاتی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں چار سال کی تھی اور میری چچازاد کی ایک فراک امی نے مجھے پہنا دی تھی۔ ایسا ہی ہوتا تھا پہلے زمانے میں بچوں کے کپڑے جب چھوٹے ہو جاتے تھے تو وہ کوئی دوسرا بچہ استعمال کر لیتا۔

لیکن یہ بات مجھے خاص پسند نہ آئی تھی۔ میں وہ فراک پہننے ہی کو تیار نہیں تھی۔ سفید کاٹن کی فراک پر سرخ پوپی کے پھول اور اس پر پیلا دانہ۔ اونچی اور پھولی ہوئی وہ فراک بہت خوبصورت تھی۔ جب میری چچازاد عینا اُسے پہنتی تھی تو میں اس کو یک ٹک دیکھتی اور کبھی کبھی تو چھو کر بھی دیکھتی۔ شاید اسی لیے چچی جان نے فراک کے چھوٹے ہو جانے پر وہ میرے لیے دے دی تھی۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم کپڑوں کے چھوٹے ہونے کی بات کرتے ہیں حالانکہ یہ وصف انسان میں ہی پایا جاتا ہے کہ وہ بڑا، دبلا یا موٹا ہوتا جائے لیکن ہم سارا الزام کپڑوں پر ڈال دیتے ہیں۔

تو میں نے بھی ایک نئی نکور گاڑی لے ہی لی تھی۔

جو مجھے بے انتہا پیاری ہے۔ جب کوئی چیز اپنی کمائی سے لی جائے تو وہ بہت پیاری ہوتی ہے۔ بات

ہی کچھ ایسی ہے۔ میرے دکھ سکھ کی ساتھ جو ہے۔ آج بھی سرِشام آس پاس کے ماحول سے کچھ وحشت ہونے لگی تو میں گاڑی کی چابی اٹھائی ہے اور باہر کی طرف کھڑا قدم بڑھا دیئے ہیں۔

''کہاں جا رہی ہو بیٹا!'' امی کی آواز حسبِ معمول پیچھے سے آئی ہے حالانکہ میں انہیں بتانے ہی والی تھی لیکن عموماً ایسا ہوتا ہے کہ میرے بتانے سے قبل ہی وہ مجھ سے پوچھ تاچھ شروع کر دیتی ہیں۔

''امی! بس یونہی ذرا آؤٹنگ کے لیے، دل گھبرا رہا ہے۔'' میں نے اپنے سن گلاسز آنکھوں پر ٹکائے اور باہر نکل آئی ہوں۔

''سکون کو اپنے اندر تلاش کرو، باہر کا شور تمہیں کیا سکون دے گا، کچھ دیر آرام کر لو تو زیادہ بہتر ہے۔'' ایک فکر مندانہ آواز نے گاڑی کے دروازے تک میرا پیچھا کیا ہے، دل کو سکون ملا ہے لیکن دل مانا پھر بھی نہیں.....امی کو ہمیشہ سے ہی میری فکر رہتی ہے۔

ماں آخر ماں ہی ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ اولاد کی فکر اسی کو ہوتی ہے۔ امی کو بھی ہمیشہ میری فکر ایسی ہی رہتی ہے حالانکہ میری مشقت کی کہانی تو سب ہی کو ازبر ہے، کچھ اس کو میرا پاگل پن اور کچھ بے وقوفی کہتے ہیں۔ میں سب کچھ سن کر ہنسی میں اڑا دیتی ہوں۔

نظر انداز کر دیتی ہوں۔ میں جانتی ہوں یہ جدوجہد میرے لیے کیا ہے، میری کامیابی میری محبوبہ ہے، میرا جینا میرا مرنا۔ بس مجھے آگے سے آگے بڑھنا ہے، کامیاب ہونا ہے، بڑا آدمی بننا ہے۔ کسی مرد کے سہارے کے بغیر۔

بچپن میں میرے محلے میں ایک نیا جوڑا آیا تھا، روبی نام تھا اس لڑکی کا، میری آئیڈیل تھی، گاڑی چلانے کا شوق بھی مجھے اسی کو دیکھ کر ہوا تھا، میرا دل چاہتا تھا کہ میں پوری کی پوری اس جیسی بن جاؤں، بہت آئیڈیل کپل تھا۔

دونوں کا، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا، اس کے شوہر نے اس کو قتل کر دیا، میرے آئیڈیل کو خاک میں ملا دیا، بس اس دن سے مجھے مرد ذات پسند نہیں، مجھے کوفت ہوتی ہے مرد کے ساتھ سے، ایک کامیاب عورت کسی مرد سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں اپنے بل بوتے پر کامیاب ہوں اور مجھے ابھی بہت

آگے جانا ہے، اپنی زندگی سے ہر خوشی کشید کرنی ہے، اپنی زندگی آسائشوں سے مکمل کرنی ہے، تب مجھے سکون میسر آ جائے گا۔

سوچوں کے دریا کے ساتھ میری گاڑی بھی بہنے لگی ہے، تاحدِ نگاہ کھلی سڑک پھر اس پر جا بجا گاڑیاں۔ پوری رفتار سے بھاگتی ہوئی گاڑیاں۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ تھوڑی دیر سڑک ماپوں گی، کچھ گاڑیوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرونگی اور کامیاب بھی ہو جاؤ گی، پھر ایگزیٹ لے کر گھر کی راہ لوگی، لیکن تیز رفتاری کے نشے میں پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوں، ایک کے بعد ایک چھوٹی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑنے میں سرور آ رہا ہے، دوڑ میں آگے نکل جانا ایک نئی تسکین کا باعث ہوتا ہے، میری گاڑی حد رفتار کے اندر ہی دوڑ رہی ہے لیکن پھر بھی خطرناک حد تک تیز ہے۔ یکے بعد دیگرے سائن بورڈ گزرتے جا رہے ہیں، اور ساتھ ہی میرا جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر آگے آنے والی گاڑی کو ہرانے کا جنون۔

''اب مجھے واپس چلنا چاہیے۔'' اندھیرے کو پھیلتا دیکھ کر میرے دل میں سوچ آ رہی ہے۔

''بس اس گاڑی کو کراس کر کے اگلا ایگزٹ لے لوں گی۔'' میں نے تیزی گاڑی کو اوورٹیک کرنے کے بعد شرارت سے سوچا، اچانک ہی موبائل کی آواز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی، میں ایک ہاتھ سے سائیڈ پر پڑا پرس ٹٹول رہی ہوں، نظریں سامنے سڑک پر ہیں، موبائل بدستور بجے جا رہا ہے، ''کیا مصیبت ہے۔'' میں نظر پرس پر ڈال رہی ہوں، میں سخت اذیت میں ہوں، سانس رکنے لگا ہے، موبائل کی آواز دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی ہے۔

پیٹ میں شدید مروڑ اٹھا ہے، اور ایسا لگ رہا ہے سر میں سے کوئی آتش فشاں پھٹ کر باہر نکل رہا ہے، میں کراہ رہی ہوں، لیکن کوئی سننے والا نہیں، گھٹنوں پر بہت شدید تکلیف کا احساس ہے، جیسے کسی نے منوں وزن ڈال دیا ہو، اتنی تکلیف ہے کہ مجھے لگ رہا ہے، میری جان نکل جائے گی، سامنے کا منظر بھی گڈمڈ ہو گیا ہے اور کچھ بے ہنگم آوازیں ہیں، جو کانوں میں پڑ رہی ہیں، میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں مر جاؤں، اتنی تکلیف، اف میرے بازو شل ہو رہے ہیں، اب میرے سامنے کوئی

گاڑی نہیں ہے، بس گہرا ہوتا آسمان ہے، میں نے سانس لینے کی کوشش کی ہے بہت زور سے آخر کار سانس لینے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔

مجھے اپنے نیچے گیلے پن احساس ہو رہا ہے، میرا پورا بدن پسینے میں شرابور ہے اور سینے میں شدید تکلیف ہو رہی ہے اٹھنے کی کوشش میں ہوں، لیکن جسم جامد ہے، میں نے امی کو آواز دینے کے لیے لب کھولے ہیں لیکن ایسا لگ رہا ہے حلق نہ ہو کانٹوں کی سیج ہو، اف، میں بڑی مشکل سے سانس لے رہی ہوں، اور آنکھوں کی سیدھ میں دیکھ رہی ہوں۔

ایسا لگ رہا ہے اچانک ہی زمین کی گردش بدل گئی ہے۔ تب ہی تو مجھے اپنا سر نیچے اور پاؤں اوپر محسوس ہو رہے ہیں۔ ارے یہ کیا۔ کچھ لوگوں کے پیر مجھے اپنی گاڑی کی کھڑکی سے باہر نظر آ رہے ہیں۔ پیچھے کچھ گاڑیاں اب بھی گزر رہی ہیں۔ شاید میں ہی رُک گئی ہوں۔

میرے رُکنے سے کیا ہوتا ہے، زندگی تو رواں دواں رہتی ہے۔ سڑک پر دوڑتی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی کم ہو جائے تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اچانک ہی ایک زور کا جھٹکا لگا ہے اور سامنے کا منظر بدل گیا ہے۔

''اف یہ خواب۔'' طوبیٰ کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں،، سات مہینوں میں یہ گاڑی دوڑانے کا خواب اُسے تیسری مرتبہ نظر آیا تھا، مختلف سڑکوں پر۔

''آج عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی نا'' اس لیے یہ خواب نظر آیا خود کو دی گئی تسلی، دوسرا شاید لمبے سفر کی تھکاوٹ اور آج چار مہینے بعد پھر وہی خواب، کوئی اتفاق نہیں تھا۔

طوبیٰ ویسے بھی کہاں کسی اتفاق پر یقین رکھتی تھی، اس کے نزدیک محنت ہی ہر مسئلے کا حل تھا۔ وہ جیسے جیسے محنت کرتی جا رہی تھی، خوش قسمت ہوتی جا رہی تھی۔

''زندگی ایک دوڑ ہی کا نام ہے جو تیز دوڑا انعام بھی اسے ہی ملے گا۔'' یہ فلسفہ رضیہ کے سامنے اس نے کتنی ہی دفعہ بیان کیا تھا۔ شروع شروع میں تو رضیہ ناراض ہو جاتیں، ''یہ دنیا ایک گزرگاہ ہے، امتحان ہے تمہارا۔''

''ایک ہی بات ہے گزرگاہ پر بھی ریس ہی لگاتا ہے انسان، میں اپنی ترجیحات کے لحاظ سے ریس لگاتی ہوں۔''

طوبیٰ کی سوچ بدلنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ رضیہ آخر کار اب خاموش ہوگئی تھیں۔

...۞...

پچھلے پانچ سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ رمشہ اور حسنہ کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ صدیق اپنے خاندان کے ساتھ جرمنی چلا گیا تھا۔ اصغر روزگار کے سلسلے میں دبئی۔ طوبیٰ نے ان پانچ سالوں میں ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرآئی تھی۔ اس نے زندگی سے جو چاہا تھا سب کچھ ایک ایک کر کے ملتا گیا تھا۔

عزت، آسائش، سہولتیں، رزق۔

طوبیٰ کو ہمیشہ لگتا تھا کہ زندگی میں یہ سب کچھ موجود ہوتو زندگی حسین ہوتی ہے اور اس نے ہمیشہ ایک حسین زندگی کی خواہش کی تھی، اس کی زندگی بھی حسین ہوتی اگر اس میں سکون ہوتا تو۔

آج اس کے پاس سب کچھ تھا لیکن نہ جانے کیوں اب بھی وہ سکون کی دولت سے محروم تھی۔ یہاں تک کہ خوابوں نے بھی شاید اس کا پیچھا نہ چھوڑنے کی قسم کھائی تھی۔ یادداشت اس کے لیے نہ ختم ہونے والا عذاب تھی۔

''زندگی کی دوڑ میں بھاگتے بھاگتے اب میں تھک گئی ہوں۔'' اس نے ایک دن اپنی ڈائری میں لکھا تھا اور پھر خود ہی کتنی دیر اس جملے پر حیران ہوتی رہی تھی، اُسے اندازہ نہیں تھا کہ کبھی وہ تھک بھی جائے گی اور ٹھہرنے کے خواہش کرے گی۔

...۞...

کھانے کی میز پر حسبِ معمول وہ تینوں موجود تھے۔ چاہے کتنی ہی مصروفیت ہو رات کا کھانا طوبیٰ ہمیشہ ہی رضیہ اور اکبر کے ساتھ کھاتی تھی۔ صدیق کے جانے کے بعد سے گھر کا سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس کے دونوں بچے اپنے ساتھ ساری رونقیں بھی سمیٹ کر لے گئے تھے۔

''کل کتنے بجے کی فلائٹ ہے تمہاری لاہور کی۔'' اکبر نے طوبیٰ سے پوچھا جو کھانا کھانے کے بجائے رضیہ کو دیکھ رہی تھی جو صرف چاولوں میں چمچہ چلا رہی تھیں اور بمشکل ہی ایک نوالہ انہوں نے منہ میں ڈالا تھا۔

''صبح دس بجے کی فلائٹ ہے ابو!'' طوبیٰ نے آخری نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا اور پلیٹ کنارے کر دی۔

''اور واپسی؟'' رضیہ ہنوز خاموش تھیں۔ صرف اکبر ہی طوبیٰ سے بات چیت میں مصروف تھے۔

''بس تین دن میں واپسی ہے ابو! سائیٹ وزٹ کر کے رپورٹ جمع کرانی ہے، کچھ میٹنگز ہیں پھر واپسی۔'' طوبیٰ نے تفصیل بتائی۔

''ہوں.....'' اکبر خاموش ہو گئے۔

''امی کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں آپ؟'' طوبیٰ نے بالآخر رضیہ سے کہا۔

''بس..... بھوک نہیں ہے مجھے۔'' رضیہ نے پلیٹ کنارے کر دی۔

''رضیہ! کھانا کھا لو تھوڑا، تم نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔'' اکبر فکرمند ہوئے۔

''بھوک نہیں ہے ابھی، تھوڑی دیر بعد کھا لوں گی۔'' رضیہ کہتی کھڑی ہو گئیں اور برتن سمیٹنے لگیں۔

''رہنے دیں امی میں کر لیتی ہوں۔'' طوبیٰ نے برتن اٹھاتے ہوئے کہا اور رضیہ بغیر کچھ کہے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ صدیق کے بچوں سے ان کو جتنی محبت تھی اس کے سب ہی گواہ تھے۔ صدیق کے جانے کے بعد وہ ایک دم ہی گُم سُم اور اُداس رہنے لگی تھیں۔

ایک آدھ بار طوبیٰ نے ان کو چپ چاپ کمرے میں روتے دیکھا لیکن انسان کے بس میں کہاں ہے کسی کی جگہ لینا۔ ''وقت سارے زخم مندمل کر دیتا ہے۔'' کہہ کر وہ بھی چپکی رہی تھی۔

''آپ کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔'' طوبیٰ نے شرارت سے پوچھا۔ اکبر نے بھی تنہائی سے تنگ آ کر اپنے لیے مصروفیت تلاش کر لی تھی۔ مسجد ہی میں عربی گرائمر کا کورس جوائن کر لیا تھا اور اسی وجہ سے حلقۂ احباب بھی خوب وسیع ہو گیا تھا۔

''بہترین'' اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔ بس ذرا گردان مشکل سے یاد ہوتی ہے۔ ذہن کمزور ہو گیا ہے نا ورنہ ہمارے استاد تو بھئی بہت ہی محنت سے پڑھاتے ہیں۔ ایک ایک بات کو دس بار سمجھاتے ہیں تاکہ ہم کوڑھ مغز دماغوں میں بات بیٹھ جائے۔''

حسبِ معمول وہ اپنے استاد عبداللہ کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ عبداللہ صاحب کے بارے میں جتنا غائبانہ تعارف رضیہ اور طوبیٰ سے ہو چکا تھا ان کو یقین تھا کہ وہ کسی بھیڑ میں بھی اگر ان کو دیکھیں گی تو پہچان لیں گی۔ عربی کی یہ آن لائن کلاسز مسجد میں باقاعدہ شروع کرائی گئی تھیں جس سے بوڑھے، جوان سب ہی استفادہ کر رہے تھے۔

''چلیں اچھی بات ہے۔ دل لگا کر پڑھائی کریں۔ کلاس میں اول آنا ہے آپ نے۔'' طوبیٰ نے اسی انداز میں کہا جیسے اکبر اسے بچپن میں کہا کرتے تھے اور پھر وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

''امی کے لیے بھی کوئی مصروفیت ڈھونڈنے کی ضرورت ہے ورنہ ان کا ڈپریشن بڑھتا جائے گا۔'' طوبیٰ سوچ کر رہ گئی۔ ''چار سال پہلے ہی وہ ایک بہتر علاقے میں شفٹ ہو گئے تھے۔ روپے پیسے کی اب کوئی کمی نہ تھی لیکن پھر بھی حالات قابو نہیں آ رہے تھے۔

...۞...

آسٹریا سے واپسی کا فیصلہ اس کے لیے آسان نہ تھا۔ عباس اور عائشہ کا سامنا کرنے کا حوصلہ وہ ان گزرے سالوں میں اب تک نہ جُٹا پایا تھا۔ زندگی مکافاتِ عمل ہے یہ وہ جانتا تھا اور یہی خوف اسے بار بار ایک بار اپنے پیاروں سے معافی مانگنے کے لیے اُکساتا تھا۔

وہ صبح کی چہل قدمی کرنے کے بعد اب ایک بینچ پر بیٹھا تھا تب ہی ایک جوڑا اور اس کے ساتھ دو بچوں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ جوڑا جاگنگ کر رہا تھا جبکہ دونوں بچے جو قریبا پانچ اور آٹھ سال کے ہوں گے گھاس پر ادھر سے ادھر بھاگ کر کھیل رہے تھے۔ آٹھ سالہ بچی اپنے چھوٹے بھائی کا پوری طرح خیال رکھے ہوئے تھی اور اُسے مصروف بھی۔ اسفر نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں کو یک ٹک دیکھے گیا۔

''عائزہ بھی ایسے ہی میرا خیال رکھتی تھی۔'' ایک درد کی لہر دل میں اٹھی تھی آنکھ رگڑتے ہوئے اس نے جیسے ماضی کو ایک بار پھر چھپانے کی کوشش کی تھی۔

پچھتاوے کا آکٹوپس سیاق و سباق دیکھے بغیر یونہی اسے کہیں بھی جکڑ لیتا تھا اور شاید اب وہ کسک کا عادی ہونے لگا تھا۔ جو شخص شک کے برہنہ کانٹوں پر انگلیاں پھیرتا، مایوسیوں کے اجاڑ راستوں سے بھاگا تھا اس بات سے بے خبر کہ اس کا عقل پر بھروسہ ہی سب کچھ دھندلا رہا تھا وہ اب صدق و یقین کی وادیوں میں بڑھنے کے بعد بھی تشنہ تھا۔ لیکن بالآخر اس نے گرداب میں کھونے کے بعد اپنے آپ کو پا لیا تھا، اب اُسے بھی زندگی کی حقیقت سے پیار تھا زندگی سے نہیں۔

...۞...

''سر! آپ قرآن کی ہر بات کو سائنس سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو نہیں ہوتی اس کے لیے کہتے ہیں کہ ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آج جب کہ ہم بلیک ہولز کو کھوج رہے ہیں، دوسرے سیاروں کو مسخر کر رہے ہیں آپ کی باتیں حقیقت سے بھاگنے کے مترادف لگتی ہیں۔''

مجمع میں سے ایک چنچل نوجوان کا انداز بالکل مذاق اڑانے والا تھا۔

''اگر قرآن واقعی عقل والوں کے لیے نشانیاں رکھتا ہے تو ذرا یہ بھی بتا دیں کہ جنات ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟''

اسفر ہنستے ہوئے کچھ قدم آگے بڑھا۔ ایک مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ شفیق سا تاثر آنکھوں میں لیے بڑے ہی رسان سے مخاطب کو جواب دیا۔ ''آپ نے تو بڑا سادہ سوال پوچھا میں تو سمجھا آپ واقعی کسی اسرار سے پردہ اٹھانے کی بات کریں گے۔ چلیں میں آج آپ کو سائنٹیفک توجیہہ دیتا ہوں کہ جنات ہمیں کیوں نظر نہیں آتے اور اس کا اشارہ عقل والوں کے لیے قرآن میں کہاں دیا گیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جو الیکٹرومیگنٹ اسپیکٹرم بنایا ہے اس کے مطابق روشنی انیس اقسام کی ہے جس میں سے ہم صرف ایک قسم کی روشنی دیکھ سکتے ہیں جو سات رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ انسان کی آنکھ کل کائنات کا صرف 0.00003 فیصد حصّہ ہی دیکھ سکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے جنوں کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے یعنی توانائی کی ایک قسم سے۔ یہ توانائی کی قسم الیکٹرومیگنٹ اسپیکٹرم کے اس حصے میں آتی ہے جو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ جبکہ کچھ جانور جنات کو دیکھ سکتے ہیں کیونکہ ان کے دیکھنے کی صلاحیت انسان کی دیکھنے کی صلاحیت سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ روشنی کی ان شعاعوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔''

مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور اسفر اب اپنے پیچھے لگی بڑی سی اسکرین پر کچھ سلائیڈز لگا رہا تھا۔ اسکرین

پر مرغے کی آنکھ پر کی گئی ریسرچ کی تمام معلومات تصویروں کی صورت میں نمایاں تھیں۔

اسفر نے پھر کہنا شروع کیا

''ترمذی شریف کی ایک حدیث کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مرغ کی آواز سنوتو اللہ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ کہ وہ اس وقت بولتا ہے جب وہ فرشتے کو دیکھتا ہے اور جب گدھے کے رینکنے کی آواز سنوتو شیطان مردود سے پناہ مانگو کیونکہ اس وقت وہ شیطان مردود کو دیکھ رہا ہوتا ہے، اور سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ مرغ کی آنکھ انسانی انکھ سے دو معاملوں میں بہتر ہے۔ مرغ کی آنکھ میں پانچ قسم کے light receptrs ہوتے ہیں جبکہ انسانی آنکھ میں دو۔ مزید ایک مرغ کی آنکھ انتہائی تیزی سے حرکت کرتی ہوئی ان چیزوں کو بھی دیکھ سکتی ہے جن کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور گدھے کی آنکھ پر کی گئی تحقیق یہ بتاتی ہیں ہے کہ گدھے کی آنکھ میں اندھیرے میں اندھیرے کو پہچاننے کی صلاحیت ہم سے زیادہ پائی جاتی ہے۔

"واپس آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں۔dimension کا نام تو سنا ہوگا آپ نے۔ ہم انسان صرف تین ہی dimension میں حرکت کر سکتے ہیں جبکہ جنات ہم سے زیادہ dimension میں حرکت کرنے کے قابل ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالی نے فرمایا کہ وہ ہمیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ مزید یہ کہ وہ ایسی dimension میں ہیں جہاں ان کے لیے فاصلے بہت مختصر ہیں جیسا کہ سورۃ صبا میں ایک عفریت ملکہ صبا کا تخت پلک جھپکتے لے آیا تھا ان پر کششِ ثقل کا اثر اتنا نہیں جتنا ہم پر ہے۔

''الحمدللہ رب العالمین۔'' کل تعریف اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ یہاں تمام جہانوں سے مراد میری ناقص رائے میں مختلف dimensions سے وجود میں آنے والے عالم ہیں۔

لیکن یاد رکھیں یہ صرف ایک تھیوری ہے اور تھیوری بدل سکتی ہے لیکن قرآن نہیں۔''

پورے ہال میں نہ رکنے والا تالیوں کا ایک شور تھا جو اسفر کو داد دے رہے تھا اور وہ سر جھکائے اللہ کے حضور اس کی بڑائی بیان کرتے ہوئے کسی اور ہی عالم میں موجود تھا۔

...۞...

''تم پاکستان واپس چلے جاؤ۔'' ایمل نے یہ بات ایسے کہی تھی جیسے وہ بہت عام سی بات ہو۔ اسفر ایمل کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

اپنے لیے اسفر کے خیالات سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اس بات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ ایمل کچھ کہے اور اسفر وہ نہ کرے۔ اندھیری دلدل سے نکالنے کا جو وسیلہ خدا نے اسفر کے لیے چنا تھا وہ ایمل تھا اور اس احسان کا بدلہ وہ قیامت تک نہ اتار سکتا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اسفر ابھی تک ایمل کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پہ ششدر تھا۔ پچھلے سالوں میں جو تحقیق ان دونوں نے ساتھ کی تھی وہ اب تک کا بہترین کام تھا۔ فلسفے اور جدید تحقیق کے کتنے ہی مقالے وہ پیش کر چکے تھے اور آنے والے تین سالوں میں بھی کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی جو انہیں سرانجام دینا تھی۔

''آپ جانتے ہیں نا مجھ میں اپنے ماں باپ کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں نے غلطی کی تھی۔'' اسفر نے اپنے آپ میں ندامت کا اظہار کیا۔'' اور ویسے بھی ابھی اتنے کام ہیں کرنے کے لیے۔'' اسفر نے آنکھیں چرائیں۔

ایمل نے ایک گہری سانس لی۔'' اللہ نے اپنا ایک وصف والدین کو دیا ہے اسفر! اللہ معاف کر دیتا ہے۔ جیسے ہم حوالہ دیتے ہیں نا محبت کا کہ اللہ ماں سے ستّر گناہ زیادہ محبت کرتا ہے تو سوچو اللہ تو بے حساب محبت کرتا ہے تو میں ماں بھی تو ستّر کا ایک حصہ محبت کرتی ہے۔ وہ ایک حصہ بھی اولاد کا بڑے سے بڑا گناہ معاف کرنے کے لیے کافی ہے۔''

ایمل کی آنکھوں کی تشنگی اسفر کے لیے بالکل نئی تھی۔

''اللہ تو معاف کرنے والا تھا، میرا گناہ بھی عائزہ کو بلانے سے پہلے معاف کر دیتا۔'' سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسفر آج پھر اللہ سے شکایت کرنے بیٹھ گیا تھا۔

ایمل اسفر کا ہاتھ تھامے گھر کے پائیں باغ میں لے آیا اور ایک درخت کے پاس لا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔'' یہ درخت میں نے اور میرے بابا نے ساتھ لگایا تھا۔ وہ مجھ سے بے پناہ پیار کرتے تھے،

سارے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ۔ پھر میں نے اپنا دین بدل لیا۔ مسلمان ہو گیا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے لیکن میری نشانی کو سینچتے رہے۔ آخری عمر میں انہوں نے مجھے معاف کر دیا حالانکہ میں نے بھی ان کا بڑا نقصان کیا تھا۔''

ایمل کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اپنے جذبات کو سنبھالنے کے لیے۔

''میں تو ان کے دین پر واپس بھی نہ آیا تھا پھر بھی انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ اگر وہ دونوں حیات ہوئے تو ان کی خدمت کر سکو گے اور اگر اپنے خالق سے جا ملے ہوں گے تو ان کے لیے دعا تو کر سکو گے۔ میرے پاس تو دوسرا والا آپشن ہی نہیں، میں موحد ہوں اور وہ مشرک۔''

اسفر نے پہلی بار ایمل کو غمگین دیکھا تھا ورنہ اس سے زیادہ مسکرانے والا شخص کوئی کہاں تھا۔

...۞...

رات گئے طوبیٰ اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی میز پر بکھرے کاغذوں کو دیکھ رہی تھی۔ دن کا سائیٹ وزٹ انتہائی تھکا دینے والا تھا اور اس پر لمبا سفر۔ وہ مشین کی طرح کام کرنے کی عادی تھی لیکن آج اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

اسے ایسا لگا اس کی زندگی بھی ان کاغذوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ سب کچھ سامنے تھا لیکن منزل کے وہ جتنا قریب جاتی وہ اتنا ہی دور ہو جاتی جا رہی تھی۔ اُسے عجیب سی تھکن نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا لیا۔ وہ جب چھوٹی تھی تب بھی یہی کرتی تھی۔ یہ جیسے منظر سے غائب ہو جانے کی ایک سعی ہوتی۔ زندگی آج بھی ویسی ہی تھی۔ اکھڑ، خود سر اور وہ اپنے آپ کو بھی ویسا ہی محسوس کر رہی تھی.... نڈھال۔

''اللہ میاں! جتنا آگے بڑھتی ہوں اتنا خود کو پیچھے پاتی ہوں، آپ مجھے میری منزل تک پہنچا کیوں نہیں دیتے؟'' اس نے اللہ سے شکوہ کیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ رات کے اس پہر فون پر اکبر کا نام دیکھ کر وہ فون ریسیو کیے بغیر ہی جان گئی تھی کہ کراچی میں خیریت نہیں تھی۔

...۞...

رضیہ کو مائنر ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ یہ اطلاع جب طوبیٰ کو ملی تھی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کام کا دباؤ اس پر بڑھتا جا رہا تھا اور وہ آفس کے کام سے اب اکثر ہی کسی نہ کسی دورے پر ہوتی۔ کہنے کو پاکستان ہی میں ہوتی لیکن گھر پر گزرنے والا وقت اب قریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

جو بھی پہلی فلائٹ اسے میسر آئی تھی وہ اسے بک کروا کر اس وقت ایئرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں موجود تھی۔

پانچ اولادوں کو پال پوس کر جوان کیا تھا اکبر اور رضیہ نے اور پانچوں اولادوں نے خوب حق نبھایا تھا۔ ہر خوشی دی اپنے والدین کو، ہر آسائش دگنی کر کے لوٹائی تھی۔ نہ دے پا رہے تھے تو وہ تھا وقت جس کی شاید عمر کے اس حصے میں ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

''زندگی بھی کیا گھن چکر ہے، جب جو چیز میسر ہوتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی اور جو چاہیے ہوتا ہے وہ مل جائے تو جو چلا گیا اس کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔''

طوبیٰ نے کڑواہٹ سے سوچا۔ اسے تنگدستی کا وہ زمانہ نہ بھولتا تھا جب رضیہ بھی اکبر کا ہاتھ بٹانے کو محلے کی عورتوں کے کپڑے سلائی کرنا شروع ہو گئی تھیں۔ جس دن صدیق کی نوکری لگی تھی وہ دن رضیہ کی سلائی کا آخری دن تھا۔

اپنے بھائی صدیق سے وہ ہمیشہ ہی سے متاثر تھی۔ ایک مکمل انسان۔ لیکن انسان چاہے کتنا ہی مکمل ہو، قسمت اور رزق کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔

''مجھے ڈر ہے طوبیٰ کہ جب امی ابو کو میرے وجود کی ضرورت ہو تو میں ان کے پاس نہ ہوں۔''

صدیق نے جانے سے ایک دن پہلے طوبیٰ سے اپنا اندیشہ بیان کیا تھا اور طوبیٰ نے تسلی دی تھی کہ وہ ہر پل ان دونوں کا خیال رکھے گی لیکن وہی روزگار کے چکر طوبیٰ کے پاؤں بھی اب جکڑ رہے تھے۔

وہ زندگی میں کبھی کسی پر بوجھ نہ بننا چاہتی تھی۔ بیٹی نہیں ہمیشہ بیٹا بننا چاہتی تھی۔ وہ بن گئی تھی بیٹا..... بیٹی ہوتی تو اس تکلیف دہ وقت میں رضیہ کے ساتھ ہوتی جیسے رمشہ اور حُسنہ اس وقت موجود تھیں۔

سوچوں کا سلسلہ بورڈنگ کے اعلان کے ساتھ ہی منقطع ہو گیا تھا اور طوبیٰ ہینڈ بیگ کاندھے پر ڈالتی

داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

...۞...

آسٹریا سے واپسی پر اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔ پاکستان سے جاتے وقت وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح کچھ نہ پھسلا تھا۔ سب چیزوں سے وہ خود دامن چھڑا کر بھاگا تھا۔ حتی کہ اپنی شناخت سے بھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں وہ کافی ملکوں کے سفر کر چکا تھا لیکن پاکستان واپس آتے ہوئے اسے ایک عجیب کیفیت نے گھیر رکھا تھا۔

وہ آنکھیں موندیں سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے مستقل اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تواتر سے حرکت کرتے اس کے پاؤں اس کے ذہنی انتشار کا پتا دے رہے تھے۔

عباس کا چہرہ آنکھوں میں گھوما تو یک لخت اس نے ایک ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔ بچپن میں عباس اس کے آئیڈیل تھے اور جب بڑا ہوا تو اپنے ہاتھ سے اپنے آئیڈیل کو برباد کر کے آیا تھا۔

دو آنسو اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے بہنے لگے تو اس نے چپکے سے ان کو صاف کیا۔

''کیسا نامراد تھا میں!'' دل نے ایک آہ بھری۔

دل میں اِک خوف تھا بس جس کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بس ایک بار اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو دیکھنے کی تمنا تھی اور لب پر دعائیں۔ اگر کوئی اس مایہ ناز سائنٹسٹ کو دیکھ لیتا تو شاید حیرت کے سمندر میں غوطے لگاتا کہ کوئی سائنسدان اتنا جذباتی بھی ہوسکتا ہے۔

جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر آنے جانے والے لوگ تعجب سے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جو لوگوں کے بیچ و بیچ سجدہ ریز روتا ہی جا رہا تھا۔ وطن کی مٹی کیا ہوتی ہے اس کی قدر آج کوئی اسفر سے پوچھتا۔

ڈیوٹی پر موجود عملے میں سے ایک فرد بالآخر اس کے پاس آیا اور سہارا دے کر انتظار میں بیٹھنے والوں کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بٹھایا۔

شاید ایسا نظارہ اُسے کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا تب ہی وہ اسفر سے کافی متاثر نظر آ رہا تھا۔

''بھائی جان! مبارک ہو، اپنی سرزمین پر لوٹ آئے ہو۔ بس پانی پیو اور جا کر اپنے پیاروں سے ملو۔''

اسفر اس کے ہاتھ سے پانی کی کھلی بوتل لے کر غٹا غٹ چڑھا گیا جیسے کوئی لمبی مسافت طے کر کے آیا ہو۔

''کتنے عرصے بعد آئے ہو؟'' وہ شخص کافی متجسس تھا۔

''دِنوں کی گنتی تو کبھی کی نہیں میں نے، لیکن مسافت بہت طویل تھی۔ بس خوشی ہے کہ بہت کچھ پا کر لوٹا ہوں۔''

یہ سنتے ہی اس شخص کے باچھیں بھی کھل گئی تھیں۔ اس نے یہی قیاس کیا تھا کہ اسفر اس مال کی بات کر رہا ہے جو ولایت سے لوگ کما کر آتے ہیں۔ اسفر بھی اب سنبھل چکا تھا اور شکریہ کہہ کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک اس سے کچھ یاد آیا۔ جیب سے والٹ نکال کر سو یورو کے دو نوٹ اس شخص کی ہتھیلی پر دھر دیے۔ اس شخص کی خوشی دیدنی تھی۔ نہ جانے کتنے مسائل کا حل اِن دو سو یورو میں تھا جو وہ یوں خوشی خوشی وہاں سے چل دیا تھا۔

تھوڑی دقّت کے بعد بالآخر وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہی دروازہ وہی در و دیوار۔ رنگ و روغن تھوڑا بدل گیا تھا لیکن اس گھر کو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے پوری گلی میں وہ گھر سب سے شاندار ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب آس پاس کے گھر قد آور ہو چکے تھے اور کبھی کا عروج آج کے زوال میں بدل چکا تھا۔ اسفر نے اپنے لب بھینچ لیے جیسے وہ اپنے لبوں کی کپکپاہٹ پر قابو پا رہا ہو۔ یادوں کا ایک بھنور تھا جس میں وہ گھوم رہا تھا۔ نہ ڈوب رہا تھا نہ ابھر رہا تھا۔ بس گھومتا جا رہا تھا۔ جتنی گرہیں اس نے اپنے دل میں لگائی تھیں، اللہ نے ایک ایک کر کے ساری کھول دی تھیں۔ اس کے سارے سوالوں کے جواب اللہ نے کئی سو سال پہلے ہی دیئے تھے وہ ہی بے خبر تھا جو اُسے زحمت ہی نہ ہوئی تھی اس گھر میں رہتے ہوئے انہیں کھوجنے کی۔

''کون ہے؟'' بالآخر ایک نحیف آواز اس کو اس بھنور سے واپس کھینچ لائی تھی۔

ایک ایک لمحہ ایک صدی بن گیا تھا۔

''کون ہے؟'' کوئی جواب نہ پا کر سوال کرنے والے نے اب سوال دوبارہ کیا تھا۔

''میں۔'' اسفر نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''اس وقت کون ہے؟'' دروازے کے پیچھے سے ہم کلامی کی آواز اور پھر دھیرے سے دروازہ کھل گیا۔ اسفر کو عباس کا چہرہ پہچاننے میں دقّت ہوئی۔ اس نے اتنا بوڑھا تصور نہیں کیا تھا۔ سامنے کھڑا شخص تو جیسے اسّی برس سے بھی زائد دکھائی دے رہا تھا۔ اسفر یک ٹک اُنہیں دیکھے گیا۔

''کون ہو بیٹا؟'' عباس نے اپنا موٹا چشمہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔ اسفر اب تک حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے غم نے ان کے والد کی بینائی چھین لی تھی ویسے ہی رو رو کے شاید عباس بھی آہستہ آہستہ بینائی گنوا رہے تھے۔

''ابّو.....'' رُندھی ہوئی آواز جیسے بمشکل حلق سے نکلی تھی۔

عباس، شناسا خدوخال کو یک ٹک دیکھے گئے۔ گھنی خوبصورت ڈاڑھی اور آنکھوں پر لگا چشمہ پہچان کو مشکل بنا رہا تھا۔

''میں نے اللہ کو ڈھونڈ لیا ہے۔'' بمشکل اسفر کے منہ سے الفاظ ادا ہوئے اور وہ عباس کے ہاتھ چوم کر ان کے قدموں میں چوکھٹ ہی پر بیٹھ گیا۔

''اسفر.....'' عباس کے منہ سے آواز سرگوشی کی سی صورت میں نکلی تھی۔ اور اس کے بعد ان کے لیے بھی جیسے کھڑا ہونا محال ہو گیا تھا۔

گڑھوں میں دھنسی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ذرا جو لڑکھڑائے تو اسفر نے مضبوط بازوؤں میں عباس کو سنبھال لیا۔ صحن میں پپیتے کے درخت کے کنارے ایک چھوٹا سا تخت رکھا تھا جس پر ہلکے سبز رنگ کی ایک پرانی چادر بچھی تھی۔ اسفر عباس کو سنبھالتے تخت تک لے کر آیا۔

عباس اب ہچکیوں سے رو رہے تھے۔ بنا کچھ کہے۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ مرد ہو نا بھی بڑا مشکل ہے۔ جتنا ہی کٹھن وقت ہو چٹان بنے رہنا پڑتا ہے۔ آج بالآخر چٹان ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

نہ جانے کتنی ہی دیر دونوں باپ بیٹے سر جوڑے آنسو بہاتے رہے۔ جب آنسو تھمے تو عباس نے گہرا سانس لیا اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اسفر کے چہرے کو ٹٹولا جیسے چھو کر یقین دہانی کرنا چاہتے

ہوں کہ وہ اسفر ہی تھا۔

''میں نے کہا تھا نا، ڈھونڈو گے تو اللہ بھی مل جائے گا۔''

سنہرے دن میں جیسے اچانک برسات کے بعد سب کچھ نکھر جاتا ہے ویسے ہی آس پاس سب کچھ نکھر گیا تھا۔

''سب لوگ؟'' ایک انجانے خوف نے اسفر کو بات نہ مکمل کرنے دی۔

عباس نے گہرا سانس لیا۔''اختر آفس گیا ہوا ہے اس کی بیوی بچوں کو لے کر میکے گئی ہوئی ہے۔ عافیہ تو اسلام آباد میں ہوتی ہے ہر تین مہینے پر چکر لگاتی ہے۔''

موت جیسی خاموشی جب اعصاب شکن ہوگئی تو بالآخر اسفر کو دوبارہ لب کھولنے پڑے۔

''اور امی.....؟'' اس کو اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جس حالت میں وہ عائزہ کو چھوڑ کر گیا تھا وہ آج بھی اس کے دماغ میں نقش تھا۔ لاغر جسم، پیلا چہرہ، بالوں سے عاری سراپا، عائزہ کا نام زبان پر لانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔

"تمہاری امّی تو چلی گئیں عائزہ کے پاس، دونوں لوٹ گئیں جہاں سے آئی تھیں۔"

عباس کی ہنسی ان کے رونے کے ساتھ مضحکہ خیز لگی۔ پھر اچانک ہی انہوں نے اسفر کو چونک کر دیکھا جیسے پوچھنا چاہتے ہو کہ تم نے عائزہ کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا۔ لیکن اسفر کی آنکھوں میں دیکھتے ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ان سے اتنا بھی بے خبر نہ تھا جتنا انہوں نے سوچ رکھا تھا۔ عباس پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

ایک مضبوط شخص کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنا بہت مشکل تھا۔ وہ شخص جس کی جوان اولاد آخر کار ایک عرصے بعد لوٹ آئی تھی لیکن اس کی شریک حیات راہ تکتے تکتے ایک لمبے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

اسفر جامد تھا۔ کوئی دیکھتا تو یہی تصور کرتا کہ کوئی پتھر کی مورت ہے۔ صرف ایک چیز اس کے جاندار ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے تواتر سے گرتے آنسو۔ اپنی جستجو کی بہت بڑی قیمت چکائی تھی اس نے۔

...۞...

''اب کیسی ہیں امی؟'' رضیہ کو اس حالت میں دیکھ کر طوبیٰ کا دل بھر آیا تھا۔ کمزوری اور تکلیف سے ان کا چہرہ بالکل پیلا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے ابھی بھی انتہائی نگہداشت میں رکھا تھا۔''اگلے چوبیس گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔'' ڈاکٹر کی آواز دماغ میں الارم کی طرح بج رہی تھی۔

رضیہ نے آنکھوں کے اشارے سے آرام آنے کا بتایا تھا اور مسکرانے کی بھی کوشش کی تھی۔

''مریضہ کو آرام کرنے دیں۔'' نرمی سے نرس نے کہہ کر طوبیٰ کو باہر کا رستہ دکھایا۔

''وہ کراچی کا نامی گرامی ہسپتال تھا۔طوبیٰ کو تسلی تھی کہ رضیہ جلد صحت یاب ہو کر گھر آ جائیں گی۔

سامنے سے اکبر کو آتے دیکھ کر طوبیٰ دوڑ کر گلے لگ گئی۔ آج بھی بالکل اسی طرح وہ اکبر کی بانہوں میں جا کر سب بھول جانا چاہتی تھی لیکن اکبر کے کپکپاتے جسم سے اندازہ ہوا کہ انہیں بھی اب کسی سہارے کی ضرورت تھی۔

واپس بیٹی بننے کی نئی خواہش فوراً ہی دم توڑ گئی۔

''اب امی کا اور خیال رکھنا ہوگا ہمیں۔'' طوبیٰ نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ہسپتال کے کیفیٹیریا میں دونوں باپ بیٹی سوچ رہے تھے۔

''بس بیٹا! تنہائی کھا رہی ہے تمہاری امی کو۔ رضیہ بھرے پُرے گھر میں رہی ہے ہمیشہ لیکن اب اس بڑھاپے میں جب کوئی بات کرنے والا نہیں ملتا تو نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی ہے بس اور مجھ سے چھپ چھپ کر روتی ہے۔''

اکبر متفکر تھے''سب کو یاد کرتی رہتی ہے ہر وقت۔''

''میں کوشش کروں گی ابو کہ اب امی کے پاس ہی رہوں زیادہ وقت۔''

''ارے نہیں بیٹا!'' اکبر شرمندہ ہوئے، میں تم سے کوئی شکایت تھوڑی کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم کام کے سلسلے ہی میں مصروف رہتی ہو تو بس اس لیے ہی.....''

طوبیٰ نے اکبر کو خاموش دیکھ کر کافی کا کپ آگے بڑھا دیا۔ اکبر نے بھی موضوع بدلنے ہی میں عافیت جانی۔ کچھ مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ ان سے نظریں چرانا ہی اچھا ہوتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ

نظریں چرانے سے کتنا گھاٹا ہو رہا ہے۔

...۞...

بہت دیر بعد اسفر نے دونوں ہاتھ سمیٹ کر عائشہ اور عائزہ کے لیے دعا کی اور عباس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خلاؤں میں گھور رہے تھے جیسے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔ اس بیٹے سے بات کرنے کے لیے جس سے دس سال کے عرصے میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

''بہت یاد کرتی تھیں دونوں تمہیں اپنے آخری وقت میں اور تمہارے لیے دعائیں مانگا کرتی تھیں اور دیکھ لو ان کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ تم نے اللہ کو ڈھونڈ لیا اور کامیاب و کامران واپس آ گئے۔''

عباس کے ہاتھ ہلکے ہلکے لرز رہے تھے۔ اسفر کو لگا وہ اسی سال بوڑھا کوئی شخص ہے جو بمشکل اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہو اور ایک کہانی نویس کی طرح وہ ماضی میں ڈوب گیا ہو اور سامع کو بھی وہیں کھینچ لے جا رہا ہو۔

اسفر یک ٹک اس کمزور سراپے کو دیکھے اور سُنے گیا۔ ایک مجرم کی مانند۔ ان سب کا قصوروار وہ تھا۔ عائزہ کیسے سسک سسک کر اس دنیا سے رخصت ہوئی یا عائشہ کس غم میں ہلکان ہو کر گھل گئیں۔ خاموشی کی زبان اور عباس کی آنکھوں کے سناٹے اسفر کو سب سمجھا گئے تھے۔

.....۞.....

رات کا سناٹا اسفر کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ بستر پر چت لیٹا چھت پر لگے پنکھے کو دیکھ رہا تھا جو تیزی سے گول چکر کاٹ رہا تھا۔

آخری بار جب اس نے عائشہ اور عائزہ کو دیکھا تھا وہ دونوں رو رہی تھیں، بلک رہی تھیں اُسے روکنے کے لیے لیکن وہ نہیں رکا تھا۔ اور آج جب وہ واپس آیا تھا تو وہ دونوں ہی نہیں تھیں۔ اسفر کا جسم جیسے کانچ کا ہو کر ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ کوئی بھی بُری خبر سن کر اسے تکلیف ہو گی لیکن اتنا کرب اور اذیت ہو گی اس کا اس کو اندازہ نہ تھا۔

''اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن'' اس نے زور زور سے ورد شروع کر دیا۔ اس کا پچھتاوا آنسو بن کر ایک بار پھر آنکھوں سے رواں ہو چکا تھا۔

''تم سوئے نہیں ابھی تک؟'' عباس کھلے دروازے سے مہمان خانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ خود بھی نیند نہ آنے پر ہی اٹھ کر باہر صحن میں ٹہلنے نکلے تھے اور تب ہی اسفر کی آواز سن کر اس کی طرف آ نکلے۔

''بہت تکلیف میں ہوں ابّو!'' اسفر اٹھ بیٹھا تھا۔

عباس چپ رہے، کہتے بھی کیا۔ اسفر نے عباس کو بستر پر بٹھایا اور ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھ گیا جیسے اسے ان ہاتھوں کو تھامنے سے کوئی توانائی مل رہی ہو۔

''تمہارے جانے کے بعد مجھے ہر مرتبہ یہ احساس ہوتا تھا کہ میں نے تمہیں اس منجدھار میں چھوڑ کر غلطی کی۔'' عباس کی آواز پُرتاسف تھی

''جب کوئی بچہ بازار میں کسی چمچماتے کھلونے کے لیے ضد کر کے ہاتھ چھڑا کر بھاگے تو اُسے جانے دیتے ہیں کیا؟'' عباس ایک بار پھر اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''گھر چھوڑنے کے بعد بارہا میں نے یہ بات سوچی، کہ میں اتنی نفرت کا حقدار نہیں تھا۔'' اسفر نے یونہی ہاتھ پکڑے بیٹھے بیٹھے کہا۔ میں بہت متنفر تھا۔ ایک تو اس دنیا کے میلے میں کھو گیا اور اوپر سے میرے اپنوں نے بھی مجھے دھتکار دیا۔''

عباس نے درد کی شدت کو چھپانے کے لیے آنکھیں میچ لیں اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ پتا نہیں کیا چھپانا تھا انہیں۔

''لیکن سب کچھ اللہ کے پلان کا حصہ تھا اور وہ ہمیشہ ماسٹر پلان بناتا ہے۔ اگر میں تب نہ کھوتا تو کبھی اپنے آپ کو نہ پاتا۔''

ایک ہی جملے میں اسفر نے عباس کے سارے پچھتاووں کو خاک بنا دیا تھا۔

عباس نے اسفر کو اپنے سینے سے لگا لیا

''مجھے فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔'' عباس کی آواز نے جیسے اسفر کا ہر زخم مندمل کر دیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اپنی اسکول لائف میں وہ جب کوئی مقابلہ ہار جاتا تھا تو مضمحل عباس کے پاس آ کر کھڑا ہو

جاتا تھا اور عباس ہمیشہ اس کا کاندھا تھپتھپا کر کہتے تھے ''مجھے تم پر فخر ہے'' اور اسفر اسی میں خوش ہو جاتا تھا۔ ہر مقابلہ بے معنی ہو جاتا تھا۔

''اللہ نتیجہ نہیں ہماری کوشش دیکھتا ہے۔'' اس بات کا صحیح مطلب اسفر کو اب سمجھ میں آیا تھا۔

''شادی نہیں کی تم نے ابھی تک؟'' عباس کے سوال نے پہلے اسفر کو حیران کیا اور پھر مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''نہیں ابّو، یہ سکھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے شاید۔ کسی لڑکی کو اپنی عزت بنانے کے قابل نہیں ہوں میں ابھی۔'' اسفر نے عام سے لہجے میں کہا۔

''تمہیں تمہاری شریک حیات کسی اجر کی صورت ملے گی۔'' عباس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''جب ہم اللہ کی راہ پر چل پڑتے ہیں تو اللہ ہماری من پسند ہر نعمت ہمارے قدموں میں ڈھیر کر دیتے ہیں۔''

اسفر چپ چاپ سنتا رہا۔ اسے معجزوں پر پورا یقین تھا۔ اس کی زندگی بھی کسی معجزے سے کم نہ تھی۔

''ابّو! مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اب میں کبھی نہ بھٹکوں۔'' اسفر روہانسا ہو رہا تھا

''میں جانتا ہوں اللہ سزائیں دیتا ہے لیکن وہ ہمارے اپنے اعمال کی لائی ہوئی نتائج ہوتے ہیں۔ لیکن اب میں زندگی میں مزید کچھ کھونا نہیں چاہتا۔''

''اللہ تمہیں دونوں جہانوں میں سرخرو کرے۔'' عباس نے محبت سے اسفر کا شانہ تھپتھپایا۔ حیّ علی الفلاح کی صدائیں فضا میں بلند ہوئیں تو عبّاس اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو آج مسجد چلیں، مجھے بہت سے لوگوں سے ملوانا ہے تمہیں۔"

''بابا مجھے شرم آئے گی۔'' اسفر اب تک جہاں گیا تھا وہاں اس کا ماضی کوئی نہ جانتا تھا لیکن جہاں عباس اسفر کو لے جا رہے تھے وہاں ہر شخص اسفر کے تاریک ماضی سے واقف تھا۔

''تم جانتے ہو تمہارے نام کا کیا مطلب ہے؟'' عباس نے ملائمت سے پوچھا۔ اسفر جانتے بوجھتے انجان بن گیا! ''آپ بتائیں مجھے۔''

عباس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔''اسفر کا مطلب ہے وہ روشن ہوا، یہ اسفار سے نکلا ہے جس کے معنی روشن ہونے کے ہیں۔ جب میں نے یہ نام رکھا تو عائشہ نے مجھ سے پوچھا یہی نام کیوں؟ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں اس کو روشن ستارہ بنانا چاہتا ہوں۔''

عباس اپنی ہی بات پر ہنسے تھے۔''میری کیا بساط تھی کہ میں کسی کو کوئی ستارہ بناؤں۔ وہ تو اللہ ہے جس کو چاہتا ہے پروان چڑھاتا ہے جس کو چاہتا ہے مٹی میں ملاتا ہے۔تم میرا فخر ہو اسفر،تم نے اللہ کو ڈھونڈا ہے، پہچانا ہے،تم میرا روشن ستارہ ہو۔''

اسفر نے ایک بار پھر عباس کے ہاتھ چوم لئے۔نم آنکھیں لئے وہ جتنا رب کا شکر ادا کرتا وہ کم تھا۔

مسجد کی دیوار پر خوبصورت خطاطی وہ اضافہ تھی جو اسفر کی یاداشت میں موجود نہ تھی۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظّٰهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (سورۃ الحدید)

''وہ اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے۔ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

...۞...

''السلام علیکم!'' طوبیٰ نے چہک کر مستقل بجتے فون کا جواب دیا۔

''آج بہن کی یاد کیسے آ گئی آپ کو؟''

''وعلیکم السلام!'' صدیق نے بھی اسی گرمجوشی سے جواب دیا تھا

''میں نے سوچا بہن کو تو صرف اپنے بھتیجا بھتیجی ہی یاد رہتے ہیں تو آج ہم اپنا نام اور چہرہ بھی یاد کرا دیں۔'' صدیق نے بھی جواباً شکوہ کر ڈالا۔

طوبیٰ کھل کر ہنسی'' کیسے ہیں تیمور اور ہانیہ؟ میری تو دو دن سے ان سے بات نہیں ہوئی۔ پوری ویڈیو کال میں امی کے ساتھ ہی لگے رہتے ہیں۔پھپھو کو تو پوچھتے ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہیں۔تم کیسی ہو؟'' صدیق نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھی ہوں۔آپ بتائیں کیسے فون کیا؟''

''تمہیں ابو نے بتایا نہیں؟'' صدیق کے لہجے میں حیرت در آئی۔

''کس بارے میں؟'' اب کے طوبیٰ بھی حیران ہوئی۔

یہی کہ امی اور ابو کا ویزہ آ گیا ہے۔ اب وہ میرے پاس مستقل طور پر رہ سکتے ہیں۔ صدیق نے اطلاع دی۔ طوبیٰ کو ایک لمحے کو سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔

''تم تو جانتی ہو امی تیمور اور ہانیہ کے دور ہو جانے پر کتنی اداس ہیں۔ میں بھی کب سے پریشان تھا کہ ان کو اپنے پاس بلاؤں۔ وہ بچوں کو ہر وقت یاد کر کے روتی ہیں۔ ابو نے بتایا تھا مجھے۔'' صدیق نے وضاحت کی۔

''ہاں اچھی بات یہ تو!'' طوبیٰ اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی ''واقعی تیمور اور ہانیہ کو تو ہر وقت یاد کرتی ہیں امی۔ آپ کے پاس چلی جائیں گی تو صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔'' اتنے لمبے عرصے کے لیے اکبر اور رضیہ سے جدا ہونے کے خیال سے ہی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ لیکن رضیہ کی صحت کے خیال سے وہ ہر کڑوا گھونٹ پینے کو تیار تھی۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے۔'' صدیق کی ہچکچاہٹ طوبیٰ کو عجیب لگی۔

''سب خیریت ہے؟'' اب کے طوبیٰ بھی فکر مند ہوئی۔

''امی تم کو یوں چھوڑ کر آنے کو تیار نہیں۔'' صدیق نے جو بات کہی اس نے طوبیٰ کو گنگ کر دیا تھا۔

''اب تمہارے پاس دو ہی آپشن ہیں۔'' صدیق کی باتوں سے ایسا لگا جیسے وہ کسی کھیل کا حصہ ہو اور یہ کھیل اس کی قسمت کا ہو جس کا فیصلہ دو آپشنز کی صورت میں دیا جا رہا تھا۔

''کیا؟'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''جاب چھوڑ کر یہاں میرے پاس آ جاؤ، یہیں کوئی جاب کر لو۔'' صدیق نے اپنے جاننے میں آسان حل بتایا۔

''بھائی آپ جانتے ہیں یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ میں نے ابھی ایک نیا کانٹریکٹ سائن کیا ہے اور ڈیڑھ سال سے پہلے میں اپنی جاب چھوڑ نہیں سکتی۔ اور ویسے بھی میں یہاں خوش ہوں، اپنی جاب سے مطمئن ہوں۔ میں کسی اور جگہ منتقل ہونے میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتی۔'' طوبیٰ نے صدیق کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''تو پھر شادی کر لو۔'' صدیق کے الفاظ تھے یا چابک جو طوبیٰ کو سنتے ساتھ ہی ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ بہت دیر تک کچھ نہ بولی تو صدیق کو لگا کال منقطع ہو گئی۔

''ہیلو! ہیلو!، طوبیٰ، کیا تم مجھے سن سکتی ہو؟'' صدیق مستقل اسے پکار رہا تھا۔

''جی بھائی!'' بالآخر طوبیٰ کی زبان سے الفاظ ادا ہوئے۔

''دیکھو طوبیٰ! میں جانتا ہوں تم شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن یہ امی کی صحت کا سوال ہے۔ میں ان کی صحت پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ تم بھی بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب بچی نہیں ہو تم سمجھدار ہو۔ حالات کی نزاکت کا تمہیں بھی اندازہ ہے۔ میرا خیال ہے تم سائیکاٹرسٹ سے دوبارہ رجوع کرو اور جیسا امّی کہتی ہیں ویسا ہی کرو۔ اب اُن کی عمر نہیں کہ وہ اِن سب الجھنوں کو سنبھالیں۔"

صدیق روانی سے بولے جا رہا تھا۔ اسے بے انتہا تکلیف ہوئی۔ اس کے جذبات اور احساسات کی کسی کو فکر نہ تھی۔ لیکن وہ صدیق کو غلط کہہ بھی کیسے سکتی تھی۔ مشرقی معاشرے میں کہاں بیٹیاں اکیلے رہ سکتی ہیں اور اگر بیٹی کے ساتھ ماں باپ رہیں تو دنیا بیٹوں کا جینا حرام کر دیتی ہے۔ گو کہ صدیق کی نیت بالکل صاف تھی اسے صرف رضیہ کا خیال تھا لیکن اس کا خیال کرنے والا کون تھا اس کی کمی کا آج اُسے شدت سے احساس ہوا۔ اس مشرقی معاشرے میں مرد کے ساتھ کے بغیر عورت ادھوری تھی اور وہ اس معاشرے سے لڑ تو سکتی تھی لیکن بدل نہیں سکتی تھی۔

کال منقطع چکی تھی اور وہ ابھی تک یونہی اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔

...۞...

آج پھر کھانے کی میز پر صرف اکبر ہی بول رہے تھے اور حسبِ معمول ان کے استاد عبداللہ ہی گفتگو کا مرکز تھے۔ اکبر اکثر ہی عربی کی نئی اصطلاحات کا تذکرہ رضیہ اور طوبیٰ سے کرتے اور اس کے معنی کھول کھول کر سمجھاتے۔

''پتا ہے رضیہ یہ جو لفظ تقویٰ ہے کہاں سے آیا ہے؟ عربی میں ہر لفظ کا ایک مادہ ہوتا ہے جیسے ایمان کا مادہ، الف، م، اور نون ہے، ایسے ہی قول کا مادہ ق، و، ل ہے۔ اس مادہ میں بھی پوری سائنس ہے۔

الگ وزن پر ڈھالنے سے لفظ کا مطلب بھی الگ ہو جاتا ہے۔''

رضیہ بہت توجہ سے اکبر کی بات سن رہی تھیں ''عربی بڑی فصیح زبان ہے۔''

''ہاں بالکل۔ بھلا بتاؤ تقویٰ کا مادّہ کیا ہوگا؟''

اکبر رضیہ سے سوال کر بیٹھے۔

رضیہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر ہار مان لی۔

''وق ی مادّہ ہے تقویٰ کا۔'' اکبر نے فخریہ بتایا۔ ''ہمارے استاد عبداللہ صاحب بڑے ہی قابل ہیں۔ اسلام اور سائنس کا گہرا تعلق بیان کرتے ہیں۔ نہ صرف نوجوانوں کو اسلام کا صحیح مطلب سمجھانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے بلکہ اُن کی بدولت تو ہم بزرگوں کو بھی اب اس عمر میں قرآن سمجھ آنے لگا ہے۔''

طوبیٰ متاثر ہو یا بغیر نہ رہ سکی۔ لوگوں کی دین کے لیے خدمت وہ بھی بغیر کسی معاوضے کے قابل تعریف تھی۔

اکبر ابھی بھی کسی اور لفظ کا مطلب سمجھا رہے تھے اور طوبیٰ دو دن پہلے آئی صدیق کی کال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس فیصلے کا اختیار اس کو دیا گیا تھا جس کا ایک بھی آپشن اس کے حق میں نہیں تھا۔

...۞...

وہ ایک مشاہدے کے لیے ایک سائیٹ پر موجود تھی اور اس کے بعد ہونے والی میٹنگ کافی طول پکڑ گئی تھی۔ اس وقت وہ شہر سے کچھ دور تھی اور ڈوبتے سورج کا اندازہ لگانے کے بعد اسے صرف اس بات کی فکر تھی کہ اگر وہ آٹھ بجے تک گھر نہ پہنچی تو رضیہ نے پریشان ہو کر اپنا بلڈ پریشر بڑھا لینا ہے۔

''ایکسکیوزمی جنٹل مین! اگر ممکن ہو تو کل صبح ہم آنلائن باقی پوائنٹس ڈسکس کر لیتے ہیں۔'' طوبیٰ نے آخر کار طویل ہوتی میٹنگ کو اگلے دن پر اٹھا رکھنے کا ارادہ کیا اور پارکنگ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''رُکیے باہر اندھیرا ہے۔ میں آپ کو باہر تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' عمیر جو ایک عرصے سے اس کے ساتھ اسی کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ اِک دم ہی کھڑا ہو گیا اُس سے ملاقات صرف اہم میٹنگز میں ہی ہوتی تھی۔

''اپنے عقب سے آنے والی آواز پر طوبیٰ نے مڑ کر دیکھا۔

''بہت شکریہ! لیکن مجھے ضرورت نہیں۔''

''لیکن مجھے ہے۔'' عمیر نے برجستہ کہا اور آگے بڑھ کر طوبیٰ کے لیے دروازہ کھول دیا۔

کار پارکنگ تک وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ سورج ڈھل چکا تھا اور پارکنگ ایریا میں لگی لائٹس اب روشن ہو چکی تھیں۔

''آپ کے ساتھ زیادہ ملاقات تو نہیں رہتی لیکن جب بھی ہوئی ہے کافی متاثر ہوا ہوں۔'' عمیر نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا۔

طوبیٰ نے گردن موڑ کر عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ وہ کمپنی کا وفادار تھا اور مینجمنٹ میں اس کی ساکھ کافی اچھی تھی۔

''متاثر کرنے والا تو میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ آپ میری کس بات سے متاثر ہو گئے؟'' طوبیٰ نے نرمی سے کہا۔

''بہت کم عرصے میں مارکیٹ میں جو نام آپ نے کمایا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔''

اس نے گردن موڑ کر طوبیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں، بس قسمت نے ساتھ دیا شاید میرا۔'' طوبیٰ نے بات کو ٹالنا چاہا۔ گاڑی کے پاس پہنچتے ہوئے یک دم عمیر نے ایک چھوٹا سا تحفہ اس کے سامنے کر دیا ''یہ آپ کے لیے۔''

طوبیٰ حیران رہ گئی اور اسے اندازہ ہوا وہ ایک ہاتھ پشت پر کیے کیوں چل رہا تھا۔

''یہ کس لیے؟'' طوبیٰ کچھ حیران ہوئی۔

عورتوں کا عالمی دن مبارک ہو۔ وہ خوش اخلاقی سے مسکراتا ہوا خوبصورتی سے لپٹا ہوا تحفہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ ''اتفاق سے میری زندگی میں ایسی کوئی عورت نہیں جس کو میں یہ تحفہ دے سکتا۔ آپ نے مجھے ہمیشہ سے متاثر کیا ہے تو میں نے سوچا آپ کو ایک چھوٹا سا (tribute) ٹریبوٹ پیش کیا جائے۔

''آپ مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' ناچاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہوا۔ عمیر کی

آنکھوں میں حیرت عود آئی۔ اور اس کا بڑا ہوا ہاتھ پیچھے ہو گیا۔

''میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور اسی کا اظہار کر رہا ہوں اگر مجھے فلرٹ کرنا ہوتا تو اپنی ہم عمر کے بجائے کسی چھوٹی لڑکی کا انتخاب کرتا جو میرے لیے شاید زیادہ موزوں ہوتی۔''

عمیر کی لہجے کی تلخی نے طوبیٰ کو اِک دم شرمندہ کر دیا۔ وہ اب ہر شخص سے ہی عدم تحفظ کا شکار ہونے لگی تھی۔ عمیر خدا حافظ کہہ کر جا چکا تھا اور وہ ملال کے ساتھ واپسی کا سفر طے کر رہی تھی۔ یہ ذہنی انتشار اسے تلخ سے تلخ بناتا جا رہا تھا۔

...۞...

عشاء کی نماز سے کچھ پہلے وہ گھر پہنچی تو ایک نامانوس آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کوئی مہمان آیا ہوا ہے کیا؟'' طوبیٰ نے سامنے سے آتی رضیہ سے پوچھا جو چائے کی ٹرالی دھکیلتی ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھیں۔

رضیہ اپنی کمزوری کے باعث چائے کا انتظام کرنے میں ہی ہلکان ہو گئی تھیں۔ ملازمہ بھی گھر جا چکی تھی سو طوبیٰ نے آگے بڑھ کر ٹرالی تھام لی۔

''تمہارے ابو کے استاد آئے ہوئے ہیں کوئی۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔ اب یہ چائے کہ ٹرالی اندر دے آؤ۔'' رضیہ ہانپتے ہوئے قریبی پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''لیکن آواز تو کسی نوجوان کی ہے؟'' طوبیٰ نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''قرآن کے ساتھی ہیں۔ وہی استاد عبداللہ جن کا ذکر ہر وقت ہی تمہارے ابو کرتے رہتے ہیں، وہاں تو ہر عمر کے افراد ایک دوسرے کے بہترین ساتھی بن جاتے ہیں۔ پاکستان آئے ہوئے ہیں آج کل تو ملنے آئے ہیں۔''

طوبیٰ نے کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا اپنا ہینڈ بیگ سائیڈ میں رکھی میز پر رکھا اور ٹرالی دھکیلتی ڈرائینگ روم میں داخل ہو گئی۔

''السلام علیکم!'' ڈرائنگ روم میں موجود شخص احتراماً اس کے لیے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ سلام کرنا تو

درکنار سلام کا جواب دینا تک بھول چکی تھی۔ اس کو جسم میں اپنا خون پارہ بنتا محسوس ہوا۔

''یہ ہے میری ہونہار بیٹی طوبیٰ، جس کا تذکرہ میں آپ سے کر رہا تھا۔ بہت محنتی ہے۔ بس ابھی آفس سے آئی ہے۔ ہم بوڑھے بڑھیا کو یہی سنبھالے ہوئے ہے فی الوقت۔'' اکبر نے بڑی محبت سے طوبیٰ کا تعارف کروایا۔

طوبیٰ دم بخود اس مہمان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ وہاں ہوسکتا تھا یہ اس کے وہم وہ گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ ستارہ آنکھیں وہ انہیں بھلا کیسے بھول سکتی تھی۔

''طوبیٰ بیٹا!'' طوبیٰ کو اپنی جگہ منجمد دیکھ کر اکبر نے اس کو مخاطب کیا۔ سامنے وہ شخص ابھی بھی کھڑا ہوا تھا۔ اس کو دوبارہ بیٹھنے کے لیے نہیں کہا گیا تھا نہ ہی اسے سلام کا جواب ملا تھا۔

''عبداللہ صاحب ہمارے استاد ہیں۔ کیا خوب عربی گرامر پڑھاتے ہیں۔ میں تو ان کے علم سے بہت متاثر ہوں۔''

سامنے کھڑا شخص جو خود بھی ہکا بکا تھا اکبر کی تعریف پر گڑبڑا گیا۔

''ارے نہیں۔ یہ تو بس آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔''

''آپ تو بڑی انکساری سے کام لیتے ہیں۔'' اکبر نے مہمان کو بڑی محبت سے خاموش کروا دیا۔

''پتا ہے طوبیٰ بیٹا! ''عبداللہ صاحب سائنٹسٹ ہیں اور انجمن برائے قرآن فہمی کے بانی بھی۔ وہی میں جس حلقے میں کچھ عرصے پہلے شامل ہوا ہوں۔ ماشاءاللہ پہلے پہل تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ نوجوان اتنا بڑا کام کر رہا ہے۔ لوگوں کو مفت عربی گرامر کی تعلیم دینا تاکہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھ سکیں۔ آن لائن بائی لنگول کورس ڈیزائن کیے ہیں برخوردار نے تاکہ نوجوان نسل باآسانی اس سے استفادہ کر سکے اور جب مسجد والے عبدالرحمن صاحب نے ان کی حال ہی میں شائع ہوئی کتاب کے بارے میں بتایا تو میں بس گرویدہ ہی ہوگیا ان کا۔''

اکبر اپنی روانی میں کہتے چلے جا رہے تھے اور طوبیٰ حیرانی سے سامنے کھڑے خوبرو نوجوان مرد کو دیکھے گئی یا شاید اُسے اس سے زیادہ خوبصورت مرد کوئی لگا ہی نہیں کبھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے

سے نظریں نہیں ہٹا سکے۔ دل جیسے دھڑکنا بھول چکے تھے۔

''عبداللہ یا اسفر؟'' طوبیٰ کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ وہ اب بھی اسفر کو دیکھ رہی تھی بغیر پلکیں جھکائے، دم بخود، بے حس وحرکت، جامد.....

اسفر اب نروس ہو رہا تھا اور طوبیٰ نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

''چائے دو بیٹا عبداللہ صاحب کو!'' اکبر نے مہمان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے بیک وقت نظریں چرائیں۔

''طوبیٰ!'' اب کے اکبر نے حیرانی سے طوبیٰ کو دیکھا جو شاید ابھی تک منجمد تھی۔ ہلکا سانولا رنگ اب کھل چکا تھا اور اس پر سیاہ داڑھی۔ جوانی کی چمک تھی یا کوئی نور جو اُسے مزید جاذب نظر بنا رہا تھا۔ چوڑے شانے، مضبوط جسم اور وہی ستارہ آنکھیں۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔

''وعلیکم السلام!'' طوبیٰ نے ہلکی آواز میں سلام کا جواب دیا اور چائے بنانے لگی۔

اسفر اس کی آواز کی چاشنی میں کھو گیا۔ اس آواز کو وہ کبھی نہ بھلا پایا تھا۔ بھُلا بھی کیسے سکتا تھا۔ یہی آواز اسے آسمانوں کی سیر کراتی تھی اور اسی آواز نے اُسے پاتال میں لے جا پھینکا تھا لیکن اُسے طوبیٰ سے کوئی شکوہ نہیں تھا بلکہ وہ احسان مند تھا۔ وہ نہ ہوتی تو شاید ساری زندگی دوحصّوں میں ہی بٹے گزر جاتی۔

''اکبر صاحب! آپ مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔ براہِ مہربانی مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' وہ اب دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے فرش پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔

طوبیٰ بھی چائے پیش کرنے کے بعد اکبر کے کہنے پر کاؤچ پر بیٹھ چکی تھی۔ چائے کی پیالی اور ساسر پکڑے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اسفر کی آنکھوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

''یہ دیکھو بیٹا طوبیٰ! یہ عبداللہ صاحب کی کتاب ہے۔ یہ میرے لیے تحفہ لائے ہیں۔'' اکبر نے خوشی سے مغلوب ہوتے ایک کتاب طوبیٰ کے سامنے کر دی۔ The Ultimate Truth طوبیٰ نے خوبصورت سرورق دیکھا جس کا پس منظر مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کے نارنجی رنگوں سے سجایا گیا تھا اور ایک پتھر سے بنا مایوس انسان سامنے اُڑتی تتلی کو سر اٹھا کر یوں دیکھ رہا تھا گویا اس کے اسرار پر غور کر رہا ہو۔

''یہ سرورق بھی یقیناً آپ نے ہی ڈیزائن کیا ہوگا۔'' طوبیٰ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ تھی۔ آخری ملاقات کی شرمندگی ایک ناگ بن کر اس وقت اس کو ڈس رہی تھی اور اس کی تکلیف سے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''اس کا سرورق بھی انھوں نے خود ہی بنایا ہے۔'' اکبر نے پرجوش ہوتے ہوئے طوبیٰ کے نہ پوچھے گئے سوال کا جواب دیا۔ ''ماشاءاللہ بھئی بہت قابل انسان ہیں آپ عبداللہ صاحب۔''

طوبیٰ اب معذرت طلب کر کے باہر آ چکی تھی۔ اُسے معجزوں پر یقین تو تھا لیکن وہ عام زندگی میں بھی واقع ہو سکتے ہیں اس کی اس کو قطعی اُمید نہ تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود کو ایک چھت کے نیچے محسوس کر رہے تھے۔ خاموشی کے عالم میں اب دونوں ہی عمر کے اس حصے میں تھے جہاں جذبات کی رو میں بہنا آسان نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان بات کرنے کو کچھ نہ تھا، بات تو بہت پہلے ہی ختم ہو گئی تھی وہ تو بس اب ایک دوسرے کی خاموشی کو پڑھ رہے تھے، دیوار کے اس پار۔

...۞...

''میں مِس طوبیٰ اکبر سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اسفر نے ریسپشن پر بیٹھی لڑکی سے کہا۔

''سر! کیا آپ کی میٹنگ طے ہے ان سے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن میں ان کا پرانا دوست ہوں۔ پاکستان آیا ہوں تو ملنے چلا آیا۔ کیا میری ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' اسفر نے شائستگی سے پوچھا۔ اندر ہی اندر اس کا دل کس قدر زور سے دھڑک رہا تھا وہ کوئی کب جان سکتا تھا۔

''مِس طوبیٰ تو ابھی بورڈ میٹنگ میں ہیں، لیکن میٹنگ اب ختم ہی ہونے والی ہو گی۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ''آپ تشریف رکھیے اور اپنا نام بتا دیجیے۔''

اسفر ویٹنگ ایریا میں رکھے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دو دن پہلے ہوئی ملاقات میں باتوں ہی باتوں میں اکبر خود ہی اس کو طوبیٰ کے بارے میں مطلع کرتے رہے تھے کہ وہ کس کمپنی میں

کس پوزیشن پر کام کرتی ہے۔ باقی معلومات جاننا اسفر کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ گزرے ماہ و سال پر غور کرتا رہا۔ وقت ایسے ہی گزرتا رہتا اگر وہ اتفاقاً اپنے طالب علموں سے ملنے نہ چلا گیا ہوتا۔ اکبر صاحب بے حد اسرار کر کے اس کو اپنے گھر لے آئے تھے اور اپنی بیٹی کی غیر حاضری جان کر وہ بے حد پریشان بھی ہو گئے تھے۔ اسفر نے نہ صرف ان کو حوصلہ دیا تھا بلکہ یقین دہانی بھی کروائی تھی کہ ان کی بیٹی کے نہ آنے تک وہ ان کے پاس رکے گا اور ضرورت پڑی تو ہر ممکن ان کی مدد کرے گا۔

اتفاق ہی تھا کہ اکبر نے ایک بار بھی اپنی بیٹی کا نام اسفر کے سامنے نہ لیا تھا ورنہ اسفر ضرور چونک جاتا۔ لیکن طوبیٰ نام کی تو ان گنت لڑکیاں ہو سکتی تھیں اور ویسے بھی اسفر نے یہی گمان کر رکھا تھا کہ اب تک طوبیٰ کی شادی ہو گئی ہو گی۔

اس دن اُسے وہاں دیکھ کر اپنے ساتھ ہونے والے اس معجزے پر یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا اور پھر وہ نظریں جن سے طوبیٰ کو اس نے اپنی طرف تکتے دیکھا دل میں بے پناہ سوالات اٹھانے کو کافی تھیں۔ وہ نظریں صرف شناسائی کی چمک نہ لیے ہوئی تھیں۔ اُن میں جو تشنگی اور پیاس اپنے لیے دیکھی وہ اسفر کے لیے ناقابل یقین تھی۔ اس نے اب تک شادی نہ کی تھی یہ بات وہ جان چکا تھا۔ لیکن ان معلومات کے نتیجے میں سوچوں کے ایک بھنور نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''اگر وہ مجھ سے محبت کرتی تھی تو اس نے میری محبت کو کیوں ٹھکرا دیا تھا۔'' اس سوال نے اُسے پچھلی دو راتیں سونے نہ دیا تھا۔

...۞...

اپنے کمرے میں آ کر وہ کتنی ہی دیر اپنی بے خودی پر پیچ و تاب کھاتی رہی تھی۔

''کہیں اس نے میرے پسلیوں سے باہر آتے دل کی آواز سن نہ لی ہو!'' طوبیٰ کو اب پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسفر سے اس کی ملاقات یوں اپنے ہی گھر میں ہو جائے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر زندگی میں کبھی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ ضرور اس کے لیے باعث مسرت ہو گا لیکن

وہ اس طرف بے خود ہو کر اُسے تکے جائے گی اس کی اس کو ایک فیصد بھی امید نہ تھی۔

دو راتوں ہی میں وہ اسفر کی دی گئی کتاب پڑھ چکی تھی اور آخر میں دیا گیا اس کا حوالہ بھی۔ اسلام کی طرف دوبارہ لوٹنے پر اس نے اپنی نئی پہچان کے لیے نام عبداللہ کا انتخاب کیا تھا ''اللہ کا بندہ'' جس خوبصورتی سے اس نے اسلام یا خدا کے خلاف اٹھنے والے سوالوں کے جواب دیے تھے وہ حیران رہ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ اب تک کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے بہترین کتاب تھی۔

کتاب کے پیچھے دیا گیا حوالہ انتہائی مختصر تھا اور اس کی سوانح عمری جاننے کی خواہش میں وہ مچل کر رہ گئی تھی لیکن اسفر سے اکبر کا رشتہ جاننے کے بعد وہ کسی جذباتی پن کا مظاہرہ کر کے اکبر یا اپنے آپ کو بے مول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں بس اتنا ہوا تھا کہ اکبر سے عبداللہ کے ذکر کے دوران وہ مزید سوالات کرتی جو طویل گفتگو میں بدل جاتے۔

''مِس طوبیٰ! اسفر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں آپ کے دوست ہیں۔''

طوبیٰ ایک لمحے کو ششدر رہ گئی۔ اسفر نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

''بھیج دیجئے۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی جو صرف وہ خود محسوس کر سکتی تھی۔

اسفر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ خود میز کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہی ستارہ آنکھیں آج اس پر جمی تھیں۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا میں اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔'' اسفر نے بالآخر کہا۔

''مجھے بھی!'' طوبیٰ بے اختیاری کہہ اُٹھی۔ اس نے اسفر کے چہرے پر حیرت بھری خوشی دیکھی۔

''اتنے سالوں بعد دیکھ رہا ہوں تمہیں۔ ویسے کی ویسی ہی ہو۔'' اسفر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''زندگی بھی ویسی ہی ہے۔'' طوبیٰ نے سوچا لیکن بولا کچھ نہیں اور اسفر کو بیٹھنے کو کہا۔

''کیا پئیں گے آپ؟'' اس نے پروفیشنل انداز میں پوچھتے ہوئے انٹر کام ہاتھ میں لیا۔

اسفر کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ طوبیٰ حیرت سے اسے دیکھے گئی۔

''جو آپ چاہیں۔ ہم تو مہمان ہیں۔''

طوبیٰ اس بے تکلفی سے آج پریشان نہ ہوئی تھی۔ اس نے کسی کو چائے بھجوانے کی ہدایت دی۔ اسفر اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر احترام سے نظریں جھکالیں۔ طوبیٰ نے اس کو نوٹس کیا اور زیر لب مسکرا دی۔

''کتاب پڑھی میں نے۔ کمال کی ریسرچ ہے تمہاری۔'' طوبیٰ نے بات کا آغاز کیا۔ آپ جناب کو بالائے طاق رکھنا ہی اُسے مناسب لگا۔

''طالب علم کبھی اتنا اچھا نہ تھا میں لہٰذا اس میں زیادہ کمال اس زندگی کا ہے جس نے مجھے سبق پڑھائے اور میں لکھتا گیا۔'' کریڈٹ لینا تو شاید اُسے منع تھا۔ طوبیٰ مسکرا دی۔

''تم تو میری توقعات کے مطابق بالکل صحیح جگہ بیٹھی ہو۔ میں جانتا تھا تم اتنی ہی کامیاب ہوگی۔'' اسفر نے بھی اس کی تعریف کی۔

''کیا واقعی؟'' طوبیٰ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اسفر ہنس دیا۔ ''تم ایک ہونہار طالبہ تھیں اور بہت مرتکز بھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔''

کمرہ کافی ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔ اسفر نے ایک بار پھر اس کو محبت اور احترام سے دیکھا۔ وہ ہستی جس کو اس نے بارہا بھلانے کی کوشش کی تھی لیکن زندگی نے ہر موڑ پر اس کے الفاظ کی بازگشت سنا کر اُسے منزل دکھائی تھی۔ سب کچھ طے شدہ تھا۔ اللہ کے ماسٹر پلان کا حصہ وہ تشکر کے احساس مغلوب تھا۔

طوبیٰ بھی مسکرا دی تھی۔ ہونٹ تھے یا گلاب کی پنکھڑیاں۔ اسفر سوچ کر رہ گیا۔

تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ جو تم نے کیا ہے وہ تو بالکل ناقابلِ یقین ہے۔

اسفر اپنے بارے میں مختصراً بتانے لگا۔ ایمل سے ملاقات اور اس کے بعد کا سفر۔ طوبیٰ دلچسپی سے سنتی رہی۔ اس کا دل کیا وہ بولتا جائے اور وہ یونہی سنتی رہے۔ اسے اپنے خیال پر ہنسی آ گئی۔

چائے آ چکی تھی۔ ایک لمحے کو وہ دونوں ہی بھاپ اُڑاتی چائے کو دیکھنے لگے۔ ہوا میں مرغولے بناتی بھاپ ان کی زندگیوں کی طرح تھی جو آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

''طوبیٰ! کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟'' اسفر نے ایک جذب سے طوبیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور طوبیٰ کو لگا اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ جس وقت کو یاد کر کے اسے ہمیشہ تکلیف ہوتی

تھی، سامنے بیٹھا شخص وہی پوچھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

طوبیٰ اسے دیکھے گئی۔ آخر کب تک بھاگتی۔ کبھی نہ کبھی تو اس نے سامنا کرنا ہی تھا۔

''ضرور!'' طوبیٰ نے بمشکل کہا۔

''کئی سالوں پہلے میں نے تم سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ تم نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ میں بس وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم بھی مجھے پسند کرتی تھیں۔ محبت کے جذبے کو الفاظ اور چہرہ تو ڈھانپ سکتے ہیں آنکھیں نہیں۔ اس وقت بھی تمہاری آنکھوں نے تمہارا ساتھ نہ دیا تھا لیکن میں کچھ نا سمجھ تھا، لیکن آج میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وجہ کچھ اور تھی۔'' وہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے طوبیٰ کی طرف دیکھنے لگا۔

طوبیٰ کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہے۔ پہلے پہل تو اس نے سوچا تھا کہ وہ صاف مکر جائے گی اُسے کبھی محبت نہیں تھی لیکن اسفر کی بات سننے کے بعد اس کو اپنے بودے جھوٹ بولنے پر دل آمادہ نظر نہ آیا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور نظریں جھکا لیں۔ اسفر کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی ہمت نہیں تھی اس کی۔

''یہ سچ ہے کہ میں نے زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ محبت کی اور وہ تم تھے۔'' اسفر دم سادھے اُسے سُن رہا تھا۔ چائے سے دھواں اٹھنا ختم ہو گیا تھا۔ ''لیکن یہ بھی سچ ہے جو محبت پا لیتے ہیں اُسے ارزاں کر دیتے ہیں اور جو نہیں پاتے ان کی خلش ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ تمہاری محبت میری طاقت ہے۔ جس دن یہ ارزاں ہو گئی اس دن میں سب کچھ کھو دوں گی اور میں نے یہ سب بہت مشکل اور مشقت سے حاصل کیا ہے۔ نہ میں یہ کھونا چاہتی ہوں اور نہ ہی محبت کی خلش۔''

دونوں کے درمیان اعصاب شکن خاموشی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ گندمی رنگت، گول چہرہ، ہلکی ترچھی آنکھیں۔ بڑے سلیقے سے اس نے دوپٹہ لے رکھا تھا لیکن جدید طرز پر تراشے بال دوپٹے کے ہالے سے نمایاں تھے۔ سخت محنت کے باعث اس کی شخصیت میں ایک رعب عود آیا تھا لیکن چہرے کی معصومیت جوں کی توں تھی۔

اسفر کو اس کی بتائی ہوئی وجہ نا قابل یقین لگی لیکن جو سب کریں وہ طوبیٰ کیونکر کرے۔

''طوبیٰ! تمہارے خیالات پر میں تمہیں نہیں جانچوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں جب کوئی آپ کا نقطہ نظر نہ سمجھے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔تم اپنی جگہ بالکل درست ہو۔ ہر شخص اپنی جگہ درست ہی ہوتا ہے وہ تو ہم خواہ مخواہ ہی انسانوں کے بارے میں گمان کر لیتے ہیں۔ہمیں لگتا ہے ہماری سمجھ دوسرے کی سمجھ سے زیادہ ہے۔'' پھر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔طوبیٰ کو امید تھی وہ اسے بے وقوف کہے گا یا پھر پاگل لیکن اس کے خیالات کو بالکل صحیح مان کر اسفر نے اسے حیران کر دیا تھا۔

''تم جانتی ہو اللہ نے مجھے میرے حال کا حوالہ کہاں دیا تھا؟''

طوبیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسفر کو دیکھا۔

''اللہ نے سورۃ غافر میں مجھ جیسے لوگوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ جب ان کے پاس پیغمبر آئے تو وہ اپنے علم پر اترانے لگے۔انجام یہ ہوا کہ جس چیز سے وہ تمسخر کرتے تھے عذاب نے ان کو گھیر لیا۔''

طوبیٰ نا سمجھی کہ عالم میں اسفر کو دیکھے گئی۔

"تم جانتی ہو کون سا علم تھا اس جماعت کے پاس جس پر وہ اتراتے تھے؟"

''یقیناً وہ دین کا علم نہیں ہوگا ورنہ وہ پیغمبر کی بات پر یقین کر لیتے۔'' طوبیٰ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

اسفر نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا''بالکل۔ وہ سائنس والے تھے۔ میری طرح۔ میں نے بھی خدا کے ہونے پر سوال اٹھائے تھے تو دیکھو اللہ نے میرے پیاروں کی دعاؤں کے نتیجے میں مجھے اپنا نشان دکھا دیا۔تم بھی ابھی اللہ کی رحمت پر سوال اٹھا رہی ہو۔تمہیں لگتا ہے وہ نعمت تمہیں ملے گی تو وہ ارزاں ہو جائے گی۔تمہارے پیاروں کی دعا بھی تمہیں اللہ کی رحمت کا نشان دکھا دے گی۔''

طوبیٰ حیرت سے اسے دیکھے گئی۔اسے فخر ہوا اس نے ایسے انسان سے محبت کی۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے اسفر نے ایک وزٹنگ کارڈ طوبیٰ کی طرف بڑھا دیا۔جس کو اللہ میرا لباس بنائے گا میں اللہ کی رحمت کے سبب اس کا بہترین لباس بننے کی پوری کوشش کروں گا۔ میرے دین کی تکمیل اسی میں ہے اور میری ذات کی تم سے۔ میری زندگی کے پزل کا تم آخری ٹکڑا ہو۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

وہ ایک بار پھر جا چکا تھا اور طوبیٰ یونہی بیٹھی رہ گئی۔ اپنے ساتھ وہ ساری روشنیاں بھی لے گیا تھا تب

ہی طوبیٰ کو ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی۔

...۞...

کتنے ہی مہینے گزر گئے تھے لیکن اسفر کی باتیں اس کے دماغ میں چپک کر رہ گئی تھیں۔ عمیر کی شادی کا کارڈ اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس نے گاڑی ایک بہت بڑے پارک کے سامنے کھڑی کر دی۔ سکون کے لیے وہ کبھی وہاں آ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج پارک کے اندر جانے کے بجائے اس نے باہر چلنا شروع کر دیا۔ ہر بورڈ اور پینا فلیکس کو پڑھتے وہ بس چلتی ہی جا رہی تھی۔

''ہم ہمیشہ ساتھ نہیں رہیں گے تمہارے۔'' رضیہ کے غصے بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"تمہارے پاس دو ہی آپشن ہیں۔" صدیق کی دوٹوک آواز۔ "تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔" فرحان کی تلخ آواز۔

''دیکھو تو کیسے اکیلے گھومتی رہتی ہے۔'' محلے کی خالہ کے روبی کے لیے بولے کڑوے جملے۔

''روبی آنٹی گاڑی کتنی اچھی چلاتی ہیں۔ میں بھی بڑے ہو کر ایسے ہی گاڑی چلاؤں گی۔'' اس کی اپنی آواز۔

اتنی ساری آوازوں سے اسے وحشت ہونے لگی اور وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے بس چلتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے گالوں پر سیال مادے کو محسوس کیا۔ وہ جو کبھی نہیں روتی تھی، آج اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی پھیل کر سامنے نظر آتی چیزوں کو چندھیا رہی تھی۔ اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اللہ کی رحمت کی نفی کرتی رہی تھی۔ اللہ نے اسے ہر چیز دی تھی جو جو اس نے مانگی۔

''اللہ میاں آپ نے کہا ہے جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو مجھ سے مانگو، اسی لیے میں آپ سے فلاں چیز مانگ رہی ہوں۔''

اس کی دعا کا انداز ہمیشہ ایسا ہی ہوتا اور اس کی مطلوبہ چیز ہمیشہ اسے مل کر ہی رہی تھی۔ اچھا نتیجہ اچھے کالج اور یونیورسٹی میں ایڈمیشن، اچھی ڈگری اچھی جاب، پُرآسائش زندگی.....اور اسفر.....اس

نے تو اُسے کبھی مانگا ہی نہیں۔

اسے اللہ کی رحمت پر شک تھا کہ وہ اس کے ساتھ وہی کرتا جو روبی کے شوہر نے اس کے ساتھ کیا۔ اس نے تو اپنی روبی سے جدا تقدیر کبھی مانگی ہی نہیں تھی۔ اس نے خود کو روبی سمجھ لیا تھا۔ گاڑی بھی اس نے چھوٹی اور سفید لی تھی۔ کپڑوں کا انتخاب اس کا آج تک وہی تھا جو روبی پہنتی تھی۔ حتی کہ وہی کالا چشمہ بھی اور بالوں کا اسٹائل بھی۔

بس صرف ایک پہچان تھی اس کی اپنی، اس کا حجاب، اس کے علاوہ وہ روبی کے سراپے میں ڈھل گئی تھی۔ بچپن میں لگے ایک صدمے کو اس نے اتنا شدید دل پر لیا تھا کہ وہ کبھی اس لمحے سے نہ نکل پائی تھی۔ اس نے کبھی دعا ہی نہیں کی تھی کہ وہ روبی نہ بنے بلکہ طوبیٰ بنے۔

جو گتھی وہ کبھی نہ سلجھا سکی تھی، اسفر نے کتنی آسانی سے سلجھا دی تھی۔ وہ چلتے چلتے کہاں آنکلی تھی اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ تھک ہار کر وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ ایک خلش یا پھر خلفشار کیا تھا جو اس کی ذات کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

''اللہ کے نام پہ دے دو باجی! اللہ دل کی مراد پوری کرے گا۔'' نہ جانے کہاں سے وہ فقیرنی وہاں آنکلی تھی۔ طوبیٰ یکدم حواسوں میں آئی۔

''دیدو نا باجی! اللہ سرخرو کرے گا تجھے، تیرا ساتھی تیرا وفادار رہے گا ہمیشہ۔'' اپنے مخصوص انداز میں لبھاتے ہوئے وہ اپنا پھٹا ہوا دوپٹہ اٹھائے اسے دعا دے رہی تھی۔

کسی روبوٹ کی طرح طوبیٰ نے سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ فقیرنی وہاں سے جا چکی تھی۔ طوبیٰ کپڑے جھاڑتی کھڑی ہو گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کس سمت میں چلتی یہاں تک آئی تھی۔

''کہاں جانا ہے باجی؟'' قریب ہی ایک رکشے والا آ کر رُکا تھا اسے لگا وہ سواری کی تلاش میں ہے۔

''جھیل پارک۔'' طوبیٰ نے پارک کا نام لیا اور رکشے میں بیٹھ گئی۔

...۞...

دروازہ اکبر نے کھولا تھا۔ ''کہاں تھی تم طوبیٰ؟ کال بھی نہیں اٹھا رہی تھیں؟''

اکبر کی آواز میں پریشانی جھلک رہی تھی۔ غالباً وہ بہت دیر سے صحن میں ٹہل رہے تھے اور طوبیٰ کی شکل دیکھ کر اب تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ طوبیٰ نے سر جھکا کر گزر جانے ہی میں عافیت جانی کیونکہ اگر اس کی سوجی آنکھیں وہ اس وقت دیکھ لیتے تو زیادہ پریشان ہوتے۔

''بس ابو آفس میں کچھ کام تھا اس لیے دیر ہوگئی۔'' طوبیٰ کمرے میں آ گئی۔

''کال تو کر دیتیں کم سے کم۔ کب سے تمہارے ابو صرف یہاں وہاں بھاگ رہے ہیں۔'' رضیہ غصے میں تھیں۔ وہ پیچھے پیچھے چلی آئیں۔

ان کو طوبیٰ سے زیادہ اپنے شوہر کی پریشانی کا خیال تھا۔

''میں نے یہ کیوں نہ سوچا کبھی کہ میں رضیہ اور صیف اکبر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہمیشہ منفی رخ ہی دیکھتی رہی۔''

طوبیٰ کو چپ چاپ اپنی طرف دیکھتے بیٹھا دیکھ کر رضیہ کو اب طوبیٰ کی فکر ہوئی۔

''کیا بات ہے طوبیٰ؟ سب خیریت ہے؟'' اس کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے پوچھا۔

طوبیٰ نے سر اٹھا کر رضیہ کو دیکھا تو وہ برابر ہی میں بیٹھ گئیں۔

''کھانا گرم کر دوں؟ بھوک لگ رہی ہے؟''

وہ خاموش رہی اور رضیہ کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ رضیہ اب کے واقعی پریشان ہو گئیں۔

''سب ٹھیک ہے امی۔ بس تھک گئی ہوں بہت۔'' طوبیٰ نے نرمی سے کہا۔

رضیہ نے ایک گہرا سانس لیا۔''اب تم شادی کر لو طوبیٰ ورنہ زندگی ایسے ہی دوڑاتی رہے گی اور خوار کرتی رہے گی۔''

شادی کا ذکر کافی عرصے پڑنے والے دوروں کے بعد سے رضیہ نے چھوڑ ہی دیا تھا لیکن یہاں یہ بات آج پھر رضیہ کی زبان سے نکل گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ طوبیٰ کا جواب کیا ہوگا۔

''میں سکون سے صدیق کے پاس چلی جاؤں گی۔ بچے بہت یاد آتے ہیں مجھے۔'' ایک آنسو بہہ نکلا تھا۔

''کر دیں امی۔'' طوبیٰ نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

رضیہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا''کیا واقعی؟''

طوبیٰ نے ان کے کاندھے سے سر اُٹھا لیا۔

''کوئی ہے تمہاری نظر میں؟'' رضیہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

طوبیٰ نے خالی نظروں سے رضیہ کو دیکھا۔''اللہ کی نظر میں ہے۔''

طوبیٰ کے جواب پر رضیہ نے الجھ کر دیکھا۔طوبیٰ نے ایک گہرا سانس لیا اور مختصراً اسفر اور عبداللہ کا حال کہہ سنایا۔ رضیہ دم بخود سُنے گئیں۔آنسو تواتر سے ان کی آنکھوں سے بہتے رہے۔ ماں باپ بھی کبھی بڑے بے بس ہوتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ کبھی کانٹے چبھنے کی تکلیف بھی نہ ہونے دیں گے لیکن قسمت کسی اور کے محاذ پر لڑنے کی اجازت کہاں دیتی ہے کسی کو۔

''یہی وقت لکھا تھا اللہ نے کیونکہ یہی صحیح تھا۔'' رضیہ نے پرسکون ہوتے ہوئے کہا۔

''یقین،محبت اور بھروسے کی یہ تکون جب مرد،عورت اور خدا کی تکون سے مماثل ہوجائے تب ہی انسان وہ قدم اٹھا پاتا ہے جو خدا کی زمین پر اس کی مرضی کو حقیقت میں بدل دیتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں محبتیں آلودہ ہوجاتی ہیں۔اور محبت آلودہ ہوجائے تو وہ محبت نہیں عذاب بن جاتی ہے۔''

طوبیٰ رضیہ کے الفاظ کی گہرائی میں کھو گئی۔ رضیہ میز پر خوش خوشی کھانا لگا رہی تھیں اور طوبیٰ اپنی نوٹ بک میں سنبھال کر رکھا وزٹنگ کارڈ نکال رہی تھی۔ اللہ کی رحمت پر اب بنا شرطوں اور شک کے اسے پورا بھروسہ تھا۔

...۞...

حدیث قدسی

اے ابنِ آدم!

ایک میری چاہت ہے

اور ایک تیری چاہت ہے

ہوگا وہی جو میری چاہت ہے

بس اگر تو نے سپرد کر دیا اس کو جو میری چاہت ہے

تو وہ بھی میں تجھے دوں گا جو تیری چاہت ہے
اگر تو نے مخالفت کی اس کی جو میری چاہت ہے
تو میں تھکا دوں گا تجھ کو اس میں جو تیری چاہت ہے
پھر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔

...۞...

دروازے کی گھنٹی کئی مرتبہ بجانے کے بعد بھی جب دروازہ نہ کھلا تو مجبوراً اسفر نے پڑوسیوں کی گھنٹی بجائی۔ ایک نوعمر لڑکا دروازے پر نمودار ہوا۔

''جی، کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''یہ آپ کے برابر والے گھر میں وہ وقار نام کا لڑکا رہتا تھا اپنے والد اور والدہ کے ساتھ۔ اُن کا معلوم کرنا تھا مجھے۔'' اسفر نے لڑکے کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

''یہ گھر تو کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ وہ لوگ تو یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

''کوئی نیا پتا یا کوئی بھی معلومات اگر ہو تو۔'' اسفر کے استفسار پر وہ لڑکا اندر چلا گیا۔

''یہ ان کے نئے گھر کا پتا ہے۔'' اسفر نے ایک ڈائری سے پھاڑا گیا کاغذ سنبھال لیا اور شکریہ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی طوبیٰ نے سوال کیا۔ ''کیا ہوا، نہیں ملا؟''

نئے گھر کا پتا دیا ہے لیکن یہ تو کوئی دور دراز کا کوئی چھوٹا علاقہ ہے۔ اب تو جب اگلی بار پاکستان آئیں گے تب ہی دیکھیں گے۔'' اسفر نے گاڑی سٹارٹ کی۔

''بابا! مجھے آئس کریم کھانی ہے۔'' چھ سالہ ریّان نے فرمائش کی تو اسفر نے مسکرا کر سر ہلاتے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ جب جب پاکستان آتا وقار کی تلاش کرتا۔ یہ تیسرا پتا تھا جو اس بار اسے ملا تھا۔ وکی کے ملنے کی امید اب دم توڑتی جا رہی تھی۔ جن وقتوں پر وکی نے اس کی مدد کی تھی اس کے بدلے میں وہ وکی کو ایمان کی روشنی دکھا کر دوستی کا حق ادا کرنا چاہتا تھا لیکن ہر بار وہ مایوس لوٹ جاتا۔ تواتر سے بدلتی رہائش نے اسفر کو تشویش میں ڈال دیا تھا۔

نئے پڑوسیوں کی زبانی بس اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور والدہ سے بھی مستقل جھگڑوں کی آوازیں ان کے گھر سے سُنائی دیتی تھیں۔ اسفر کو کچھ کچھ اندازہ تھا کہ ان جھگڑوں کی ممکنہ نوعیت کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن اب مزید دو سال انتظار کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارا نہ تھا۔

...۞...

تنگ گلیوں کے اس چھوٹے سے علاقے میں ایک دنیا آباد تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ ایک اور دو کمروں کے کوارٹر میں پورے خاندانوں کے ساتھ آباد تھے۔

وہیں خالی پلاٹ ایک پر فقیر نے اپنی جھونپڑی ڈال رکھی تھی۔ وہ تمام محلہ والوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ گند میں اٹے بال اور کپڑوں والا وہ چرسی بڑا ہی عجیب تھا۔ کوئی اسے بھیک دے تو بھی دعا دیتا اور بچے پاگل کہہ کر پکارتے یا پتھر مارتے تو بھی دعا دیتا۔

''بھلا ہو تیرا..... ہائے بھلا ہو تیرا دونوں جہانوں میں!''

جب زیادہ ہی تکلیف میں ہوتا تو زور زور سے روتا۔

''دے جالا لے، اس بدنصیب کو کچھ دے جا۔ خدا تیرا ایمان قائم رکھے!''

''بڑا ہی عجیب فقیر ہے۔'' محلے میں آنے والی ایک نئی عورت نے اپنی پڑوسن سے کہا۔

''نرالی ہی دعائیں دیتا ہے۔ فقیر تو مال دولت اور بیٹوں کی دعائیں دیتے ہیں یہ ایمان کی دعا دیتا ہے۔'' عورت نے دوپٹا کان کے پیچھے اڑسا۔

''لو بھلا ایمان تو سب ہی کے پاس ہوتا ہے۔ بھئی کلمہ تو آتا ہے ہمیں۔ اس چیز کی دعا دے جو نہیں ہے ہمارے پاس۔''

''پاگل ہے نا!'' پڑوسن نے ہاں میں ہاں ملائی ''اسی لیے بس جو منہ میں آئے بولتا ہے۔''

زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔ دور پھر اس کی صدا بلند ہوئی۔

''جیتا رہ! باایمان رہ! روگ نہ لگے کسی کو۔''

۞.....۞.....۞

ختم شد